دکن کی سیاسی تاریخ

ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ ڈھاکہ

دکن کی سیاسی تاریخ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور (مغربی پاکستان)

شاخ: ۱۶-بیت المکرم (پہلی منزل)، ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

ناشر	اخلاق حسین ڈائرکٹر
طابع	اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
	۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور
مطبع	مسعود پرنٹرز میکلوڈ روڈ لاہور

اشاعت اول	۱۹۴۴ء	۱۰۰۰
اشاعت دوم	اگست ۱۹۶۸ء	۲۰۰۰
اشاعت سوم	جون ۱۹۶۹ء	۲۰۰۰

قیمت :-
اعلیٰ ایڈیشن : ـ ۵ روپیہ
سستا ایڈیشن : ۲-۲۵ 〃

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

کسی قوم کی تاریخ اسکے عروج و زوال کی داستان ہوتی ہے۔ جس قوم کے متعلق آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ کسی زمانہ میں، کسی جگہ اس قوم کا کیا حال تھا آپ اس کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے، آپکو معلوم ہوجائیگا کہ وہ قوم کن کن حالات سے گذری ہے۔ لیکن واقعات و احوال کی یہ زمانی ترتیب آپکو یہ بتانے سے قاصر رہے گی کہ کسی قوم کے عروج کے اسباب کیا تھے اور اسکے زوال میں کونسے عوامل کارفرما تھے اور کون سے عناصر اثر انداز ہوئے۔ اسکے لیے تاریخ کا عمیق اور وسیع مطالعہ چاہیئے۔ واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کیلئے اعلیٰ درجہ کی ذہانت و فراست کی ضرورت ہے۔ اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے لیے گہری بصیرت کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی ناقدانہ صلاحیت درکار ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب عالم اسلام کی ان چند منتخب اور مایہ ناز ہستیوں میں سے ایک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے علمی، عملی، ذہنی اور تنظیمی صلاحیتوں سے بافراط بہرہ ور فرمایا ہے۔ آپ نے ایک دردمند مسلمان کی نظر سے تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کرکے اپنی علمی کاوشوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کردیا ہے تاکہ عوام و خواص، سب اس علمی خزینہ سے مستفید ہوسکیں۔ آپ کا نقشِ اول "دکن کی سیاسی تاریخ"، نقشِ دوم سلاجقہ اور نقشِ تازہ خلافت و ملوکیت اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

پیش کردہ کتاب "دکن کی سیاسی تاریخ" آپ نے سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں دکن کی ایک مبسوط و مفصل تاریخ کی حیثیت سے لکھنا شروع کی تھی لیکن ابتدا ہی سے آپکی جو علمی، ادبی اور سیاسی مصروفیات رہی ہیں۔ اس کتاب کی تکمیل میں حائل ہوگئیں اور آپ صرف نظام الملک آصفجاہ کی سیرت، دہلی پر نادر شاہ کے حملہ تک ہی لکھ سکے۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال پذیر دورِ اقتدار کا صرف ایک حصہ ہی سامنے آسکا اس کے

باوجودیہ برِ صغیر ہند میں مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نہایت اہم دور پر ایک نہایت قیمتی تالیف ہے۔ اس کتاب میں جو نادر اور محققانہ مواد پیش کیا گیا ہے وہ شاید دوسری جگہ نہ مل سکے۔

تاریخ کے طالب علموں کیلئے اس کتاب کی اصل افادیت یہ ہے کہ اسمیں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا نہایت عبرتناک نقشہ بڑی تفصیل کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر، جیسے لائق، جہاندیدہ، مدبر اور باہیبت فرمانروا کے ۵۰ سالہ طویل دور اقتدار کے بعد صرف ۲۵ سال کے اندر اسکے نالائق جانشینوں کے ہاتھوں قندھار سے راس کماری تک کے وسیع و عریض علاقے سے مسلمانوں کی فرمانروائی کی بساط اُلٹ جاتی ہے اس المیہ کے اسباب پر شرح و بسط کیساتھ نہایت بصیرت انگیز روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس اندوہناک لیکن عبرت انگیز مرقع کو پیش کرنیکی غرض و غایت صرف یہی ہے کہ شاید ہم خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں، ماضی کی غلطیوں سے سبق لیکر آیندہ کیلئے اصلاح احوال کی کوشش کریں اور تلافیٔ مافات کی فکر کریں۔

ہماری درخواست پر مولانا محترم نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مسودے پر نظر ثانی کر لی ہے اور اب ہم اپنی روایات کے مطابق اسے شاندار معیار طباعت پر پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ تاریخ سے شغف رکھنے والے حضرات اس قیمتی تالیف سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔

لاہور .... جمادی الآخر سنہ ۱۳۸۸ھ

مطابق ۔ جولائی سنہ ۱۹۶۸ء

نیازمند

اخلاق حسین ڈائرکٹر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور

فہرست مضامین

باب سوم

نظام الملک آصف جاہ

بابِ اوّل

نظام الملک اور اُن کا خاندان

دولت آصفیہ کے قیام میں جن اہم اسباب نے حصہ لیا ہے ان میں سے ایک خود نظام الملک آصف جاہ کی شخصیت اور ان کی خاندانی وجاہت بھی ہے لہذا اس سلطنت کے قیام کی تاریخ کو قدرتی طور پر بانی سلطنت اور اس کے خاندان کے حالات سے شروع ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ ہماری تاریخ ایک عمومی تاریخ نہیں بلکہ ایک سیاسی تاریخ ہے اس لیے ہم کو شخصیتوں کے حالات سے صرف اسی حد تک تعرض کرنا چاہیئے۔ جس حد تک وہ سیاسی حیثیت سے اہم اور نتیجہ خیز ہوں۔

نظام الملک کے اسلاف

نظام الملک کا سلسلۂ نسب سترہ واسطوں سے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ تک اور ۳۲ واسطوں سے امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ فتنۂ تاتار کے بعد یہ خاندان ماوراءالنہر میں آباد ہو گیا تھا اور وہاں اپنی عالی نسبی اور علم و عمل کے سبب سے اس کو خاص قدر و منزلت حاصل تھی اسی خاندان کے ایک بزرگ خواجہ اسماعیل عرف عالم شاہ تھے جن کو امیر سمرقند نے اعلم العلماء کا خطاب دیا تھا۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے عوارف اور شیخ النصائح اور اعلام التقی کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں۔ عالم شیخ کے دو بیٹے تھے۔ ایک خواجہ عابد جو نظام الملک کے دادا ہیں۔ دوسرے خواجہ بہاء الدین جو سمرقند کے قاضی ہوئے اور جن کے بیٹے محمد امین خاں اور پوتے قمر الدین خاں سلطان محمد شاہ کے عہد میں سلطنت کی وزارت پر سرفراز ہوئے۔

قلیچ خاں خواجہ عابد

نظام الملک کے دادا خواجہ عابد تحصیل علوم کے بعد سمرقند سے بخارا گئے اور

کیں لیکن راجپوتوں کی غارت گر ٹکڑیوں نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ آخر بادشاہ نے میر شہاب الدین کو طلب کیا اور حسن علی خاں کی خبر لانے کا حکم دیا۔ یہ اس اجنبی ملک سے ناواقف تھے، مگر بلاتوقف امتثالِ امر پر آمادہ ہو گئے اور پہاڑی راستوں سے بے خوف گذرتے ہوئے اندرون کوہستان میں گھستے چلے گئے یہاں تک کہ دو دن کی مختصر مدت میں بادشاہ کو حسن علی خاں کی خبر لا دی۔ بادشاہ نے اس کے صلہ میں خطاب خانی عطا کیا اور آئندہ انہیں بڑی مہموں کے لیے مخصوص کر لیا۔ اس کے بعد شہزادہ اکبر کی بغاوت کا واقعہ پیش آیا۔ اس موقع پر میر شہاب الدین کو بہت کچھ طمع دلائی گئی اور اکبر نے بڑے بڑے مناصب دینے کا وعدہ کیا، مگر انہوں نے بادشاہ کی وفاداری سے یک سرمو انحراف نہ کیا اور اپنے بھائی مجاہد خاں کو بھی، جو باغی شہزادے سے مل گئے تھے، اس سے الگ کر لیا۔ اکبر کی بغاوت کو فرو کرنے میں انہوں نے بادشاہ کی جو خدمات انجام دیں ان کے صلہ میں بادشاہ نے ان کو داروغگی عرضِ مکرر کا عہدہ اور سید شہاب الدین خاں کا خطاب عطا کیا۔ سنہ ۲۶ ۱۰۹۵ھ ۱۶۸۳ء میں جُنیر کی طرف مرہٹوں کے خلاف انہوں نے متعدد معرکے سر کیے اور غازی الدین خاں بہادر کا خطاب پایا۔ سنہ ۲۸ ۱۰۹۷ھ ۱۶۸۵ء میں انہوں نے مرہٹوں سے قلعہ راہیری فتح کیا اور فیروز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ محاصرہ بیجاپور کے موقع پر لشکر کا ٹھہرنا محال ہو گیا تو بادشاہ نے لشکرِ شاہی سے رسد لے جانے کے لیے فیروز جنگ ہی کو منتخب کیا۔ راستہ میں بیجاپوریوں کی ایک عظیم الشان فوج نے جو خافی خاں کے بیان کے مطابق ان کی فوج سے دس گنی تھی انہیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ انہیں شکست دے کر آگے بڑھ گئے اور ایک بہت بڑے قافلے کو جو کرناٹک کی طرف

سے بیجاپور کے محصورین کے لیے غلہ کی مقدارِ کثیر لا رہا تھا، لوٹتے ہوئے اعظم کے لشکر میں جا پہنچے۔ یہ امداد اس قدر قیمتی تھی کہ اسی نے شاہزادے کے لشکر کو کامل تباہی کے ساتھ پسپائی کی ذلت سے بچا لیا۔ اس کے صلہ میں بادشاہ نے فتح بیجاپور کا سہرا غازی الدین خاں فیروز جنگ کے سر باندھا اور خود اپنے قلم سے یہ فقرہ تحریر کیا:

"بدستیاری فرزند بے دیو درنگ غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ مفتوح شد"

خافی خاں لکھتا ہے کہ جب فیروز جنگ کے اس کارنامے کی اطلاع بادشاہ سے عرض کی گئی تو فرمایا:

"چنانچہ حق سبحانہ تعالیٰ از تردد فیروز جنگ شرم اولاد تیموریہ نگاہ داشت آبروی اولاد او تا دور قیامت خدا نگاہ دارد"

پھر جب قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ شروع ہوا تو بادشاہ نے "تعین مورچال و گرد آوری مصالح و بستن دمدمہ و کندنِ نقب و تقسیم افواج" کے تمام امور غازی الدین خاں کے سپرد کیے۔ اس حیثیت سے گویا وہ اس جنگ میں افواج شاہی کے سالار اعظم تھے۔ فتح گولکنڈہ کے بعد انہوں نے ہفت ہزاری منصب پایا اور قلعہ ادھونی (امتیاز گڈھ) کو مسخر کیا۔ سنہ ۳۲ عالمگیری ۱۱۰۱ھ ۱۶۸۹ء میں جبکہ وہ سنبھاجی کی مہم پر بھیجے گئے تھے ان کی آنکھوں پر مادۂ دماغی گرا اور بینائی جاتی رہی مگر اس پر بھی انہوں نے فوجوں کی قیادت و رہنمائی نہ چھوڑی۔ نابینائی کے باوجود ان کی اعلیٰ انتظامی قابلیت کا یہ حال تھا کہ جب سنہ ۱۱۱۱ میں وہ دلیو گڈھ (اسلام پور) کی مہم پر جا رہے تھے، بادشاہ نے ان کی فوج کا معائنہ کیا اور ان کی فوجوں کے نظم و ضبط، ساز و سامان اور آراستگی و

تجمل کو دیکھ کر اظہار حیرت کیا اور شاہزادہ بیدار بخت (ابن شاہزادہ اعظم) کو عار دلانے کے لیے کہا کہ فیروز جنگ سے بدرجہا زیادہ جاگیر رکھنے کے باوجود تمہاری فوج کا ساز و سامان ان کی فوج کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ۱۱۱۵ھ میں فیروز جنگ نے نیما سندھیا کو مغلوب کیا اور اس کے صلہ میں ان کو سپہ سالار کا خطاب دیا گیا۔ اخیر زمانہ میں عالمگیر نے ان کو فوجی خدمات سے سبک دوش کر کے برار کی صوبہ داری پر مقرر کر دیا تھا جس پر وہ بادشاہ کی وفات تک برقرار رہے۔ عالمگیر کے انتقال کے بعد جب شہزادہ اعظم سلطنت کا مدعی بن کر شاہ عالم بہادر شاہ سے لڑنے کیلئے دکن سے چلا تو لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ خان فیروز جنگ کو ساتھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ تمام تورانی سردار ان کی سرداری کو مانتے ہیں مگر اعظم نے غرور سے کہا کہ "ایک اندھے کے لیے میں اپنا سیدھا راستہ کیوں چھوڑوں؟" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے تورانی امراء میں سے کسی نے اعظم کا ساتھ نہ دیا۔ اسی غلطی کو لوگ ان غلطیوں میں شمار کرتے ہیں جو اعظم کی ناکامی کا سبب ہوئیں[1]۔ خانہ جنگی کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ تخت نشین ہوا جو تورانی امر کا مخالف تھا اور ان کا زور توڑنا چاہتا تھا۔ دکن میں

---

[1] ابوالفیض لکھتا ہے کہ فیروز جنگ نے تمام امراء و سرداران تورانی کو اعظم سے الگ ہو جانے کی تاکید کی تھی۔

کہ باشید جائیکہ ہستند شاد	بتقدیر حق داشتہ اعتقاد
کہ از بعد جنگ آنکہ بے اشتباہ	ز عون الٰہی شود بادشاہ
بہ بندیم ما دشمنا دو جہاں	پئے خدمتش از عقیدت میاں

تورانی گروہ اور خصوصاً فیروز جنگ کے خاندان نے جو خدمات انجام دی تھیں ان کی وجہ سے اس جماعت کو دکن کی افواج اور سرکاری عہدہ داروں میں خاص اثر حاصل تھا۔ اور اہل دکن پر ان کی ہیبت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ عالم نے اس اثر کو باطل کرنے کے لیے اس جماعت کے تقریباً تمام اکابر کو دکن سے ہٹا دیا اور اسی سلسلہ میں فیروز جنگ کو بھی برار کی صوبہ داری سے الگ کرکے احمد آباد گجرات کی صوبہ داری پر بھیج دیا جہاں سنہ بہادر شاہی میں ۲۰ شوال ۱۱۲۲ھ ۸ دسمبر ۱۷۱۰ء کو انہوں نے انتقال کیا۔ ان کی نعش دہلی بھیجی گئی اور اس مقام پر دفن کی گئی جہاں اب عربک کالج قائم ہے۔ عالمگیر بادشاہ ان کے ساتھ جس محبت کا برتاؤ کرتا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ان کی آنکھوں کو صدمہ پہنچا تو بادشاہ نے ان کو لکھا۔

"خان فیروز جنگ یک رنگ ا من می خواستم کہ برائے عیادت آں دولت خواہ خود بیایم، اما بچہ رُو وکدام نظر مشاہدہ نُمایم۔ لہٰذا سیادت خاں را بنیابت فرستادیم، تا بچشم بنید و اظہار مافی الضمیر کند۔ واز میوہ ہائے نورس آنچہ بہم رسید انگور است۔ اما اطبائے یونان برائے عمدۂ مخلصان مزاج واں مضر می گویند۔ لہٰذا ماہم برخود گوارا نکردیم۔ انشاء اللہ تعالیٰ بعد صحت کامل وشفای عاجل یکجامی خوریم۔"

نظام الملک اوّل کے ابتدائی حالات

غازی الدین خاں فیروز جنگ کی شادی علامی سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہان کی بیٹی سعید النسا بیگم سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ۱۴ ربیع الآخر ۱۰۸۲ھ ۱۱ اگست ۱۶۷۱ء کو وہ نامور لڑکا[1] پیدا ہوا جس نے بعد میں نظام الملک آصف جاہ کے نام سے

---

[1] صاحب مآثر نظامی نے سنہ پیدائش ۱۰۸۶ء لکھا ہے مگر مورخین کا اجماع اس کے خلاف ہے۔

شہرت حاصل کی۔ اس زمانہ میں قاعدہ تھا کہ بڑے درجہ کے امرا میں سے جب کسی امیر کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بادشاہ کے سامنے نذر پیش کرتا تھا اور خود بادشاہ لڑکے کا نام تجویز کرتا تھا۔ چنانچہ اسی رسم کے مطابق عالمگیر نے فیروز جنگ کے بیٹے کا نام میر قمر الدین رکھا۔ چھ سال کی عمر میں ان کو منصب چار صدی پنجاہ سوار عطا ہوا۔ اور یہ ایسا اعزاز تھا جو نہایت مقرب اور منظور نظر خاندانوں کے لڑکوں کو عطا ہوا کرتا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ میں عموماً مناصب صرف ان لوگوں کو دیئے جاتے تھے جو ذاتی قابلیت سے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنے آپ کو شاہی اعزاز کے قابل ثابت کر دیتے تھے۔ لیکن جو بڑے گھرانے اپنی خدمات، جان نثاریوں اور وفاداریوں کے باعث سلطنت کے رکن بن جاتے تھے ان کے لڑکے کو بچپن ہی سے مناصب دے کر شاہی ملازمت میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ اور بادشاہ بطور خاص ان کی تربیت و تعلیم سے دلچسپی لیتا تھا تاکہ وہ قیادت و امارت اور حکمرانی و فرمانروائی کے بڑے کام انجام دینے کے لیے ابتدا ہی سے تیار ہوتے رہیں۔ میر قمر الدین خاں کا خاندان بھی انہی خاندانوں میں سے ایک تھا، اس لیے ہوش سنبھالتے ہی وہ شاہی ملازمت میں داخل کر لیے گئے۔ مگر ان کی فطری صلاحیت تھی جس نے بادشاہ کی نظر عنایت کو خاص طور پر ان کی طرف کھینچ لیا اور وہ خصوصیت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ان کے اطوار شائستہ کو دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ خان فیروز جنگ کے لڑکے کی پیشانی پر آثارِ رشد و سعادت پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اسد خاں وزیر اعظم نے بھی خان فیروز جنگ سے بارہا کہا کہ میر قمر الدین بڑا صاحبِ نصیب لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ پیش گوئیاں تھیں جنہوں نے ان کے آغاز شباب ہی میں اپنی صداقت ظاہر کرنی شروع کر دی۔ ۲۰ سال کی عمر ۱۱۰۲ھ ۱۶۹۰ء میں

انہوں نے عالمگیر کے دربار سے "چین[۱] قلیچ خاں بہادر" کا خطاب پایا ۱۱۰۹ھ ۱۶۹۷ء میں ان کی فوجی خدمات کا آغاز ہوا اور وہ مرہٹوں کے خلاف مہمات میں بھیجے گئے۔ ۱۱۱۲ھ ۱۷۰۰ء میں کرناٹک بیجاپور[۲] کی فوجداری پر اور ۱۱۱۴ھ ۱۷۰۲ء میں صوبہ داری بیجاپور پر اور پھر اسی سال تل کوکن عادلخانی[۳] کی حکومت پر مامور ہوئے ۱۱۱۵ھ ۱۷۰۳ء میں وہ رستم دل خاں کے بجائے کرناٹک حیدر آباد[۴] کی فوجداری پر بھیجے گئے اور اسی سال نصرت آباد اور سنگیر اور مُدگل کی حکومت پر منتقل کیے گئے۔ ۱۱۱۶ھ ۱۷۰۴ء سے ۱۱۱۷ھ ۱۷۰۵ء تک قلعہ واکنکھیڑہ کے زبردست محاصرہ میں انہوں نے بڑی جانفشانی دکھائی جس کے بعد ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۶ء میں بادشاہ نے ان کو منصب پنج ہزاری ذات و سوار عطا کیا اور صوبہ داری بیجاپور پر دوبارہ مامور

۱۔ ترکی زبان میں "چین" کے معنی چھوٹے اور "قلیچ" کے معنی تلوار کے ہیں۔ عالمگیر نے دادا کو "قلیچ خاں" یعنی "شمشیر خاں" کا خطاب دیا تھا۔ اس لیے پوتے کو "چین قلیچ خاں" یعنی "چھوٹے شمشیر خاں" کا خطاب دیا۔

۲۔ صوبہ بیجاپور کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ وہ تھا جو سقوطِ بیجاپور سے پہلے سلطنت عادل شاہیہ کے زیرِ حکومت تھا اور دوسرا حصہ وہ تھا جو سقوط بیجانگر کے بعد عادل شاہیوں نے دریائے کرشنا کے جنوب میں فتح کیا تھا۔ یہ دوسرا صوبہ کرناٹک بیجاپور کہلاتا تھا اور اس کا صدر مقام سِرا تھا۔

۳۔ کوکن مہاراشٹر کا وہ حصہ ہے جو مغربی گھاٹوں اور سمندر کے درمیان گوا سے لے کر دریائے تاپتی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد دو حصے تھے ایک کوکن بالا گھاٹ جو کوکن نظام شاہی کہلاتا تھا اور دوسرا کوکن پائیں گھاٹ جو تل کوکن عادلخانی کے نام سے موسوم تھا۔ بعد میں جب سلطنت نظام شاہیہ کا خاتمہ ہوا تو شاہجہان نے کوکن نظام شاہی بھی عادل شاہ کو دے دیا تھا لیکن مرہٹوں کی شورش میں یہ علاقہ عملاً شاہی اقتدار سے نکل گیا۔

کیا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں ان کی ترقیات اور ان کے کارناموں کا ایک مختصر بیان ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کشورِ ہندوستان کی سیاست میں جو عظیم الشان حصہ لیا وہ ہماری کتاب کے دوسرے باب سے متعلق ہے۔

عالمگیر کے ساتھ چین قلیچ خاں بہادر کو جو خصوصیت حاصل تھی اس کا اندازہ صرف ان عہدوں اور منصبوں سے نہیں لگایا جا سکتا جو بادشاہ نے ان کو عطا کیے تھے بلکہ اس کے لیے شخصی تعلقات پر بھی ایک نظر ڈالنی ضروری ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو ان کی ذات کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ تھا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ۱۱۰۹ھ میں وہ اپنے والد سے کبیدہ خاطر ہو کر بادشاہ کے پاس چلے گئے۔ بادشاہ نے تادیباً ان کو حاضری کی اجازت نہ دی اور حکم دیا کہ باپ سے معافی مانگ کر آؤ مگر اس کے ساتھ ہی اپنے دستِ خاص سے غازی الدین فیروز جنگ کے نام یہ سفارش نامہ لکھ کر دیا کہ۔

"فدوی زادۂ اخلاص پرور چین قلیچ خاں بہادر می گوید

وان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین۔

ایک دوسری روایت جو مآثر نظامی اور فتوحات آصفی کے مصنفوں نے بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے اپنے آخری زمانہ میں چاہا تھا کہ شہزادہ کام بخش کی بیٹی سے چین قلیچ خاں بہادر کو منسوب کر دیں اور اس غرض کے لیے

لہ کرناٹک حیدر آباد سے مراد وہ علاقہ ہے جس کا کچھ حصہ قطب شاہیوں نے سقوط بیجانگر کے بعد ہی، اور بیشتر حصہ میر جملہ میر محمد سعید خاں نے حیدر آباد کی ملازمت کے زمانہ میں فتح کیا تھا۔

اپنے معتمد خواجہ اختیار خاں کے ذریعہ ان کو پیغام بھی دیا تھا، مگر انہوں نے بظاہر ادبًا اور بباطن عاقبت بینی کی بنا پر اظہار عذر کیا۔ اس روایت کو دو ایسے مصنفوں نے بیان کیا ہے جو نظام الملک کے ہمعصر اور ان کے خاص ملازموں میں سے تھے۔ اس لیے اس کی صحت میں کسی طرح شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ واقعہ دو اہم حقیقتوں پر دلالت کرتا ہے۔ ایک یہ کہ عالمگیر کی نگاہ میں چین قلیچ خاں کے خاندان اور خود ان کی ذات کی عزت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اس نے انہیں شاہی خاندان سے مصاہرت کا شرف بخشنے کے قابل سمجھا۔ دوسرے یہ کہ وہ ان کی جنگی اور سیاسی قابلیت پر اتنا اعتماد رکھتا تھا کہ اسے اپنے سب سے زیادہ کم زور بیٹے کو قوت پہنچانے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ چین قلیچ خاں سے اس کی بیٹی بیاہ دے۔ عالمگیر خوب جانتا تھا کہ کام بخش ایک متلوّن اور خفیف العقل شخص ہے۔ بے تہور نے ان صفات کے ساتھ مل کر اور زیادہ کمزور کر دیا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اسد خاں اور اس کا خاندان کام بخش کا مخالف ہے جس کے باعث ایرانی امرا کی تائید اس کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کی رائے میں کام بخش کو محفوظ رکھنے کی صرف یہی ایک صورت ہو سکتی تھی کہ اس رشتۂ مصاہرت کے ذریعہ سے نہ صرف چین قلیچ خاں جیسے بہادر سپہ سالار اور مدبر کو اس کا مددگار بنا دے، بلکہ اس کی بدولت فیروز جنگ اور محمد امین خاں اور تمام تورانی امراء کو بھی اس کے حامیوں میں شامل کر دے۔ یہ ایسی تدبیر تھی کہ اگر بادشاہ اس میں کامیاب ہو جاتا تو بہت ممکن تھا کہ اس کی وفات کے بعد خانہ جنگی میں معظم کے بجائے کام بخش کو کامیابی حاصل ہوتی یا کم از کم دکن میں اس کی جداگانہ سلطنت قائم ہو جاتی۔ لیکن چین قلیچ خاں جو سیاست میں عالمگیر ہی کے شاگرد تھے۔ اس نکتہ کو

سمجھ گئے اور انہوں نے ایسی عزت کو قبول کرنے سے معذرت چاہی جس کے لیے انہیں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اتنے بڑے مہلکوں میں ڈالنا پڑتا جس وقت انہوں نے اس رشتہ سے انکار کیا تھا شاید ان کے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ قدرت نے دکن کی فرمانروائی کا جامہ کام بخش کے لیے نہیں بلکہ خود انہی کے لیے سی رکھا تھا۔

نظام الملک کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اپنی فطری افتاد اور کچھ عالمگیر کی تربیت کے اثر سے ان کے اندر بڑی حد تک وہی خصوصیات موجود تھیں جو خود ان کے مربی کی مابہ الامتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ وہی مذہبیت، وہی وقار و تمکنت، وہی آداب و مراتب کا پاس و لحاظ، وہی طرز تدبیر و انداز سیاست، وہی طریق ضبط امور، وہی کفایت شعاری اور وہی سادگی و زہد پسندی ان کے ہاں بھی نظر آتی ہے جو عالمگیر کی سیرت میں نمایاں ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ قریب قریب ہر معاملہ میں عالمگیر کا چربہ اور مثنیٰ تھے۔

یہ چند امور ہیں جن کے اجتماع سے نظام الملک کو وہ اثر حاصل ہو گیا تھا جس نے عالمگیر کی وفات کے بعد اور انقلاب و انتشار میں ان کو سلطنت کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی بنا دیا تھا۔ ان کے دادا، ان کے والد اور خود انہوں نے نصف صدی تک سلطنت کی جو خدمات انجام دیں، مسلسل تین پشتوں تک ان کے خاندان نے سالاری اور حکمرانی کی جس اہلیت کا ثبوت دیا، ان کے دادا نے شاہی خدمت میں اپنی جان اور والد نے اپنی آنکھیں جس طرح قربان کیں اور اس کے باوجود جس طرح وہ بے دریغ سلطنت کی خاطر جانیں لڑاتے رہے، پھر بادشاہ کی نظر عنایت نے

ان کو جن مناصب و خطابات اور درجات تقرب سے سرفراز کیا، اس کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کا خاندان سلطنت کے سب سے زیادہ طاقتور سیاسی گروہ یعنی امرائے تُورانی میں ایک چوٹی کا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ اسد خاں وزیر اعظم اور ذوالفقار خاں سپہ سالار کے بعد اگر امرائے شاہی میں کسی پر نظر پڑتی تھی تو یہی باپ بیٹے فیروز جنگ اور چین قلیچ خاں تھے۔ مگر جب فیروز جنگ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد اسد خاں اور ذوالفقار خاں بھی رخصت ہوئے تو پھر تُورانی امراء کی ریاست تنہا نظام الملک کا حصّہ رہ گئی اور یہ وہ چیز تھی جس کی بدولت انہیں اپنے وقت کی ملکی سیاست میں فیصلہ کن اثر حاصل ہو گیا۔ تاہم یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ نظام الملک ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک ہرگز نہ پہنچ سکتے تھے، اگر ان کا مدارِ کار صرف خاندانی اقتدار ہی ہوتا اور وہ اُس مضبوط سیرت اُس جاذب شخصیت، اس ذہنی و دماغی قابلیت اور اس منجھی ہوئی تہذیب و شائستگی کے مالک نہ ہوتے جس نے دورِ انتشار کے عیش پسند اور بد سیرت بادشاہوں خود غرض اور نا قابل وزیروں، رکیک فطرت اور خفیف الحرکات ندیموں کے زمانہ میں اورنگ زیب عالمگیر کا نمونہ پیش کر کے انہیں تمام ہندوستان کی نگاہوں کا مرجع اور امیدوں کا مرکز بنا دیا تھا۔

ماخذ:-

مآثر الامراء، تالیف صمصام الدولہ شاہ نواز خاں، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء

مآثر نظامی (قلمی)، تالیف لالہ منسا رام (کتب خانہ دفتر دیوانی حیدرآباد دکن)،

منتخب اللباب، تالیف محمد ہاشم معروف بخافی خاں نظام الملکی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء۔

خزانۂ عامرہ، تالیف میر غلام علی آزاد بلگرامی، طبع کانپور سنہ ۱۸۷۱ء

سروآزاد، تالیف میر غلام علی آزاد بلگرامی، مطبوعہ حیدر آباد

سوانح دکن (قلمی)، تالیف منعم خاں اورنگ آبادی، نواب میر نظام علی خاں کے عہد میں لکھی گئی (کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں موجود ہے)

خزانہ رسول خانی (قلمی)، تالیف محمد فیض اللہ منشی سنہ ۱۲۵۱ھ بعہد نواب ناصر الدولہ (کتب خانہ آصفیہ میں ہے)

تزک آصفیہ، تالیف تجلی علی شاہ، مطبوعہ حیدر آباد سنہ ۱۳۱۰ء

فتوحات آصفی (قلمی)، تالیف ابوالفیض (دفتر دیوانی)

سیر الہند و گل گشت دکن (قلمی)، تالیف قادر خاں بیدری (کتب خانہ آصفیہ)

حدیقۃ العالم، تالیف میر عالم وزیر دولت آصفیہ، مطبوعہ حیدر آباد سنہ ۱۳۱۰ھ

گلزار آصفیہ، تالیف غلام حسین خاں، مطبوعہ حیدر آباد سنہ ۱۲۶۰ھ

(Later Mughels, Willion Irvine, Calcutta, 1922)

(A History of Mahrattas, Grant Duff, Calcutta, 1918)

(The Nizam, His History and Relation with The British Government, Henry George Briggs, London, 1861)

نظام الملک کے اسلاف اور اُن کے نبی اعمام ۱؎

عالم شیخ خواجہ میر اسماعیل

میر بہاء الدین قاضی سمرقند

تلیج خاں خواجہ عابد

خواجہ عبد الرحیم رعایت خاں

اعتماد الدولہ محمد امین خاں
چین بہادر وزیر محمد شاہ

عظیم اللہ خاں مجاہد جنگ ظہیر الدولہ

قمر الدین خاں اعتماد الدولہ
ثانی - وزیر محمد شاہ

معز الدولہ میر حامد خاں

غازی الدین خاں
فیروز جنگ میر شہاب الدین

نصیر الدولہ
میر عبد الرحیم خاں

میر قمر الدین خاں
نظام الملک آصف جاہ

۱؎ اس شجرہ میں صرف ان اشخاص کے نام لکھے گئے ہیں جنہوں نے تاریخ میں کوئی نمایاں جگہ حاصل کی ہے۔

باب دوم

عالمگیر کی وفات کے بعد

اب ہم ان حالات کی طرف توجہ کرتے ہیں جن کی بدولت صوبہ دکن نظام الملک کے ماتحت مرکزی سلطنت سے الگ ہو کر ایک جداگانہ ریاست بن گیا۔ ان حالات کی تشریح کے لیے ان واقعات پر نظر ڈالنا ضروری ہے جو عالمگیر بادشاہ کی وفات کے بعد مرکزی سلطنت میں پیش آئے، عام طور پر مورخین اس زمانہ کے واقعات کو دولت آصفیہ کی تاریخ سے غیر متعلق سمجھ کر بہت اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ کوئی شخص دولت آصفیہ کے قیام اور سلطنت مغلیہ سے اس کی علیحدگی کے وجوہ و اسباب کو سمجھ نہیں سکتا جب تک کہ وہ عالمگیر کی وفات سے محمد شاہ کے عہد تک کے واقعات پر ایک گہری نظر نہ ڈال لے اور سلطنت کے تدریجی تنزل، سیاسیات ہند کے آتار چڑھاؤ، مختلف شخصیتوں اور جماعتوں کے عروج و نزول اور اس پورے دور میں نظام الملک کی زندگی کا نقشہ پوری جزئیات و تفصیلات کے ساتھ نہ دیکھ لے، علاوہ بریں اس عہد کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ دولت آصفیہ کے قیام کے بعد ایک صدی تک جن مسائل کو دکن کے سیاسی حالات میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے ان کی ابتدا اسی عہد سے ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ آغاز کو سمجھے بغیر انجام کو سمجھنا مشکل ہے

۱۔ عالمگیر کے بیٹوں کی خانہ جنگی

عالمگیر کی زندگی ہی میں اس کے بیٹوں کے درمیان منافقت شروع ہو گئی تھی جو پیش گوئی کر رہی تھی کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی ابن نظام شمسی کے تمام سیاروں میں باہم ایک زبردست تصادم ہوگا جب تک بادشاہ زندہ رہا اس کی

ہیبت سے ان کی آپس کی عداوتیں دبی رہیں مگر جب اس کا وقت آخر آیا تو ان کے درمیان سازشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس نے ان آثار کو دیکھ کر اپنے آخر زمانہ میں انہیں اور ان کے لڑکوں کو اپنے سے دور بھیج کر مختلف اقطاع سلطنت میں متفرق کر دیا تھا تاکہ اس کی وفات کے بعد کم از کم کچھ عرصہ تک خانہ جنگی برپا نہ ہو۔ انہیں باہم لڑ جانے سے پہلے اپنے اور سلطنت کے مفاد کو سمجھنے کا کافی موقع مل جائے۔ چنانچہ اپنے بڑے بیٹے معظم کو کابل اور اس کے ایک بیٹے مُعِزُ الدین کو ملتان اور دوسرے محمد عظیم کو بنگال کی صوبہ داریوں پر مقرر کیا۔ منجھلے بیٹے اعظم کو مالوہ اور گجرات کی صوبہ داری دی اور اس کے لڑکے بیدار بخت کو گجرات پر نائب صوبہ دار مقرر کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک وصیت نامہ بھی لکھ دیا جس میں اپنی وسیع مملکت کو تینوں بیٹوں میں اس طرح تقسیم کیا تھا کہ دونوں بڑے بیٹے معظم اور اعظم دہلی اور آگرہ میں سے ایک ایک شہر لے لیں۔ دہلی جس کے حصہ میں آئے، وہ صوبۂ شاہجہان آباد پنجاب، کابل، ملتان، ٹھٹھہ، بنگال، اڑیسہ، بہار، الہ آباد اور اودھ کے صوبے لے لے اور جو آگرہ کو منتخب کرے اسے اکبر آباد، مالوہ، گجرات، اجمیر، خاندیس، برار، اورنگ آباد اور بیدر کے صوبے ملیں۔ باقی رہا کام بخش تو وہ حیدر آباد اور بیجاپور کے صوبے دونوں کرناٹکوں سمیت اپنے پاس رکھے۔ اسی تقسیم کے لحاظ سے بادشاہ نے معظم اور اس کے بیٹوں کو شمالی ہند کے صوبوں پر مامور کیا تھا۔ اعظم اور اس کے بیٹے کو وسط ہند میں رکھا تھا۔ اور کام بخش کو جنوبی ہند کی طرف بھیج دیا تھا[1] لیکن جو ہونا تھا ان تدابیر کے باوجود ہوا۔ ۲۸ ذی القعدہ ۱۱۱۸ھ کو جب احمد نگر میں بادشاہ کا انتقال ہوا۔ اس وقت اعظم مالوہ کے راستہ میں شاہی کیمپ سے صرف بیس کوس کے فاصلہ پر تھا

---

[1] بادشاہ کی وفات کے وقت شاہزادہ معظم کی ۶۵ سال، اعظم کی عمر ۵۵ سال اور کام بخش کی عمر ۴۱ سال تھی

اور کام بخش بیجاپور کی جانب چالیس پچاس کوس سے زیادہ دور نہ گیا تھا۔ اس واقعہ کی اطلاع پاتے ہی اعظم نے احمد نگر واپس ہو کر خزانہ و اسباب و توپ خانہ پر قبضہ کیا۔ امرا سے بیعت لی اور عید الاضحیٰ کے روز اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ کام بخش سیدھا بیجاپور پہنچا اور وہاں شاہِ "دین پناہ" بن بیٹھا۔ ادھر ذی الحجہ کے آخر میں معظم اور اس کے بیٹوں کو بھی اس کی اطلاع پہنچ گئی۔ محمد عظیم (ابن معظم) عالمگیر کی زندگی ہی میں اس کی طلب پر ممالک مشرقی سے کروڑوں روپیہ لے کر روانہ ہو چکا تھا۔ وہ دادا کی خبر وفات سن کر آگرہ میں ٹھہر گیا۔ معز الدین اور اعز الدین ٹھٹھہ اور ملتان سے فوجیں لے کر لاہور پہنچ گئے جہاں معظم کا وفادار ملازم منعم خاں فوج اور سامان حرب فراہم کر کے تیار بیٹھا تھا۔ معظم جو اس وقت پشاور سے ۱۲ میل جانب مغرب جمرود کے مقام پر خیمہ زن تھا بسرعت ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اور لاہور پہنچ کر اس نے بھی محرم ۱۱۱۹ھ میں اپنا سکہ و خطبہ جاری کر دیا۔ اس طرح ایک اقلیم میں بیک وقت تین بادشاہ جمع ہو گئے۔ اب فتنہ کو سر اٹھانے سے کون روک سکتا تھا۔

اعظم کی ناکامی اور اس کے اسباب

ان بادشاہوں میں اعظم کی فوج سب سے زیادہ مضبوط تھی۔ وہ خود بہادر تھا عالمگیر کے آزمودہ کار امرا و وزرا اس کے ساتھ تھے۔ دکن کی ریاستوں اور مرہٹوں کی تسخیر کے لیے جو زبردست ساز و سامان مہیا کیا گیا تھا وہ سب اس کے حصہ میں آیا تھا۔ لیکن اس کے سوء تدبیر سے یہ قوت ضعف سے بدل گئی جس کا ادراک وہ آخر وقت تک نہ کر سکا۔ اس کے بیٹے بیدار بخت نے جو احمد آباد میں اس کا نائب تھا عالمگیر کی خبر وفات سنتے ہی عرضی بھیجی کہ مجھے فوراً آگرہ جانے کی اجازت دی جائے۔ آگرہ کا صوبہ دار

باقی خاں اور کوتوال علی شیر خاں دونوں اس کے حامی تھے۔ ان لوگوں کی مدد سے وہ بآسانی آگرہ پر قبضہ کر سکتا تھا۔ مگر اعظم خود اپنے بیٹے سے حسد رکھتا تھا۔ اس نے بیدار بخت کو حکم دیا کہ سرحد مالوہ پر پہنچ کر انتظار کرے۔ چنانچہ بیدار بخت مالوہ میں وقت ضائع کرتا رہا اور دوسری طرف محمد عظیم سبقت کر کے آگرہ پہنچ گیا۔ صوبہ دار اور قلعہ دار مزاحمت کرنے کے بعد اس کے مطیع ہو گئے اور وہاں کے خزانہ کا کروڑوں روپیہ اس کے ہاتھ آ گیا جس سے معظم کی مالی قوت۔ جو ظاہر ہے کہ تمام قوتوں سے فائق تر ہے۔ بہت زیادہ مضبوط ہو گئی۔ دوسری چیز جس نے اعظم کا زور توڑ دیا اس کا غرور تکبر، اس کا بخل، اس کی سفلہ نوازی اور امرائے شاہی کے ساتھ اس کا بُرا برتاؤ تھا۔ عالمگیر کے بنائے ہوئے لوگ اس کی اس روش سے برداشتہ خاطر ہونے لگے۔ اسد خاں وزیر اعظم اور ذوالفقار خاں میر بخشی دونوں کی گرم جوشی سرد مہری سے بدل گئی۔ چین قلیچ خاں جن کو اس نے صوبہ داری برہانپور کا عہدہ شش ہزاری منصب اور خان دوراں کا خطاب دیا تھا، اس سے جدا ہو کر اورنگ آباد چلے گئے۔ محمد امین خاں چین[1] بہادر

---

[1] یہ خواجہ عابد کا سگا بھتیجا، غازی الدین فیروز جنگ کا چچا زاد بھائی اور اس رشتہ سے چین قلیچ کا چچا ہوتا تھا۔ تورانی امراء میں اس کی شخصیت چین قلیچ خاں کی ہم پلہ تھی اور چین قلیچ خاں اس سے دس برس چھوٹے تھے۔ سنہ ۱۰۹۸ھ / سنہ ۸۷-۱۶۸۶ء میں بخارا سے ہندوستان آیا اور عالمگیر کی ملازمت میں داخل ہوا۔ اس وقت سے اس کو برابر ترقی ملتی رہی یہاں تک کہ بادشاہ کے آخر زمانہ میں صدارتِ کل کا عہدہ اور چین بہادر کا خطاب پایا۔

بھی جو کام بخش کا ساتھ چھوڑ کر اس کے پاس آیا تھا اس سے الگ ہو گیا۔ ان کے علاوہ جو امراء اس کے ساتھ رہے وہ بھی اس سے خوش نہ رہے۔ مرزا محمد صاحبِ تاریخ محمدی کا بیان ہے کہ امرائے تورانی خصوصاً اور دوسرے اہل سنت امراء عموماً اعظم سے اس بنا پر بھی ناخوش اور اس کی تخت نشینی پر ناراض تھے کہ وہ اعتقاداً شیعہ تھا۔ صاحبِ فتوحات آصفی نے بھی اس کی تصریح کی ہے چنانچہ لکھتا ہے۔

دگر در رہ مذہب آں بادشاہ بود رافضی نیز بے اشتباہ

زدینِ بزرگان و آبای خود بروں رفتہ آں شاہ والا خرد

لیکن اعظم کی سب سے بڑی کمزوری جس نے اس کو اس کارِ خطیر کے لیے بالکل نااہل بنا دیا تھا، یہ تھی کہ اس میں حزم و احتیاط اور دور بینی نام کو نہ تھی اور وہ صرف تلوار چلانا جانتا تھا خواہ اس کا موقع و محل ہو یا نہ ہو۔ اس کی اسی کمزوری سے عالمگیر کو سب سے زیادہ خطرہ تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ یہی چیز ایک روز اسے ہلاک کر دے گی۔ چنانچہ احکامِ عالمگیری میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"عجب ازاں فرزند کہ صحبتِ ہیچ اثر نہ کردہ۔ از احتیاط و دور بینی ہزار مرحلہ دور افتادہ "الحزم سوء الظن" بخاطر نیاوردہ و از آیہ "لاتلقوا بایدیکم الی التہلکہ" بہرہ نیافتہ

اسے اپنی شجاعت و بہادری پر ناز و غرور اور معظم کی بزدلی و کمزوری پر حد سے زیادہ بھروسہ تھا۔ وہ معظم کو "بنیا" کہا کرتا تھا اور اس قدر ہیچ سمجھتا تھا کہ جب کوئی اسے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا مشورہ دیتا تو وہ سختی کے ساتھ کہتا ہے کہ "ان چیزوں کی ضرورت کسی مرد کے مقابلہ کے لیے ہوتی ہے۔ معظم جیسے بزدل

کے مقابلہ میں اس کی کیا حاجت ہے" اسی بھروسہ پر اس نے اپنے ساتھ توپ خانہ نہیں لیا اور نہ خبر رسانی کا کوئی انتظام کیا، حتیٰ کہ وہ معظم کے آگرہ پہنچنے تک اسکی نقل و حرکت سے بالکل بے خبر رہا۔ ان سب باتوں نے مل جل کر جو نتیجہ ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ جب وہ معظم کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ۵۰ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی۔ اکثر امراء اس سے ناخوش تھے، اور روپے کی قلت کے سبب سپاہیوں کی تنخواہیں ادا نہ کر سکتا تھا جس کی بدولت اس کی فوج کے لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر فریق مخالف کی صفوں کا رخ کر رہے تھے۔

اس وقت حصول تخت کی اس جد وجہد کا فیصلہ دراصل اس بات پر تھا کہ دونوں مدعیوں میں سے کون سلطنت کے قلب یعنی دہلی اور آگرہ پر پہلے قبضہ کرتا ہے۔ کیونکہ دولت اور قوت کا مرکز یہی دونوں مقام تھے۔ اعظم اس مسابقت میں ناکام ہوا اور معظم بازی لے گیا، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اب معظم کے پاس ممالک مشرقی کا خزانہ تھا جس کی مالیت ۱۸ سے ۲۰ کروڑ روپیہ تک بتائی جاتی ہے اور کابل، لاہور، بنگال اور دہلی کی فوج لے کر ۸۰ ہزار سوار اس کے زیر علم تھے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک طرف روپیہ وافر، فوج کثیر اور دل بڑھے ہوئے ہوں اور دوسری طرف روپیہ بھی قلیل، فوج بھی قلیل اور دل بھی بگڑے ہوئے ہوں تو ایسے نامساوی مقابلہ میں نری بہادری کا وزن ترازو کے اٹھتے ہوئے پلڑے کو نہیں جھکا سکتا۔ چنانچہ ایسے مقابلہ کا جو قدرتی نتیجہ تھا وہی ظاہر ہوا۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ کو جاجو کے میدان میں جنگ ہوئی جس میں اعظم اپنے دو بیٹوں سمیت مارا گیا اور سلطان معظم، شاہ عالم بہادر شاہ کشور ہند — باستثنا جنوبی ہند — کا مالک ہو گیا۔ بہادر شاہ ایک حلیم، صلح جو

اور نرم خو آدمی تھا۔ اس نے آخر وقت تک خانہ جنگی سے بچنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس نے اعظم کو لکھا تھا کہ والد مرحوم نے اپنے وصیت نامہ میں ملک کی جو تقسیم کی تھی اس میں تم کو دکن کے چھ صوبوں میں سے چار صوبے گجرات و مالوہ سمیت عطا کیے تھے میں ان کے ساتھ تمہیں دو صوبے اور دیتا ہوں۔ اور اس سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں باہم خونریزی نہ ہو:

"نزد اہل اسلام وجہے کہ بہرہ از ایمان دارند ظاہر است کہ مقابل خون یک مسلمانے کہ ناحق ریختہ شود خراج ملکے اگر بکفارت آں دہند تلافی نمی تواند شد"

لیکن اگر یہ صلح تمہیں منظور نہ ہو تو ہم اور تم اپنی غرض نفسانی کی خاطر ایک عالم کو کیوں تباہ کریں؟ آؤ باہم تنہا لڑ کر فیصلہ کر لیں اور اس صورت میں تمہارا ہی فائدہ ہے کیونکہ تم اپنی تلوار کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے ہو، مگر اس نیک دل شخص کے پیغام کا جواب اعظم کے پاس یہ تھا کہ اس بڈھے نے سعدی کی گلستان بھی نہیں پڑھی تھی کہ اسے معلوم ہوتا کہ "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند" میں تو یہ تقسیم چاہتا ہوں کہ

از فرشِ خانہ تا بہ لبِ بام ازان من
از بام خانہ تا بثریا ازاں تو

اپنی اس خواہش کے مطابق اعظم نے جنگ کی اور ملک کی تقسیم بھی اسی نوعیت کی ہوئی جو وہ چاہتا تھا، اور "از فرش خانہ تا بہ لب بام" والا حصہ اس کے علی الرغم اس کے حریف کے ہاتھ آگیا۔ جنگ کے بعد بہادر شاہ نے ان تمام امراء کو جو اعظم

کے حامی تھے نہ صرف معاف کیا بلکہ انہیں اعلیٰ عہدوں اور مناصب سے سرفراز کیا۔ اسد خاں اور اس کے بیٹے ذوالفقار خاں کو گوالیار سے طلب کرکے ان کی تالیف قلب کی۔ اسد خاں کو نظام الملک آصف الدولہ کا خطاب اور وکیل مطلق کا اعزازی عہدہ عطا کیا۔ ذوالفقار خاں کو صمصام الدولہ امیر الامراء بہادر نصرت جنگ کا خطاب اور میر بخشی کے علاوہ نائب وکیل مطلق کا عہدہ دیا۔ دکن میں غازی الدین خاں فیروز جنگ، چین قلیچ خاں اور محمد امین خاں کو معافی نامے بھیجے۔ باوجودیکہ وہ ان امراء سے خوش نہ تھا، مگر اس نے انہیں خوش کرنے کی کوشش کی اور چین قلیچ خاں کو منصب ہفت ہزاری اور اعظم کا دیا ہوا خطاب خاں دورانی عطا کرکے صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنؤ پر مامور کیا۔

کام بخش کی ناکامی کے اسباب

سلطنت کے ضروری انتظامات اور راجپوتانہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد بہادر شاہ کی توجہ کام بخش کی طرف منعطف ہوئی۔ کام بخش عالمگیر کی وفات کی خبر سنتے ہی بیجاپور پہنچا جہاں چین قلیچ خاں کے نائب سید نیاز خاں نے تھوڑی مزاحمت کے بعد قلعہ اس کے حوالہ کر دیا۔ کام بخش نے قلعہ پر قبضہ کرنے بعد اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور اطراف و انواح میں فوجیں بھیج بھیج کر اپنے حدود مملکت وسیع کرنے شروع کر دیئے۔ جب اعظم کے سامنے یہ سوال پیش ہوا کہ وہ شاہ عالم اور کام بخش میں سے پہلے کون سے حریف کا مقابلہ کرے تو اس نے متعدد امراء کی رائے کے خلاف شاہ عالم کی مہم کو مقدم قرار دیا اور جنوبی ہند کو چھوڑ کر آگرہ کی راہ لی۔ اس طرح کام بخش کو جنوبی ہند میں اپنی قوت بڑھانے کا بہترین موقع حاصل ہو گیا۔ مگر اپنی

ناعاقبت اندیشی، کوتاہ فہمی اور کج بینی کی بدولت اس نے اس زریں فرصت کو بری طرح ضائع کیا۔ بیجاپور اور کرناٹک کے اکثر حصوں کو مطیع کرنے کے بعد وہ حیدرآباد گیا اور رستم دل خاں صوبہ دار کو بحلف شرعی حفظ ناموس اور جان و مال کی امان کا یقین دلا کر شہر پر قبضہ حاصل کر لیا۔ یہاں کام بخش کے امراء میں دو جماعتیں بن گئیں جنہوں نے باہم جوڑ توڑ شروع کر دیئے۔ ایک جماعت کے سر گروہ احسن خاں میر بخشی، سیف خاں (کام بخش کا استاد) اور رستم دل خاں تھے۔ اور دوسری جماعت کا سردار تقرب خاں حکیم محسن وزیر اعظم تھا۔ تقرب خاں نے کام بخش کو یقین دلایا کہ احسن خاں کی جماعت اس کو پکڑ کر بہادر شاہ کے حوالہ کرنا چاہتی ہے۔ کام بخش نے اس بات کو بلا تحقیق قبول کر لیا۔ رستم دل خاں کو پکڑ کر ہاتھی کے پاؤں تلے روندوا دیا۔ سیف خاں کے ہاتھ اور زبان کاٹ کر مروا ڈالا۔ احمد خاں افغان کو زمین پر لٹا کر اس پر گھوڑے کدوائے اور شہر میں ان لوگوں کی لاشوں کی تشہیر کی۔ پھر احسن خاں کو جو فوج میں نہایت ہر دلعزیز تھا اور سپاہی اور سردار سب جس کے گرویدہ تھے، قید کر دیا اور دو تین مہینہ تک اسے سخت عذاب دینے کے بعد قتل کرا دیا۔ ان ظالمانہ حرکات سے تمام امراء، سپاہی اور عام باشندے کام بخش سے سخت ناراض ہو گئے۔ حیدرآباد کے بہت سے شرفا شہر چھوڑ چھوڑ کر چلے گئے، اور فوج والوں کی ایک کثیر تعداد اس سے الگ ہو گئی۔

یہ حالات تھے جب کہ بہادر شاہ اجمیر سے حیدرآباد کی جانب روانہ ہوا۔ اور راستہ سے اس نے کام بخش کو خط لکھا جس میں اسے مشورہ دیا کہ وہ حیدرآباد اور بیجاپور کے صوبوں پر قناعت کرے، اور بادشاہی کے دعوے سے دست بردار ہو جائے

مگر کام بخش نے نہ صرف اس پیغام صلح کو رد کر دیا بلکہ بہادر شاہ کے ایلچی کو ذلیل کر کے قید بھی کر دیا۔ اب بہادر شاہ کے لیے بجز جنگ کے چارہ نہ تھا چنانچہ اس نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور شوال ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں حیدر آباد سے دو تین منزل پر جا کر ٹھہر گیا۔ کام بخش کے پاس پانچ چھ سو سواروں سے زیادہ باقی نہ رہے تھے اور وہ بھی اس کی بدسلوکی، جفاکاری اور ایک سال سے تنخواہیں نہ ملنے کے سبب نالاں اور بددل تھے۔ اس کے مقابلہ میں بہادر شاہ کے ساتھ دو لاکھ سے زیادہ فوج تھی۔ سیف خاں میر اسد اللہ نے (جو ذوالفقار خاں اسد اللہ خاں سے بگڑ کر راجپوتانہ گیا تھا اور وہاں راجپوتوں کو بہادر شاہ کی مخالفت اور کام بخش کی تائید پر آمادہ کر کے اسی زمانہ میں حیدر آباد پہنچا تھا)، کام بخش کو مشورہ دیا کہ گونڈوانہ اور برار کے رستے بھاگ کر راجپوتانہ کی طرف نکل جائے اور راجپوت سرداروں سے مدد لے کر بہادر شاہ کے پہنچنے سے پہلے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لے۔ مگر کام بخش نے شبہہ کیا کہ یہ مجھے پکڑوانا چاہتا ہے اور اسے جواب کہ "اس جگہ تیرے حسن تردد و عقیدت کا پھل بجز سزا اور قتل کے کچھ نہ ملے گا۔" کچھ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ قریب کے سواحل میں سے کسی بندرگاہ کی طرف چلا جائے اور وہاں سے ایران کی راہ لے، مگر اسے اپنے نجومیوں پر جو فتح کا یقین دلا رہے تھے، اس قدر اعتقاد تھا کہ اس نے کسی کا مشورہ نہ سنا اور اسی مٹھی بھر بے دل فوج کو لے کر مقابلہ کے لیے نکل آیا۔ ۱۰ ذی قعدہ ۱۱۲۰ھ/جنوری ۱۷۰۹ء کو دونوں فوجیں باہم مقابل ہوئیں۔ بہادر شاہ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کام بخش خونریزی کے بغیر مطیع ہو جائے۔ مگر ذوالفقار خاں جو محاصرہ جنجی کے زمانہ سے کام بخش کے ساتھ مداوت رکھتا تھا، لڑنے پر مصر تھا۔ اس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر حملہ کر دیا۔

کام بخش نے ایسی سخت مدافعت کی کہ ذوالفقار خاں اور اس کے رفیق داؤد خاں پنی کے دانت کھٹے ہو گئے۔ مگر نری شجاعت اتنی بڑی قوت کا کہاں تک مقابلہ کرتی۔ اس کی فوج دو گھنٹے کی جنگ کے بعد تتر بتر ہو گئی اور وہ خود زخموں سے چور ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اب بہادر شاہ بلا شرکت احدے سلطنت ہند کا مالک تھا۔

قدرت نے کام بخش کے لیے ایک بڑا موقع بہم پہنچایا تھا جسے اس نے قصداً اپنی کوتاہ اندیشی سے کھو دیا۔ اگر وہ اپنے حصہ پر قانع رہتا تو بہادر شاہ جیسا صلح جو آدمی اسے بے دخل کرنے کی کبھی کوشش نہ کرتا۔ اس طرح حیدر آباد اور بیجا پور کے دو عظیم الشان صوبے ملا کر ایک نئی سلطنت بن جاتی جس کے حدود دریائے بھیم اور گوداوری سے لے کر راس کماری تک وسیع ہوتے۔ جس کی آمدنی ۵ کروڑ روپیہ سے کم نہ ہوتی اور جو پوری سلطنت ہند کے ایک چوتھائی حصہ کے برابر ہوتی۔ یہ نئی سلطنت متعدد حیثیات سے ایک مضبوط سلطنت ہو سکتی تھی۔ اس کا فرمانروا تیموری خاندان کا فرد ہوتا۔ اس لیے اسے تمام جنوبی ہند کے امراء و رؤساء کی اطاعت و وفاداری حاصل ہوتی۔ اس کے لیے ایک چھوٹی جسامت کی مملکت کو ضبط میں رکھنا زیادہ آسان ہوتا یہ ریاست مرہٹوں کی طاقت کو جسے عالمگیر آدھ موا کر کے چھوڑ گیا تھا آسانی کے ساتھ دبا کر تابع فرمان کر لیتی۔ جنوبی ہند کے نائکوں، پالیگروں[۱] اور چھوٹے چھوٹے راجاؤں

---

[۱] جنوبی ہند میں نائک فوج کے سردار کو کہتے ہیں اور پالیگر زمیندار کو۔ سلطنت بجانگر کے زوال کے بعد کرناٹک کے پورے علاقہ میں بہت سے نائک اور پالیگر اپنی چھوٹی چھوٹی سی ریاستیں بنا کر خود مختار ہو گئے جنہیں مطیع کرنے میں عادل شاہ اور قطب شاہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ سلطنت مغلیہ کے ماتحت حیدر آباد اور بیجا پور کے صوبہ داروں کا سب سے بڑا کام انہی سرکش نائکوں اور پالیگروں

کو بھی جو ابھی تک پوری طرح مطیع نہ ہوئے تھے، زیر وزبر کر کے ایک نظامِ حکومت میں منسلک کر لیتی اور کٹک سے لے کر کوکن تک پورے جنوبی ہند کے سواحل اس کے حیطۂ اقتدار میں آجاتے۔ ایسی ایک مضبوط سلطنت کی موجودگی میں شاید انگریزوں اور فرانسیسیوں کو وہ مواقع حاصل نہ ہو سکتے جو اس واقعہ کے ۳۰ برس بعد ان کو حاصل ہوئے اور جن کی بدولت ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ ہی بدل گیا۔

۲۔ شاہ عالم بہادر شاہ کا دورِ حکومت

اس میں شک نہیں کہ اعظم اور کام بخش دونوں بہادر اور اولوالعزم تھے، مگر ان کی سیرت میں غرور، درشت مزاجی، تنگ دلی، اور بے تدبیری اس قدر زیادہ تھی کہ وہ سلطنت مغلیہ کی فرمانروائی اور عالمگیر کی جانشینی کے قابل ہرگز نہ تھے۔ اس لیے ان کی شکست اور موت کو فی الحقیقت ہندوستان یا سلطنت کا نقصان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان کے مقابلہ میں بہادر شاہ اپنی بہت سی کمزوریوں اپنی حد سے بڑھی ہوئی صلح پسندی، نرم دلی، مروت، فیاضی اور سیاست نافہمی کے باوجود یقیناً قابلِ ترجیح تھا۔ وہ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے تمام سلاطین تیموریہ میں ممتاز تھا۔ علم حدیث میں اسے "قدوۃ المحدثین" تسلیم کیا جاتا تھا، تفسیر اور فقہ پر اس کو پورا عبور تھا۔ اس کی پرہیزگاری اور مذہبیت خود اپنے باپ سے کم نہ تھی۔ عالمگیر کے بیٹوں میں وہی ایسا شخص تھا جو اپنی فراخ دلی، نیک مزاجی، بردباری اور حسنِ سلوک سے سلطنت کے امراء و اعیان کو کسی حد تک خوش رکھ سکتا تھا۔ مگر عالمگیر کے بعد اس سلطنت کے بادشاہ میں جن دوسری صفات

لے کو تابع فرمان اور باجگزار بنانا تھا۔

کی ضرورت تھی افسوس ہے کہ وہ صفات اس میں نہ تھیں۔ اس نے چار پانچ سال کے مختصر سے زمانۂ حکومت ہی میں اپنی کمزوریوں سے ایسے اسباب مہیا کر دیئے جن کی بدولت اس کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

بہادر شاہ کی بے خبری

اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے سلطنت کا تمام کاروبار وزراء و امراء پر چھوڑ دیا اور جزئیات و فروغ تو درکنار کلیات و اصول تک میں ان پر شخصی نگرانی نہ رکھی۔ اس کی یہ بے توجہی اس قدر مشہور ہوئی کہ لوگوں نے اس کو "شہِ بے خبر" کہنا شروع کر دیا۔ یہ سلطنت کی بدنصیبی تھی کہ عالمگیر جیسے فرمانروا کے بعد جو اپنی سلطنت کے چھوٹے چھوٹے معاملات تک پر نظر رکھتا تھا، اور جس کی گہری نگاہ سے ہندوستان کے کسی بعید سے بعید گوشے کے عامل یا تھانہ دار کی کارروائی بھی پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی، بہادر شاہ جیسا بے خبر بادشاہ حکمران ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزراء سے لے کر عاملوں اور مُتَصَدّیوں تک ہر شخص میں ایک خودسری اور غیر ذمہ داری کی کیفیت پیدا ہو گئی، اور یہ بالکل قدرتی بات تھی کیونکہ جو لوگ پچاس سال سے ایک زبردست طاقت کی گرفت میں رہنے کے خوگر ہو چکے تھے اور جن کے اندر خود اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے اور اپنے اختیارِ تمیزی کی بنا پر کام کرنے کی قابلیت باقی نہیں رہی تھی انہوں نے دفعتہً اپنے آپ کو اس گرفت سے آزاد پایا اور کوئی قوت ان کو استبداد و مطلق العنانی سے روکنے والی نہ رہی۔

وزراء کا غلط انتخاب

خیر، یہ خرابی بھی کسی حد تک کم بدانجام ہو سکتی تھی اگر وزراء ایسے لوگ ہوتے

جو اس کام کو بہتر طریق پر چلانے کے قابل ہوتے۔ عالمگیر نے وصیت کی تھی کہ اس کے وزیر اسد خاں کو بدستور وزارت پر برقرار رکھا جائے۔ یہ شخص بہادر شاہ کے لیے بہترین وزیر ہو سکتا تھا۔ نصف صدی سے زیادہ مدت تک سلطنت کے بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر رہ چکا تھا۔ شاہجہان کے زمانہ میں بخشی دوم تھا۔ عالمگیر کے عہد میں پہلے نائب وزیر ہوا اور اس کے بعد ۱۰۸۷ھ سے ۱۱۱۸ھ تک مسلسل ۳۰ سال وزیر اعظم رہا۔ سلطنت کے معاملات کو سمجھنے، اس کے کاروبار کو چلانے اور اس کی سیاسی و انتظامی پالیسی کو بنانے اور عمل میں لانے کے لیے اس سے زیادہ تجربہ کار اور صاحب بصیرت مدبر کوئی اور نہیں مل سکتا تھا۔ مگر بہادر شاہ نے وزارت کو محض ایک صلہ و انعام کی چیز سمجھ کر یہ عہدہ اپنے وفادار دوست منعم خاں کو دے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اعظم جیسے طاقتور دشمن کے مقابلہ میں بہادر شاہ کو تخت سلطنت جن لوگوں کی کوششوں سے حاصل ہوا تھا، ان میں شاہزادۂ عظیم الشان کے بعد اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ یہی منعم خاں تھا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ بہادر شاہ کے مقابلہ میں جن ارکان سلطنت نے اعظم کے دعوے کی حمایت کی تھی ان میں سب سے زیادہ نمایاں یہی دونوں باپ بیٹے اسد خاں اور ذوالفقار خاں تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منعم خاں اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود اس قابل نہ تھا کہ نازک حالات میں بلا کسی سابق تجربہ و واقفیت کے سلطنت ہند کا وزیر اعظم بنا دیا جاتا اور وزیر اعظم بھی ایسا جسے بادشاہ کی شخصی نگرانی و ہدایت کے بغیر تمام جزئیات و کلیات کا خود انتظام کرنا تھا۔ منعم خاں کو وزارت کا عہدہ دینے کے بعد اسد خاں کو خوش کرنے کے لیے وکیل مطلق کا عہدہ دیا گیا جس کی حیثیت تو یقیناً وزارت سے بلند تر تھی مگر اختیارات

وہ نہ تھے جو شاہجہان کے زمانہ میں آصف خاں کو حاصل تھے۔ ایک طرف اسد خاں اس غلط بخشی پر ناخوش ہوا اور دوسری طرف منعم خاں کو اسد خاں کی برائے نام بالادستی بھی گوارا نہ ہوئی۔ اس لیے اسد خاں کو بڑھاپے کا عذر کر کے گوشہ نشین کر دیا گیا اور اس کی تلافی اس طرح کی گئی کہ اس بیٹے ذوالفقار خاں کو میر بخشی گری اور صوبہ داری دکن کے ساتھ نائب وکیل مطلق کا عہدہ بھی دے دیا گیا۔ اس طرح وزارت کے اختیارات دو شخصوں کے درمیان تقسیم ہو گئے جن میں سے ایک (ذوالفقار خاں) انتہا درجہ کا اقتدار پسند اور حکومت کا حریص تھا۔ ایسے دو شخصوں کے درمیان اختیارات کے منقسم ہونے کا قدرتی نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ دونوں میں تین چار سال تک مسلسل کشمکش برپا رہی اور اس کش مکش کی وجہ سے سلطنت کے کام میں اور زیادہ خرابیاں پیدا ہوئیں سکہ بہادر شاہی محرم ۱۱۲۳ھ میں منعم خاں کی وفات کے بعد ذوالفقار خاں نے چاہا کہ اسے وزیر بنا دیا جائے۔ بادشاہ نے اتنی عقلمندی برتی کہ وکالت مطلقہ، امیر الامرائی اور وزارت تینوں کو ایک خاندان میں جمع کر دینا مناسب نہ سمجھا۔ مگر اخلاقی جرأت کی کمی نے اسے اس کی اجازت بھی نہ دی کہ ذوالفقار خاں کو ناخوش کر کے کسی دوسرے شخص کو وزیر مقرر کرتا۔ اس مشکل کو اس نے اس طرح حل کیا کہ وزارت کے اختیارات بالفعل شاہزادہ عظیم الشان کے سپرد کیے اور ہدایت اللہ خاں (ابن عنایت اللہ خاں خانساماں) کو وزارت خاں کا خطاب دے کر دیوان مقرر کر دیا۔ یہ نیا انتظام سابق انتظام سے بھی زیادہ خلاف مصلحت تھا۔ کیونکہ اب ذوالفقار خاں کا مدِ مقابل خود ایک شہزادہ ہو گیا جو بادشاہ کے بیٹوں میں سب سے زیادہ لائق اور با اثر تھا۔ اسی زمانہ سے ان دونوں میں وہ

کش مکش شروع ہوئی جس کا انجام بادشاہ کے مرتے ہی ایک تباہ کن خانہ جنگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

صرف یہی ایک غلطی نہیں۔ بہادر شاہ نے عموماً ذمہ داری کے عہدوں پر غلط آدمیوں کو مقرر کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آدمیوں کو سمجھنے اور ان کی قدر و قیمت پہچاننے کی قابلیت نہ تھی۔ اس کے پاس اس کے باپ کے جمع کیے ہوئے بہترین آدمی موجود تھے۔ مگر وہ نہ جانتا تھا کہ کون کس کام کے قابل ہے اور کس کام کے قابل نہیں ہے۔ وہ اپنے باپ کی اس زریں نصیحت پر عمل نہ کر سکا کہ:۔

"کار آہن گر از درودگر فرمودن از عقلا بعید است کار بزرگان بخوزداں وکار خورداں بہ بزرگاں نباید فرمود کہ بزرگاں از کار خورد ننگ کنند وخورداں را حوصلۂ کار بزرگ نباشد۔ خلل تمام در انتظام سرکار رود بد"

چین قلیچ خاں اور ان کے خاندان سے ناموافقت:

بہادر شاہ کی ایک دوسری غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے عہد میں تورانی امراء کو جو اساطین سلطنت تھے ناخوش رکھا، اور ان کی قابلیت تجربے اور اثر سے کوئی کام نہ لیا۔ عالمگیر نے جس کی مردم شناسی مشہور ہے اس جماعت کے بارے میں نصیحت کی تھی کہ:۔

"فرقہ تورانی سپاہی مقرر اند... برائے تاخت و تاراج و شبخون و بندی کردن خوب اند۔ بہر صورت ایں جماعت را محل رعایت باید داشت کہ اکثر جاہا ایں مردم بکار می آیند کہ دیگرے بکار نمی آید"

مگر بہادر شاہ زمانہ شاہزادگی ہی سے اس گروہ کے ساتھ مخالفت رکھتا تھا۔ اس کو غازی الدین خاں فیروز جنگ سے شکایت تھی کہ اس کے خلاف عالمگیر کے مزاج کو برہم کرنے میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس کے وزیر معظم خاں کو محمد امین خاں سے شکایت تھی کہ ایک مرتبہ ان کی مخالفانہ سعی سے اس پر عالمگیر کا عتاب ہوا تھا اور اس کو تخفیف منصب کی سزا دی گئی تھی۔ ذوالفقار خاں بھی چین قلیچ خاں کے ساتھ حسد کے جذبات رکھتا تھا اور عالمگیر کے زمانہ سے دونوں میں چشمک چلی آتی تھی۔ ان سب اثرات نے مل جل کر بہادر شاہ کے دور حکومت کو تورانی امرائے کے لیے دور نکبت بنا دیا۔ اس زمانہ میں فیروز جنگ کو دکن سے ہٹا کر احمد آباد کی طرف بھیج دیا گیا جہاں وہ آخر وقت تک شکستہ دل رہے۔ محمد امین خاں کو مراد آباد کی فوجداری پر ڈال دیا گیا جس سے وہ بھی خوش نہ رہے۔ چین قلیچ خاں پر گو بظاہر بہت نوازشیں ہوئیں، ان کو اعظم کا دیا ہوا منصب شش ہزاری و خطاب خاں دورانی عطا کیا گیا، اور صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنؤ پر متقرر کیا گیا۔ مگر وہ دربار شاہی کی نامہربانی سے اس قدر برداشتہ خاطر ہوئے کہ ذی الحجہ ۱۱۲۳ھ میں انہوں نے اپنے عہدوں سے استعفا دے دیا۔ اپنے خطابات و مناصب واپس کر دیے، اپنا تمام اثاثہ فقراء پر تقسیم کر دیا اور لباس فقر پہن کر دہلی میں گوشہ نشینی اختیار کرلی[۱]۔ اس طرح بہادر شاہ کے عہد حکومت میں گویا سلطنت کا ایک بازو مستقل طور پر شل رہا۔

---

[۱] اس زمانہ میں بادشاہ نے ان کے لیے ۴ ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی تھی۔ بعد

خطابات ومناصب کی ارزانی

بہادر شاہ کی ایک اور غلطی یہ تھی کہ اس نے خطابات اور مناصب دینے میں اس قدر فیاضی و دریادلی سے کام لیا کہ ان چیزوں کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر مجھ کو حکومت حاصل ہوئی تو میں کسی کی درخواست رد نہ کروں گا۔ اس عہد کو اس نے اس طرح نبھایا کہ "نہیں" کہنا اپنے اوپر حرام کر لیا۔ جس شخص نے جس چیز کی درخواست کی، اس کی قبولیت کا فرمان صادر ہو گیا۔ بے شمار خطابات ادنیٰ سے ادنیٰ لوگوں کو مل گئے یہاں تک کہ قدیم رسم کے خلاف ایک ایک خطاب میں کئی کئی آدمی شریک ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے مرتبے کے لوگ پنج ہزاری اور شش ہزاری منصب پر چڑھا دیئے گئے۔

ہیں انہیں ان کے والد کا خطاب غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ دے کر پھر شاہی خدمت میں لینے کی کوشش کی گئی مگر انہوں نے گوشۂ عزلت نہ چھوڑا۔ منسارام لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا سے ان کے تنفر کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ کوئی شخص امورِ دنیا کا ذکر بھی کرتا تھا تو مکدر ہو جاتے تھے۔ ان کے یہ اشعار اس دور کی کیفیات کو خوب ظاہر کرتے ہیں۔

بہ تنہائی اگر الفت نمی کردم چہ می کردم	بخاموشی اگر عادت نمی کردم چہ می کردم
غم دنیا جہانے را بدام آرزو دارد	اگر من رم ازیں خفت نمی کردم چہ می کردم
تلاش بندگی کردم کہ جاں از دست دل بردم	چو نامرداں اگر طاعت نمی کردم چہ می کردم

اس زمانہ میں نواب کو فقراء و علماء کے سوا کسی کی صحبت پسند نہ تھی۔

خانی اور ملکی اور جنگی اور رائی اور راجگی کا بھاؤ اتنا گرا کہ بڑے بڑے خطاب یافتہ بازاروں میں مارے مارے پھرنے لگے۔ ایک مرتبہ حمید الدین خاں نے اپنے دیوان کیسری سنگھ کے لیے "رائے" کے خطاب کی درخواست کی۔ اس پر بادشاہ نے توقیع کی کہ۔

"خانی در ہر خانہ ورائی در ہر بازار، بپاس خاطر شما این گیدی
ہم رائے باشد"

لوگوں نے سنا تو اس کو گیدی رائے گیدی رائے کہنا شروع کر دیا، اور یہ خطاب ایک مدت تک مضحکہ بنا رہا۔ مشرقی سلطنتوں میں خطابات اور مناصب وہ چیزیں تھیں جو بڑی بڑی جان نثاریوں اور اعلیٰ خدمات کے صلہ میں دی جاتی تھیں اور جن کے حاصل کرنے کی تمنا، لوگوں کو کارہائے نمایاں انجام دینے پر ابھارتی تھی۔ مگر جب خطابات و مناصب بلا امتیاز دیئے جانے لگیں اور ان کے عطا کرنے میں خدمات اور مراتب کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے تو پھر اہل ہمت کو کوئی چیز سلطنت اور بادشاہ کے لیے سرفروشی و جان نثاری پر ابھارنے والی باقی نہیں رہتی۔ خطابات و مناصب کی ارزانی کا ایک دوسرا نقصان یہ بھی ہوا کہ جب ادنیٰ درجہ کے لوگ اعلیٰ مناصب پا کر بڑے درجہ کے امراء کے برابر آ بیٹھے تو قدیم زمانہ کے امراء جو عالمگیر کے زمانہ کا رکھ رکھاؤ، حفظ آداب اور فرق مراتب دیکھے ہوئے تھے، اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر گوشوں میں بیٹھ گئے۔ کیونکہ نئے نوابوں نے اگر اپنی نالائقیوں اور بدتمیزیوں سے سیاست ہی کو نہیں بلکہ تہذیب و معاشرت تک کو گندہ کر دیا تھا۔ مورخین نے چین قلیچ خاں کے استعفیٰ اور گوشہ نشینی کے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے

مذہبی فتنہ

بہادر شاہ کی اہم سیاسی غلطیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اپنی حکومت کی ابتدا ہی میں احکام جاری کر دیئے کہ خطبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ لفظ "وصی" استعمال کیا جائے۔ یہ دوسرے الفاظ میں اس امر کا اعلان تھا کہ سلطنت کا مذہب طریق اہل سنت کے بجائے شیعیت ہو گیا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جس کی بیشتر آبادی سُنّی تھی جس کی حکومت ابتدائے سلطنتِ اسلام سے سُنّی مذہب کی پیرو رہی تھی، اور جس کے تخت پر اس سے پہلے پچاس سال تک عالمگیر جیسا کٹّا سنی بادشاہ متمکن رہ چکا تھا۔ بہادر شاہ کا اپنی حکومت کی ابتدا ہی میں علی الاعلان شیعیت اختیار کر لینا، اور خطبہ جمعہ کو بدل دینا سیاسی اعتبار سے ایک نہایت غیر دانشمندانہ فعل تھا۔ اس نے تمام مسلمانان ہند کے دلوں میں بادشاہ کے خلاف شدید ناراضی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ دہلی، آگرہ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں اس پر فساد برپا ہوئے۔ دہلی میں تبدیل خطبہ کے احکام پہنچے تو آصف الدولہ اسد خاں نے کہا کہ "ہندوستان میں ایسا نہیں ہو سکتا یہ ایران نہیں ہے"۔ احمد آباد میں خطیب کی زبان سے "وصی" کا لفظ سنتے ہی لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور منبر سے گھسیٹ کر اسے ذلت کے ساتھ قتل کر دیا۔ کشمیر میں بھی اسی طرح ایک خطیب قتل کیا گیا۔ لاہور میں ایک مدت تک خطبہ ہی بند رہا کیونکہ علماء نے بالاتفاق ایسے خطبہ کے پڑھنے اور سننے کو ناجائز قرار دے دیا۔ رجب ۱۱۲۳ھ اگست ۱۷۱۱ء میں خود بادشاہ لاہور پہنچا اور علماء کو جن میں حاجی یار محمد

سب سے پیش پیش تھے۔ مباحثہ کے لیے اپنے حضور میں طلب کیا۔ بحث کے دوران میں تلخ گوئی و درشت کلامی تک نوبت پہنچی۔ بادشاہ نے حاجی یار محمد کو ڈانٹ کر کہا کہ کیا تم بادشاہ کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ حاجی نے جواب دیا کہ میں نے خدا سے چار چیزیں طلب کی تھیں جن میں سے علم، حفظ کلام اللہ اور حج کی نعمتیں حاصل ہو چکی ہیں اور اب صرف نعمت شہادت کی ضرورت ہے۔ شہر میں لوگوں کے غیظ کا یہ عالم تھا کہ عمائد شہر اور افغان سردار حاجی یار محمد کے پاس جمع ہوئے اور ایک لاکھ ہتھیار بند آدمیوں سے ان کی امداد کا وعدہ کیا۔ خود شاہزادہ عظیم الشان اور خجستہ اختر (جہاں شاہ) نے خفیہ پیغام بھیج کر اپنی تائید کا یقین دلایا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ مخالف علماء کو پکڑ کر قید کر دیا جائے اور لاہور کو "دار الجہاد" قرار دیا جائے۔ اس پر شاہزادہ معزّ الدین جہاندار شاہ نے علماء کی حمایت کے لیے اپنی فوج اور توپ خانہ کو جمع ہونے کا حکم دے دیا اور کہا کہ اگر شاہی فوجیں ان پر حملہ کریں گی تو میں ان کی طرف سے لڑوں گا۔ اتنے ہنگامے برپا ہونے کے بعد بادشاہ کو معلوم ہوا کہ ایک کٹے مذہبی ملک میں حکومت کا مذہب بدل دینا اتنا آسان نہیں ہے۔

دکن کی صوبہ داری کا جدید عہدہ

فتح حیدر آباد کے بعد بہادر شاہ نے دکن کے چھ صوبوں کو ایک صوبہ قرار دے کر ان کی ولایت ذو الفقار خاں کو عطا کر دی۔ منعم خاں وزیر نے اتنا بڑا ملک ایک شخص کے تصرف میں دینا خلاف مصلحت قرار دے کر خاندیس اور برار پائین گھاٹ کا علاقہ اس کی ولایت سے الگ کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود اورنگ آباد

بیدر، حیدر آباد اور بیجاپور کے چار زبردست صوبے جو پورنا ندی سے لے کر راسکماری تک پورے جنوبی ہند پر پھیلے ہوئے تھے اس شخص کے زیر اقتدار آ گئے جو پہلے ہی سلطنت کا میر بخشی اور نائب وکیل مطلق بھی تھا۔ یہ بہادر شاہ کے عدم تدبر اور سیاست نافہمی کی ایک اور مثال ہے۔ اس طرح گویا اس نے دکن کی آئندہ خود مختاری کی بنیاد رکھ دی۔ اس سے پہلے دکن کے صوبوں پر بادشاہ کی طرف سے الگ الگ صوبہ دار مقرر ہوتے تھے۔ کرناٹک بیجاپور اور کرناٹک حیدر آباد کے فوجدار بھی براہ راست بادشاہ کی جانب سے نامزد کیے جاتے تھے۔ اور دکن کو تقریباً ۸ انتظامی اقطاع میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس صورت میں اگر کبھی کوئی بغاوت رونما ہوتی بھی تو ایک صوبہ یا ایک نظامت میں ہوتی جس کو دوسرے صوبہ کی مدد سے فرو کیا جا سکتا تھا۔ پورے دکن کا بیک وقت قبضہ سے نکل جانا مشکل تھا۔ لیکن بہادر شاہ اس نکتہ کو نہ سمجھ سکا۔ اس نے اس منقسم شدہ طاقت کو مجتمع کر کے ایک شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور یہ مجموعی طاقت ایسی ہولناک بن گئی جس کی ٹکر کی کوئی طاقت تمام ہندوستان میں خود بادشاہ کی طاقت کے سوا نہ رہی۔ اب یہ ناممکن تھا کہ دکن کا صوبہ دار بغاوت کرے اور کسی قریب کے صوبہ دار کے ذریعہ سے اس کو فرو کر دیا جائے۔ اس کے مقابلہ کے لیے لازم ہو گیا کہ خود بادشاہ اپنی پوری قوت کے ساتھ حرکت کرے۔ اور اگر بادشاہ کمزور ہو یا کچھ دوسرے اہم مسائل کی طرف مشغول ہو تو پھر کوئی چیز اس علاقے کو خود مختاری سے روکنے والی نہ تھی بہادر شاہ نے اپنے اس غیر دانشمندانہ فعل سے سلطنت کے مقابلہ میں ایک سلطنت پیدا کر دی۔ اس نے دکن کے پورے علاقہ کو جو ابتدائے آفرینش سے فطری طور پر انفرادیت پسند واقع ہوا ہے، ایک مرکز اور ایک فرمانروا بخش دیا جس کے بعد صرف

اتنی کسر باقی رہ گئی کہ کوئی چابک دست آئے اور اس کو سلطنتِ ہند سے الگ کر دے۔ ذوالفقار خاں یقیناً اپنی حرصِ اقتدار کی بنا پر اول دن سے یہ نیت رکھتا تھا کہ دکن میں خود اپنی فرمانروائی کا رنگ جمائے، مگر اسے تمام ہندوستان کی سیاسی بازی گری کا ایسا چسکا لگا ہوا تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اس کے بعد حسین علی خاں کو یہ موقع دیا گیا، مگر اس کو بھی پورے ہندوستان کی حکومت کا شوق دامن گیر تھا۔ اس لیے اس کے حوصلے بھی دکن کے تنگ رقبہ میں نہ سما سکے۔ تاہم جو اصولی غلطی کی جا چکی تھی اس کے نتائج دیر یا سویر ظاہر ہونے ناگزیر تھے اور وہ ظاہر ہوئے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا

مرہٹوں کے ساتھ معاملہ

ذوالفقار خاں کو سیواجی کے پوتے اور سنبھا کے بیٹے راجہ ساہو کے ساتھ عالمگیر کے زمانہ سے ہی دلچسپی تھی[1] بادشاہ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل اس نے ساہو کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔ اور اسے اپنے ساتھ قلعہ بخشندہ (کنداند) کی مہم پر لے گیا تھا۔ بادشاہ کی وفات کے بعد جب اعظم بہادر شاہ سے لڑنے کے لیے احمد نگر

---

[1] یہ ۱۱۰۰ھ۔ ۱۶۸۹ء میں اپنے باپ سنبھاجی کے ساتھ گرفتار ہو کر آیا تھا اور اس وقت سات آٹھ برس کا تھا۔ اس وقت سے یہ عالمگیر کے ساتھ رہتا تھا۔ عالمگیر نے اسے راجہ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب دے رکھا تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتا تھا۔ جس کا احسان وہ اس کے مرنے کے بعد بھی نہ بھولا۔ چنانچہ اعظم سے الگ ہو کر پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ خلد آباد جا کر عالمگیر کی قبر کی زیارت کی اور وہاں غرباء کو کھانا تقسیم کیا۔

سے آگرہ کی جانب روانہ ہوا تو ذوالفقار خاں نے اس سے ساہو کی سفارش کی، اور اس نے ساہو کی ماں، بہن اور بھائی کو ضمانت کے طور پر اپنے پاس رکھ کر اس شرط پر اسے رہا کر دیا کہ اگر وہ مرہٹہ راج کی گدی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو شاہی حکومت کا مطیع رہے گا۔ اس زمانہ میں ساہو کے چچا رام راجہ کی بیوہ تارا بائی مرہٹوں کی رانی بنی ہوئی تھی۔ اور تمام مرہٹہ سردار اس کی فرمانروائی پر متفق تھے۔ مگر جب سیواجی کا اصلی وارث ساہو رہا ہوا اور اس نے مرہٹہ قوم کو اپنی طرف دعوت دی تو مرہٹوں کی جمعیت میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک بڑا گروہ تارا بائی سے الگ ہو کر ساہو سے مل گیا۔ اور اس نے محرم ۱۱۲۰ھ مارچ ۱۷۰۸ء میں ساہو کو ستارہ لے جا کر سیواجی کی گدی پر بٹھا دیا۔ اس کے مقابلہ میں ایک چھوٹا مگر کافی طاقتور گروہ تارا بائی کی وفاداری پر بدستور ثابت قدم رہا اور اس نے ساہو کو جھوٹا مدعی قرار دے کر فیصلہ کر لیا کہ اس کو مرہٹہ قوم کا راجہ نہ بننے دیا جائے گا۔ اس پر دونوں جماعتوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کا سلسلہ تقریباً ۲۲ سال تک جاری رہا۔

اس حد تک تو ذوالفقار خاں کی حکمت عملی کامیاب تھی کیونکہ اس نے حریف کے گروہ میں تفرقہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب وہ بہادر شاہ کے ساتھ کام بخش کی مہم پر حیدر آباد پہنچا تو وہاں ساہو کے وکیل اس کے پاس پہنچے اور انہوں نے اس کے توسط سے درخواست کی کہ راجہ ساہو کو شش صوبۂ دکن کی سردیس مکھی اور چوتھ[1] اس شرط پر عطا کی جائے کہ وہ ملک کے امن کا ذمہ دار

---

[1] سردیس مکھی کل مال گذاری کا ۹ یا ۱۰ فی صدی، اور چوتھ کل مال گذاری کا ۲۵ فی صدی

ہو گا، اور لوٹ مار کرنے والے گروہوں کو (جو خود مرہٹے ہی تھے) اس فعل سے باز رکھے گا۔ ذوالفقار خاں نے اس درخواست کی پرزور سفارش کی اور بہادر شاہ نے اپنی کمزوری سے اس کو قبول کر لیا۔ لیکن اس دوران میں تارابائی نے بھی اپنے وکلا بادشاہ کے پاس بھیجے اور انہوں نے منعم خاں وزیر کی وساطت سے درخواست کی کہ اگر ہم کو صرف سردیس مکھی کا فرمان دے دیا جائے تو ہم تمام مفسدوں کو دفع کر کے امن قائم کرنے کا ذمہ لیتے ہیں۔ چونکہ ذوالفقار خاں ساہو کی تائید کر رہا تھا اس لیے منعم خاں نے اس کی ضد پر تارابائی کے وکلا کا ساتھ دیا۔ بادشاہ کی فطرت اس قسم کی تھی کہ وہ کسی شخص کی درخواست رد نہ کرتا تھا، حتیٰ کہ بسا اوقات صبح شام کے تفاوت سے مدعی اور مدعا علیہ دونوں کی موافقت میں فرمان صادر کر دیتا تھا۔ اس لیے وہ نہ ذوالفقار خاں کی بات رد کر سکا، اور نہ منعم خاں کی آخر اس نے یہ راہ اختیار کی کہ دس فیصدی سردیس مکھی کا فرمان تو لکھ دیا مگر اس کی تعمیل کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جب تک کہ دونوں فریق لڑ کر باہم اس امر کا تصفیہ نہ کر لیں کہ دونوں میں سے کون مرہٹہ راج کی گدی کا اصلی وارث ہے۔

حصہ تھا۔ اس طرح ساہو دکن کی پوری آمدنی کے ۳۵ فیصدی کا دعوے دار تھا۔ شاہ نواز خاں صاحبِ مآثر الامرا کا بیان ہے کہ ساہو نے چوتھ کا نہیں بلکہ صرف سردیس مکھی کا مطالبہ کیا تھا اور وہ بھی ششش صوبۂ دکن میں نہیں بلکہ اورنگ آباد، برار، خاندیس، بیدر اور بیجاپور کے صوبوں میں لیکن متن میں جو بیان کیا گیا ہے وہ خافی خاں کی روایت کے مطابق ہے۔

گو اس موقع پر مرہٹوں کو اپنی آپس کی نا اتفاقی اور منعم خاں کی عاقلانہ مداخلت سے (جو معلوم نہیں اس نے دانستہ کی تھی یا نادانستہ، سر دیس مکھی کا فرمان حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی، لیکن ان کے لیے یہی ایک بڑی کامیابی تھی کہ مغل بادشاہ نے پہلی مرتبہ دکن کے صوبوں میں ان کا سردیسکھی وصول کرنے کا حق تسلیم کر لیا، اور یہ بھی مان لیا کہ شاہی حکومت خود اپنے ملک میں امن قائم کرنے اور مفسدوں کو دفع کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی، اور اب وہ اس کی محتاج ہو گئی ہے کہ مرہٹہ راجہ آکر اس کی رعایا کو ظالموں کی دست درازی سے بچائے، لوٹ مار کو روکے اور وہ فرض انجام دے جو خود شاہی پولیس اور فوج کو انجام دینا چاہیئے تھا۔ ایک منظم اور باضابطہ حکومت کا اولین فرض یہی ہے کہ وہ اپنے ملک میں امن قائم کرے اور اپنی رعایا کی حفاظت کرے۔ جو حکومت اس فرض کو خود انجام نہیں دے سکتی اور اس کے انجام دینے میں کسی دوسری طاقت کی محتاج ہوتی ہے، وہ دراصل اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ وہ حکمرانی کی قابلیت سے محروم اور فرمانروائی کے حق سے دست بردار ہو چکی ہے۔ اور اب حکومت اس طاقت کا حق ہے جو حکمرانی کے اصلی فرائض کو انجام دے سکتی ہے لیکن بہادر شاہ کے نزدیک اس معاملہ میں اگر کوئی سوال اہمیت رکھتا تھا تو وہ صرف یہ تھا کہ وہ ذوالفقار خاں کی بات مانے یا منعم خاں کی۔ اس سے زیادہ کسی عمیق سیاسی معنی کو سمجھنے کی اس نے کوشش ہی نہ کی اور اس نافہمی کی بدولت اس نے ایک فعل کا ارتکاب کر دیا جو سلطنتِ مغلیہ کی جانب سے پہلی مرتبہ مرہٹوں کے سامنے شکست کا اعتراف اور آئندہ کی مزید شکستوں کا فتحِ باب

تھا، عالمگیر چالیس برس تک سیواجی اور اس کے جانشینوں سے جس بات پر لڑتا رہا وہ یہی تھی کہ سیواجی اور اس کے جانشین شاہی علاقوں میں بدامنی برپا کر کے حکومت کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ اس کے ملک کا امن و امان ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ امن چاہتی ہے تو ہم کو ملک کے حاصلات میں سے چوتھ اور سردیس مکھی عطا کرے۔ ہم امن قائم کر دیں گے۔ اس کے مقابلہ میں عالمگیر اُن کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میرے ملک کا امن خود میرے ہاتھ میں ہے۔ جب تک میں بادشاہ ہوں ملک میں امن قائم کرنا میرا فرض ہے۔ اور ملک کے حاصلات بھی میرا حق ہیں، یہ حق اور یہ فرض دونوں تقسیم نہیں کیے جا سکتے۔ یہی بات تھی جس پر عالمگیر اور مرہٹوں کے درمیان تقریباً نصف صدی تک جنگ برپا رہی، سیواجی، سنبھاجی، اور رام راجہ کی زندگیاں اسی کی خاطر لڑنے میں ختم ہوئیں اور وہ بادشاہ سے اس کو تسلیم کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر میں تارابائی نے پیہم معرکہ آرائیاں اور غارتگریاں کر کے اس چیز کو حاصل کرنا چاہا اور وہ بھی اس میں ناکام رہی [1] یہ اس وقت ہوا جب کہ

---

[1] آزاد بلگرامی نے "خزانۂ عامرہ" میں لکھا ہے کہ آخر میں تارابائی کی درخواست پر بادشاہ نے لصیغۂ سردیس مکھی مرہٹوں کو محصول ملکی میں سے ۹ فیصدی حصہ دینے کا فرمان لکھ دیا تھا اور قاصد اسے لیکر روانہ بھی ہو گئے تھے، مگر پھر اس کی رائے بدل گئی اور اس نے فرمان واپس منگا کر چاک کر ڈالا۔ یورپین اور ہندو مورخوں نے عموماً اسی روایت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن دوسری کوئی تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ خافی خان نے بتصریح لکھا ہے کہ "ہر چند وکلائے تارابائی رانی ... التماس مصالحہ بشرط عطا نمودن سردیس مکھی ششش صوبہ دکن بدستور سر صدئہ روپیہ رجوع آوردہ بود بادشاہ مغفورانہ غیرت اسلام ... قبول نہ نمود۔"

مرہٹوں کی تمام قوت ایک مرکز پر مجتمع تھی، مگر اب شاہی حکومت کے پاس وہی فوج تھی، وہی جنرل تھے، وہی ساز و سامان تھا اور اس کے مقابلہ میں مرہٹوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ ان کی قوت منقسم تھی اور وہ خود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ باوجود اس کے مرہٹے شاہی حکومت سے وہی چیز تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے، اور وہ بھی تلوار کے زور سے نہیں بلکہ محض گفت و شنید کے ذریعہ سے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا بتائی جا سکتی ہے کہ اب اس حکومت کا صدر نشین عالمگیر نہیں بلکہ بہادر شاہ تھا۔

عالمگیر نے مرہٹوں کی مہم کو اس حال میں چھوڑا تھا کہ ان کے تقریباً تمام مقبوضات حتیٰ کہ کوکن بھی جہاں سیوا جی نے اپنا سوراج قائم کیا تھا۔ شاہی فوجوں کے تصرف میں آ چکے تھے۔ ان کے پہاڑی قلعوں کا بھی ایک بڑا حصہ فتح ہو چکا تھا اور صرف چند قلعے ان کے پاس رہ گئے تھے۔ مرہٹہ طاقت ایک مرتب اور منظم حکومت کی حیثیت سے قریب قریب مٹ چکی تھی۔ ان کے بے خانماں گروہ، جو جنگ و جدال کے خوگر ہو چکے تھے اور جن کو آزمودہ کار سردار بھی میسر تھے، ہزار ہزار دو دو ہزار کی غارت گر ٹکڑیوں کی صورت میں اورنگ آباد، بیدر، بیجاپور، برار، خاندیس، مالوہ اور گجرات کے مختلف اقطاع پر پھیل گئے تھے، اور قصبات و دیہات کو لوٹتے اور رہزنی کرتے پھرتے تھے۔ جہاں کہیں شاہی فوج آس پاس موجود ہوتی وہاں سے بھاگ جاتے، اور جہاں کوئی محافظ قوت موجود نہ ہوتی وہاں کی زراعت پیشہ آبادیوں سے جبراً چوتھ وصول کرتے۔ قافلوں کو روک کر ان کے مال کا چوتھائی حصہ چھین لیتے۔ عالمگیر نے ان غارت گر گروہوں کے مقابلے کے لیے

اپنی فوجیں تمام ملک میں پھیلا دی تھیں ۔ اور ان سے زد و خورد کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ یہ حالت ابھی کسی فیصلہ کن مرحلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ادھر بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اور ادھر مرہٹوں کے درمیان ایک تباہ کن خانہ جنگی شروع ہو گئی جو عالمگیر کے بیٹوں کی خانہ جنگی سے بہت زیادہ طویل مدت تک جاری رہی اور جس کی بدولت چند سال کے لیے مرہٹوں کے غارتگر ہاتھ شاہی علاقوں پر دراز ہونے کے بجائے آپس میں ایک دوسرے سے الجھ گئے۔ اس حالت میں عالمگیر کے جانشین کے لیے مرہٹوں کے مسئلہ کو حل کرنے کی اگر کوئی بہتر صورت ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ وہ تارابائی کے مقابلہ میں ساہو کو کھڑا کرتا۔ جو مرہٹہ سردار شاہی حکومت کے تابع فرمان تھے، ان کے ذریعہ سے اس کو ہر قسم کی فوجی و مالی امداد دیتا۔ یہاں تک کہ وہ تارابائی کا زور توڑنے میں کامیاب ہو جاتا۔ پھر اسے کوکن اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ میں سوراج دے کر ایک باجگذار نیم آزاد ریاست کی حیثیت سے اپنی نگرانی میں رکھتا اور اسی کے سپرد یہ کام کرتا کہ مرہٹہ سرداروں کو اپنے ہاں جاگیریں دے دے کر ایسا وسیلۂ معاش بہم پہنچا دے جس کے بعد انہیں شاہی علاقوں میں غارت گری کی نہ ضرورت رہے اور نہ خواہش۔ یہ حکمت عملی کسی حد تک اختیار کی گئی مگر وہ ادھوری تھی اور پوری طرح سوچی سمجھی نہ گئی تھی۔ ساہو کو رہا کیا گیا مگر اسکا اصلی وقت مدعیان تخت کی خانہ جنگی کے آغاز میں نہ تھا بلکہ جانشینی کا مسئلہ طے ہونے کے بعد تھا۔ پھر ساہو کو محض چھوڑ دینا کافی نہ تھا۔ اسے پوری فوجی اور مالی امداد دینی چاہیئے تھی تاکہ وہ اپنی کامیابی کو اپنی قوت دکوشش کا نتیجہ نہ سمجھتا۔ بلکہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا کہ اس کا وجود شاہی امداد پر منحصر ہے۔ اس کو

اور تارا بائی کو آپس میں نمٹ لینے کے لیے آزاد چھوڑ دینا بھی ایک اہم غلطی تھی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ فریقین میں سے ایک لامحالہ دوسرے کو دبا لیتا اور پھر کامیاب فریق پوری مرہٹہ طاقت کا مرکز بن کر سلطنت کے مقابلہ پر اتر آتا، اور فی الواقع یہی نتیجہ ظاہر ہوا۔ اس طرح انہیں باہمی تصفیہ کے لیے چھوڑ دینے کے بجائے صحیح سیاسی تدبیر یہ تھی کہ شاہی حکومت ان دونوں مُخاصموں کے درمیان حَکم بن کر ایسے طریقے سے تصفیہ کراتی جس سے ستارہ اور کولہاپور کی ریاستیں ایک دوسرے کے مقابل شاہی حمایت میں قائم ہوتیں تاکہ ضرورت کے وقت ایک کی شورش و بغاوت کو فرد کرنے میں دوسری کو استعمال کیا جاتا اور ترازو کے دونوں پلڑوں کو جھکانا اور اٹھانا شاہی حکومت کے اختیار میں رہتا۔ اس حکمتِ عملی کو بعد میں نظام الملک نے اپنی پہلی صوبہ داری کے زمانہ میں استعمال کرنے کی کوشش کی مگر اس کے نتیجہ خیز ہونے سے پہلے ہی انہیں واپس بلا لیا گیا۔ اور جب دوسری مرتبہ وہ دکن پہنچے تو اس کی کامیابی کے مواقع باقی نہ رہے تھے۔

حیدر آباد کی مہم ختم ہونے کے بعد ۱۱۲۱ھ ۱۷۰۹ء میں جب بہادر شاہ دکن سے واپس ہوا تو ذوالفقار خاں نے اپنی جانب سے داؤد خاں پنّی کو نائب صوبہ دار مقرر کیا[۱]۔ یہ شخص اس زمانہ میں ذوالفقار خاں کے ماتحت کرناٹک بیجاپور

---

[۱] منعم خاں کی وفات کے بعد خاندیس اور برار پایاں گھاٹ کی صوبہ داری بھی اس کو مل گئی اور اس طرح وہ دکن کے چھ صوبوں کا مالک و مختار بن گیا۔

اور کرناٹک حیدر آباد کا فوجدار تھا۔ اور ایک قائد کی حیثیت سے یقیناً ایک قابل اور بہادر شخص تھا۔ مگر اس وقت دکن کے انتظام کے لیے فوجی قابلیت سے زیادہ سیاسی قابلیت کی ضرورت تھی جو اس میں نہ تھی۔ اس نے سلطنت کے ساتھ مرہٹوں کی سیاسی وضعیت کو بالکل نہ سمجھا اور اپنی پوری قوت ساہو اور اس کی جماعت کی تائید میں صرف کر دی جس سے مہاراشٹر کا توازنِ قوت بالکل بگڑ گیا۔ ساہو کی طاقت اتنی مضبوط ہو گئی کہ اس کے مقابلہ میں تارابائی کی جماعت کو استعمال کرنے کے مواقع بہت کم رہ گئے، اور مرہٹہ راج پائدار بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ اس سے زیادہ بڑی غلطی اس نے یہ کی کہ شاہی سند کے بغیر مرہٹوں کو اپنے اختیار سے ششش صوبۂ دکن میں سردیس مکھی اور چوتھ وصول کرنے کا حق دے دیا اور اس کے معاوضہ میں ان سے یہ سمجھوتا کر لیا کہ اس کی (یعنی داؤد خاں کی)، اور شاہزادوں کی جاگیروں سے تعرض نہ کریں۔ ان جاگیرات کے سوا باقی تمام شاہی علاقوں سے خود داؤد خاں کا نائب ہیرا مَن چوتھ وصول کر کے ساہو کے حوالہ کرنے لگا اور اکثر محالات[1] میں اس کے عمّال نے مرہٹہ سرداروں سے "ما بخیر و شما بہ سلامت" اور "نصف لنا و نصف لکم" کا معاملہ کر لیا۔

یہ بنیادی غلطیاں تھیں جن کی وجہ سے چند سال بعد ہی دکن سے مرہٹوں کا وہ زبردست فتنہ اٹھا جس نے نہ صرف دکن بلکہ تمام ہندوستان میں تہلکہ برپا کر دیا۔ اور سلطنت مغلیہ کے پرخچے اڑا دیئے۔

---

[1] محال قدیم اصطلاح میں ایک انتظامی یونٹ یا تحصیل کو کہتے تھے۔

۳- بہادر شاہ کے بیٹوں کی خانہ جنگی

اب ہم ایک دوسرے دور میں قدم رکھتے ہیں جس سے سلطنت کی اصل تباہی کا آغاز ہوا۔ بہادر شاہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں گو بہت سی غلطیاں کیں اور بعض ایسی غلطیاں کیں جن سے بعد میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ تاہم وہ ایک تجربہ کار شخص تھا۔ اور کم از کم اس میں اتنی قابلیت ضرور تھی کہ سلطنت کا شیرازہ کسی حد تک مجتمع رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے وارثوں میں کوئی اتنی قابلیت بھی نہ رکھتا تھا۔ اور یہ امر یقینی تھا کہ اس بوسیدہ عصا کے ٹوٹتے ہی سلیمانِ حکومت کا جسد کسی طاقت سے نہ سنبھل سکے گا۔ بادشاہ جب تخت پر بیٹھا تھا۔ اُس وقت وہ ایک ۶۵ سال کا بوڑھا تھا جس کے قوی جواب دے چکے تھے۔ چار پانچ برس اس کی قوتوں نے اور ساتھ دیا۔ آخر محرم ۱۱۲۴ھ فروری ۱۷۱۲ء میں اس کا وقت آن پورا ہوا، اور لاہور میں اس نے وفات پائی۔

بہادر شاہ کے بیٹے اور ان کے اختلافات

اس کے بیٹوں میں چار نمایاں شخصیت رکھتے تھے:۔

(۱) مُعزّ الدین، جس کو اس نے اپنی تخت نشینی کے بعد جہاندار شاہ کا خطاب دے کر ٹھٹہ اور ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔

(۲) محمد عظیم، جس کا خطاب عظیم الشان تھا اور بنگال و بہار کی صوبہ داری پر مامور تھا۔

(۳) رفیع القدر، جسے رفیع الشان کا خطاب اور کابل کا صوبہ ملا

ہوا تھا۔

(۴) خجستہ اختر، جس کا خطاب جہاں شاہ تھا۔ اور مالوہ کا صوبہ اس کے سپرد تھا۔

بڑا بیٹا جہاندار شاہ ابتداء عمر میں ایک بہادر سپاہی تھا۔ دکن کی مہموں اور ملتان کی حکومت کے ابتدائی دور میں اس نے خاصی قابلیت اور کاردانی کا اظہار کیا تھا جس کا یہ اثر تھا کہ بہادر شاہ کے مقابلہ پر جاتے وقت اگر اعظم کو کسی کا خوف تھا تو وہ یہی شاہزادہ تھا۔ لیکن آگے چل کر اس کی تمام خوبیاں عیوب سے بدل گئیں اور اسے دورِ شراب ناب اور لال کنور[1] کے عشق کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی باقی نہ رہی۔ ان وجوہ سے بہادر شاہ اس کو سخت ناپسند کرنے لگا تھا۔ تیسرا بیٹا رفیع الشان سیاست و معرکہ آرائی سے دور کا تعلق بھی نہ رکھتا تھا۔ اس کا تمام تر شوق و ذوق اپنے بناؤ سنگھار، تزئین و آرائش اور کپڑے، جواہر اور زیورات جمع کرنے میں تھا۔ چنانچہ عظیم الشان اس پر یہ پھبتی کستا تھا کہ:-

آئینہ و شانہ گرفتہ بدست
چوں زنِ رعنا شدہ گیسو پرست

بہادر شاہ کی شاہزادگی کے زمانہ میں یہ اس کا چہیتا بیٹا تھا اور ایک مدت تک وہی اس کا مشیر وصلاح کار رہا۔ پھر اس کی جگہ چوتھے لڑکے جہاں شاہ نے لے لی اور اس کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ بعض مورخین نے منعم خاں کی وزارت

---

[1] یہ ایک مغنیہ تھی جس کے حسن پر جہاندار شاہ بری طرح فریفتہ تھا۔ اور تمام امورِ دنیا کو چھوڑ کر اسی کے ساتھ عیش و نشاط میں منہمک ہو گیا تھا کہا جاتا ہے کہ یہ تان سین کی نسل سے تھی۔

کو کسی کی سفارش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ لیکن اخیر زمانہ میں دوسرا لڑکا عظیم الشان ان سب پر سبقت لے گیا۔ بادشاہ نے کاروبار سلطنت اسی کے ہاتھ میں چھوڑ دیا تھا، شاہی مہر اس کے پاس رہتی تھی، منعم خاں کے بعد وزارت کا کام عملاً وہی انجام دیتا تھا۔ اور بادشاہ سے لے کر امراء اور عُمّال تک سب پر اس کا اثر چھایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بنگال اور آگرہ کے خزانوں سے جو زبردست دولت اس نے حاصل کی تھی اور جس قدر سازو سامان اور لشکر اس نے فراہم کر لیا تھا۔ اس کی بدولت اپنے سب بھائیوں میں وہی سب سے زیادہ طاقتور تھا اور عام طور پر لوگ اسی کو بہادر شاہ کا آئندہ جانشین سمجھتے تھے۔

بہادر شاہ کی زندگی ہی میں ان چاروں کے درمیان تخت کے حصول کے لیے رقیبانہ عداوت پیدا ہو چکی تھی۔ اور وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ مگر عظیم الشان کا خوف سب کے دلوں پر غالب تھا چنانچہ بادشاہ کی آخری بیماری کے زمانہ میں ایک مرتبہ عظیم الشان اور جہاندار شاہ دونوں اس کے قریب بیٹھے تھے۔ عظیم الشان نے اپنا خنجر اٹھا کر اس سے کھیلنا شروع کیا جہاندار شاہ سمجھا کہ کھیلنے کے بہانے مارنا چاہتا ہے۔ گھبرا کر اٹھا اور اس بدحواسی کے ساتھ بھاگا کہ دروازے سے ٹکرا کر پگڑی گر گئی۔ اسے چھوڑا۔ جوتی بھی چھوڑی۔ ننگے سر ننگے پاؤں اپنی پالکی کی طرف لپکا اور خیمے کی رسیوں میں الجھ کر اوندھے منہ جا پڑا۔ اپنے حریف کی قوت کو دیکھ کر آخر میں اس نے طے کر لیا تھا کہ باپ کے مرتے ہی ملتان بھاگ جائے گا اور وہاں اپنے حامیوں کو جمع کر کے قسمت آزمائی کرے گا۔ اسی طرح دوسرے بھائی بھی شکستہ دل ہو چکے تھے۔ در میدان بظاہر عظیم الشان

کے لیے صاف تھے۔

ذوالفقار خاں کی سازشیں

لیکن تمام امراء میں ایک شخص، اور سب سے زیادہ طاقتور شخص اس کا مخالف تھا جس کی قوت نے اس کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا۔ یہ ذوالفقار خاں تھا۔ ان دونوں کی مخالفت اور اسکے اسباب کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ بہادر شاہ کی وفات سے کچھ مدت قبل اس نے چاہا کہ عظیم الشان سے صفائی کر لے اور اس کے حامیوں میں شامل ہو جائے۔ مگر شاہزادہ نے اس کے پیغام کو نامناسب درشتی کے ساتھ رد کر دیا۔ اس پر بگڑ کر ذوالفقار خاں جہاندار شاہ سے مل گیا۔ اور اس نے رفیع الشان اور جہاں شاہ کو دعوت دی کہ وہ دونوں عظیم الشان کے خلاف جہاندار شاہ کے ساتھ اتحاد کر لیں۔ چنانچہ اس کی کوشش سے تینوں بھائیوں کے درمیان اس پر اتفاق ہوا کہ جہاندار شاہ بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے بادشاہ بنایا جائے گا اور سکہ و خطبہ اس کے نام کا رہے گا۔ رفیع الشان کو کابل، کشمیر، ملتان، ٹھٹھہ اور بھکر کے صوبے ملیں گے۔ نربدا سے لے کر راس کماری تک پورا دکن جہاں شاہ کے حصہ میں آئے گا اور عظیم الشان کے لشکر سے جو کچھ اموال و غنائم ہاتھ آئیں گے۔ وہ تینوں میں برابر تقسیم ہوں گے۔ اس کے ساتھ ایک عجیب و غریب شرط یہ بھی تھی کہ ذوالفقار خاں تینوں بھائیوں کا وزیر رہے گا۔ یہ ایسی مضحکہ انگیز تجویز تھی جس پر خود ذوالفقار خاں مذاق کے طور پر کہتا تھا کہ "تین بادشاہوں کا ہونا تو اس قدر مستبعد نہیں ہے۔ مگر وزیر ایک اور بادشاہ تین، یہ ایک نادر بات ہے۔" غرض یہ معاہدہ قرآن پر لکھا گیا اور تینوں بھائیوں نے قسمیں کھائیں کہ اس پر قائم رہیں گے۔ اس فریق کے ساتھ ذوالفقار خاں کی شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو قلتِ سپاہ و عسرتِ مال کے

سبب سے جہاندار شاہ اور اس کے بھائی ڈر رہے تھے یا اب ذوالفقار خاں کا نام سنتے ہی سپاہی اور سردار فوج در فوج ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ صفر کے وسط میں جب جنگ کی نوبت آئی تو ان تینوں کے پاس مجموعی طور پر ۵۰ ہزار سوار اور ۶۰ ہزار پیادہ فوج تھی اور ان کے مقابلہ میں عظیم الشان کی فوج ۳۰ ہزار سوار اور ۳۰ ہزار پیادہ سے زیادہ نہ تھی۔ اپنی اس کمزوری کو عظیم الشان نے بالکل آخر وقت میں محسوس کیا اور اس کی تلافی اس نے اس طرح کی کہ چین قلیچ خاں کو بعجلت پیغام بھیجا کہ میری مدد کے لیے فوراً آئے۔ یہ تدبیر یقیناً اس کے لیے مفید تھی کیونکہ اس وقت امرائے سلطنت میں اگر ذوالفقار خاں کی ٹکر کا کوئی شخص تھا تو وہی امیر تھا جس نے دہلی میں گوشۂ عزلت اختیار کر رکھا تھا۔ لیکن عظیم الشان نے اس طرف توجہ اس وقت کی جب تلافی کا وقت گذر چکا تھا۔ اس کا پیغام پہنچتے ہی چین قلیچ خاں نے محسوس کیا کہ اگر سلطنت کو بچانا ہے تو اس کا یہی وقت ہے۔ چنانچہ اپنے منتشر آدمیوں کو جمع کر کے وہ تیزی کے ساتھ دہلی سے نکلے۔ لیکن ابھی بادل کی سرائے ہی تک پہنچے تھے کہ لاہور سے عظیم الشان کی شکست اور اس کے مفقود الخبر ہو جانے کی خبر آگئی اور انہیں پھر اپنے کنج فقر کی طرف واپس ہونا پڑا۔

عظیم الشان کی شکست

بہادر شاہ کی وفات سے پہلے ہی لوگوں میں عام طور پر چرچا شروع ہو گیا تھا کہ ایک زبردست فتنہ برپا ہونے والا ہے۔ جس رات بادشاہ کا انتقال ہوا، اس رات تمام سردار (باستثنار چند) اپنی اپنی جمعیتوں کے ساتھ شاہی کیمپ چھوڑ چھوڑ کر فریقین میں سے کسی ایک کے ساتھ ملنے کے لیے چلے گئے۔ شاگرد پیشہ، خدام اور

بازارِ لشکر کے سوداگر نہایت بدحواسی کے عالم میں اپنے اسباب سروں پر لاد لاد کر اور عورتوں اور بچوں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر شہر کی طرف بھاگ گئے۔ آن کی آن میں تمام کیمپ سونا ہو گیا اور معسکر شاہی سے لے کر شہر تک ایک عام اضطراب برپا ہو گیا۔ تخت کے امیدوار بیٹے جو باپ کی موت کے لیے چشم براہ بیٹھے تھے، یہ اطلاع پاتے ہی خونریز جدوجہد کے لیے تیار ہو گئے اور اسی وقت سے فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ اگر عظیم الشان جرأت سے کام لے کر ابتدا ہی میں حریف گروہ پر حملہ آور ہو جاتا تو ممکن تھا کہ تخت اسی کے ہاتھ آتا۔ لیکن اس نے خود حملہ آور ہونے کے بجائے مدافعت کا پہلو اختیار کیا اور اس قیمتی وقت کو اپنی خندقوں کے قلعے میں بیٹھے بیٹھے ضائع کرتا رہا۔ اس کی فوج کے امرا حملہ کے لیے اصرار کرتے کرتے تھک گئے مگر وہ "اندک باشید" کہتے نہ تھکا۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ ذوالفقار خاں کی قائدانہ قابلیت سے خوف زدہ ہو گیا تھا یا وہ اس غلط فہمی میں تھا کہ مخالفین کے پاس روپیہ اور سامان رسد کم ہے اور فوج زیادہ فراہم کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر ان کو زیادہ ڈھیل دی جائے گی تو وہ خود تباہ ہو جائیں گے۔ اس کی ایک اور غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنی دولت فوج کے سرداروں اور سپاہیوں کی وفاداری خریدنے پر صرف نہیں کی اور اپنے بخل سے سب کو بددل کر دیا حتیٰ کہ عام طور پر اس کی کنجوسی ضرب المثل بن گئی اور لوگ کہنے لگے کہ عظیم الشان کے باورچی خانہ سے زیادہ سرد مقام کوئی نہیں ہے۔ بہر حال اپنی ان کوتاہیوں سے اس نے ذوالفقار خاں کو تیاری کی پوری فرصت دے دی اور ذوالفقار خاں اپنی تیاریاں مکمل کر کے یکم صفر ۱۱۲۴ھ ۹ مارچ ۱۷۱۲ء کو تینوں حلیف شاہزادوں کے ساتھ عظیم الشان کے مقابلہ پر آ گیا۔ ایک ہفتہ تک چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہا جس کے دوران میں عظیم الشان

کی فوج کے لوگ بددل ہو ہو کر راتوں کو بھاگنے لگے اور اس کی ساٹھ ستر ہزار فوج میں سے دس بارہ ہزار آدمی باقی رہ گئے ۹ صفر کو ایک زبردست معرکہ ہوا جس میں عظیم الشان کی فوج کا بڑا حصہ شریک ہوا، مگر خود عظیم الشان اپنی جگہ سے نہ ہلا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اب تک اس کا ساتھ دے رہے تھے وہ بھی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے اور ۱۰ صفر کی فیصلہ کن جنگ میں ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی اس کے ساتھ نہ رہا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ بنگال یا دکن کی طرف بھاگ جائے اور پھر تیاری کر کے قسمت آزمائی کرے مگر اس نے کہا کہ دارا شکوہ اور محمد شجاع نے بھاگ کر جو انجام دیکھا وہی مجھے بھی دیکھنا پڑے گا۔ آخر کار اس نے جنگ کی اور دوران جنگ میں اس کا ہاتھی ایک گولہ کھا کر دریائے راوی کی طرف ایسا بھاگا کہ پھر نہ اس کا پتہ چلا نہ اس کے سوار کا۔ اس کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد کریم بھی گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

رفیع الشان اور جہاں شاہ کا خاتمہ

یہ مہم ختم ہونے کے بعد دونوں چھوٹے شاہزادوں نے معاہدہ کے مطابق اموالِ غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ کیا، مگر ذوالفقار خاں کی نیت کبھی ان عہدوں اور قسموں کو پورا کرنے کی تھی ہی نہیں۔ اس نے کچھ دن ٹالنے کے بعد ان کو صاف جواب دے دیا اور ان کے لیے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ تاہم وہ دونوں مل کر نہ لڑے پہلے جہاں شاہ میدان میں اترا اور ۱۸ اور ۱۹ صفر کو اس سے جنگ ہوئی جس میں جہاندار شاہ کی فوج منتشر ہو گئی اور وہ اپنی معشوقہ لال کنور کو ساتھ لے کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا، مگر عین موقع پر ذوالفقار خاں نے بڑھ کر نقشہ بدل دیا اور اس کے ایک ہی حملہ میں جہاں شاہ شکست کھا کر مارا گیا۔ اب دوسرے مدعی رفیع الشان کی باری

تھی جو اس دوران میں الگ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا تھا اور اس کے نجومی اسے یقین دلا رہے تھے کہ آخر کار تخت اسی کے حصہ میں آئے گا۔ ۴ صفر کو ذوالفقار خاں نے حملہ کر کے اس کا بھی خاتمہ کر دیا اور ۱۴ صفر ۱۱۲۴ھ ۲۹ مارچ ۱۷۱۲ء کو ابوالفتح محمد معزالدین جہاندار شاہ کی شہنشاہی کا باقاعدہ اعلان ہو گیا۔

۴۔ جہاندار شاہ کا دورِ حکومت

ذوالفقار خاں نے بہادر شاہ کے بیٹوں میں سب سے زیادہ نالائق بیٹے کو یہ سمجھ کر تخت کے لیے انتخاب کیا تھا کہ وہ ایک عیش پسند شخص ہے۔ امورِ سلطنت سے واسطہ نہ رکھے گا۔ محل سرا میں اس کی حکومت رہے گی۔ اور ہندوستان پر میری ہی۔ لیکن جو شخص اپنے ملک اور اپنی قوم کے نقصان میں اپنا نفع تلاش کرتا ہے اسے نقصان کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس نے اپنی اس حرکت سے سلطنت اور ملک کو بھی تباہ کیا اور اپنے آپ کو بھی۔

سلطنت کے پرانے ارکان کی تباہی اور نئے ارکان کی نااہلی

تخت نشینی کے بعد جہاندار شاہ نے ذوالفقار خاں وزیرِ اعظم اور اس کے سیکرٹری سبھا چند کو دیوانِ خالصہ شریفہ مقرر کیا۔ مگر اس کے سوا جتنے اہم عہدے تھے۔ سب ایسے لوگوں کو دیئے جو اس کے مخالف تھے۔ خصوصیت کے ساتھ جو انتظام ذوالفقار خاں کے لیے سخت نامطبوع تھا وہ یہ تھا کہ جہاندار شاہ نے اپنے برادرِ رضاعی کوکلتاش خاں علی مراد کو خان جہاں کا خطاب دے امیر الامراء میر بخشی بنایا اور اس کے بہنوئی خواجہ حسین (یا خواجہ حسن) کو خانِ دوراں کا خطاب

دے کر بخشی دوم مقرر کیا۔ بچپن میں کوکلتاش خاں سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ جب میں بادشاہ ہوں گا تو تجھے وزیر بناؤں گا۔ اس وقت سے یہ وزارت کی امید رکھتا تھا اب جو ذوالفقار خاں کو وزارت دی گئی تو یہ اور اس کا تمام خاندان آتش زیر پا ہو گیا۔ اور اس نے ہر معاملہ میں وزیر کی مخالفت کرنا اپنا فرض قرار دے لیا۔ فطری طور پر اس کا بہنوئی خواجہ حسین خاں دوراں اس معاملہ میں اس کے ساتھ تھا۔ یہ دونوں شخص فوج کے انتظام اور جنگ کے قواعد و اصول سے قطعی نابلد تھے۔ اور اتنی قابلیت بھی نہ رکھتے تھے کہ فوج میں ان کو کوئی ادنیٰ عہدہ دیا جاتا مگر فوج کلیتہً انہی کے اختیار میں دے دی گئی۔ انہوں نے ذوالفقار خاں جیسے آزمودہ کار سپہ سالار کی رائے کے خلاف عمل کرنا شروع کر دیا اور بادشاہ ان کی ہمت افزائی کرنے لگا۔ اس کے نتائج تھوڑے ہی عرصہ بعد ایسے خوفناک نکلے کہ بادشاہ اور خان جہان اور خان دوراں اور ذوالفقار خاں سب کے سب تباہی کے ایک ہی چکر میں فنا ہو گئے۔

مخالف شاہزادوں کے ساتھ جتنے نامور سردار تھے اور جو سب کے سب عالمگیر کے زمانہ سے سرداری کے مرتبوں پر فائز تھے ان میں سے اکثر کو پکڑ پکڑ کر ہلاک کر دیا گیا اور جو بچ گئے انہیں تباہ ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ رستم دل خاں مخلص خاں، اللہ وردی خاں وغیرہ سخت عذاب کے ساتھ قتل کیے گئے۔ مہابت خاں (سابق وزیر منعم خاں کا بیٹا) حمید الدین خاں (جو عالمگیر کے زمانہ میں کوتوال تھا۔ اور بادشاہ کے بڑے مقرب لوگوں میں سے تھا)، سرفرازہ خاں، امین الدین خاں سنبھلی وغیرہ قید کر دیے گئے۔ اس قحط الرجال میں ایسے ایسے کام کے لوگوں کو محض اس قصور پر ضائع کر دینا کہ انہوں نے خانہ جنگی میں مخالف شاہزادوں کا

ساتھ دیا تھا انتہا درجہ کا احمقانہ فعل تھا۔ اس سے پہلے بہادر شاہ اور اعظم کی خانہ جنگی میں بھی بہت سے امراء اعظم کے ساتھ شریک تھے۔ مگر بہادر شاہ نے فتح یاب ہونے کے بعد یہ کہہ کر ان سب کو معاف کر دیا کہ "ایسے حالات میں لوگ ایک نہ ایک جانب حصہ لینے پر مجبور ہی ہوتے ہیں۔ اگر خود میرے بیٹے دکن میں ہوتے تو انہیں اپنے چچا کا ساتھ دینا پڑتا۔"

بادشاہ کی سفلہ نوازی

جمادی الاولیٰ ۱۱۲۴ھ جون ۱۷۱۲ء میں جہاندار شاہ لاہور سے دہلی پہنچا اور اب ایک نالائق عیش پسند شخص کو بادشاہ بنانے کے نتائج ظاہر ہونے لگے۔ بادشاہ نے لال کنور کو امتیاز محل کا لقب دے کر سلطنت کے خزانے اور مناصب و مراتب سب کے سب اس کے لیے اور اس کے متعلقین و متوسلین کے لیے وقف کر دیئے۔ اہل فضل و کمال پر شاہی عنایات کا دروازہ بند، اور ڈوم ڈھاڑیوں، سفلوں اور اوباشوں پر لطف و کرم کا دریا جاری کر دیا۔ لال کنور کے رشتہ داروں کو، جو سب گویّے اور سازندے تھے، پنج ہزاری اور ہفت ہزاری منصب دیئے اور خطابات اور نوبت و علَم سے سرفراز کیا[1]۔ اس کے حقیقی بھائی خوشحال خاں کو آگرہ کی اور چچازاد بھائی نعمت خاں کو ملتان کی صوبہ داری دی۔ خود لال کنور کے خانگی

---

[1] جہاندار شاہ نے خطابات و مناصب کا معیار اتنا گرا دیا تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ خادموں کو معمولی خدمات پر وہ خطابات و منصب عطا کر دیتا تھا جو کسی زمانہ میں بڑے بڑے امراء کو سال ہا سال کی خدمات کے بعد ملتے تھے۔ مثال کے طور پر محل سرا کی ایک تلماقنی شامان

مصارف کے لیے دو کروڑ سالانہ کی جاگیر مقرر کی، اسے شاہی چتر اور عَلَم و نقارہ استعمال کرنے کا حق دیا۔ اس کے نام کا سکہ جاری کیا اور اس کو اتنا نوازا کہ جہانگیر نے نورجہاں کو بھی نہ نوازا تھا۔ اس کی خواہشات پوری کرنے میں وہ جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے جمنا میں آدمیوں سے بھری ہوئی کشتی جاتے دیکھ کر حسرت سے کہا کہ میں نے آج تک کشتی ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھی۔ یہ سنتے ہی بادشاہ نے حکم دیا اور وہ کشتی اس کے سامنے لاکر ڈبو دی گئی۔ عالمگیر کی بیٹی اور جہاندار شاہ کی پھوپھی زینت النسا بیگم نے لال کنور کے پاس حاضر ہونے سے انکار کیا تو جہاندار نے اس کی صورت تک دیکھنی گوارا نہ کی۔ خود جہاندار کے اپنے بیٹے اعزّ الدولہ اور معزّ الدولہ لال کنور کو ناپسند تھے۔ اس لیے باپ نے ان کو قید کر دیا۔

شاہانہ رعب و وقار کا خاتمہ

تمام شاہی آداب و مراسم بالائے طاق رکھ کر یہ ۵۲ برس کا بوڑھا عاشق اپنی معشوقہ اور اس کے ساتھی گویّوں اور سازندوں کے ساتھ بیٹھ کر شرابیں پیتا گاتا، ناچتا تھا۔ اور وہ لوگ مدہوش ہونے کے بعد اس سے دھول دھپے تک کا

نامی کو اس نے رضا بہادر رستم ہند کا خطاب اور پنج ہزاری منصب صرف اس خدمت کے صلہ میں عطا کیا تھا کہ ایک مرتبہ جب کچھ لوگوں نے جہاندار شاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تو اس نے بر وقت شور مچا کر محل والوں کو بیدار کر دیا اور لوگوں کے آنے تک وہ حملہ آوروں سے تنہا لڑتی رہی۔

مذاق کر بیٹھتے تھے۔ وہ لال کنور کے ساتھ رتھ میں بیٹھ کر بازاروں میں نکل جاتا اور شراب خانوں میں پہنچتا۔ ایک مرتبہ ان دونوں نے ایک مے خانے میں جا کر خوب شراب پی اور مدہوش ہو گئے چلتے وقت ساقی کو ایک گاؤں جاگیر میں مرحمت ہوا۔ رتھ میں سوار ہونے کے بعد دونوں اسی میں سو گئے۔ محل پر پہنچے تو لال کنور کو ماما ئیں اٹھا کر لے گئیں اور بادشاہ کو اٹھانا کسی کو یاد نہ رہا۔ رتھ بان نے لے جا کر رتھ گاڑی خانے میں رکھ دی۔ رات کا بڑا حصہ گذرنے کے بعد محل میں بادشاہ کی جستجو شروع ہوئی۔ اور بڑی تلاش کے بعد سلطنتِ ہند کا تاجدار محل سے دو میل کے فاصلے پر گاڑی خانے کے اندر ایک رتھ میں پڑا پایا گیا۔ عالمگیر کی وفات کو ابھی پانچ برس سے زیادہ نہ ہوئے تھے۔ اتنی قلیل مدت میں یہ زمین و آسمان کا فرق دیکھ کر لوگ بادشاہ سے اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ جب وہ نکلتا تو کوئی اس کا ادب نہ کرتا اور کوئی معزز امیر اس کی مشایعت نہ کرتا۔

وزیر کی عیاشی

بادشاہ کو اس طرح زندگی کا "لطف" اٹھاتے دیکھ کر ذوالفقار خاں کو بھی ۵۹ برس کی عمر میں عیاشی کا شوق ہوا اور خود حرمسرا کے مشاغل میں مشغول ہو کر اس نے سلطنت کا کاروبار سبھا چند کے حوالہ کر دیا جس کی بدزبانی و فحش گوئی سے ایک عالم نالاں تھا۔ خود ذوالفقار خاں کے اخلاق و خصائل بھی وہ نہ رہے جو عالمگیر کے زمانہ میں تھے۔ اب وہ ایک تنگ حوصلہ، تنگ نظر اور حاسد شخص ہو گیا تھا۔ لوگوں کو فائدہ پہنچانے سے اس کو تکلیف ہوتی تھی۔ کسی کو ابھرتے دیکھ کر اسے مدد دینے کے بجائے گرانے کی فکر کرتا تھا۔ اس کی وعدہ خلافیاں اور دروغ گوئیاں زبان زد عوام تھیں۔ یا وہ زمانہ تھا جبکہ یہی

ذوالفقار خاں عالمگیر کا ایک بہترین جنرل اور نامور مدبر شمار ہوتا تھا۔ یا اب یہ زمانہ آیا کہ اس کا وجود سلطنت کے لیے نقصان دہ ہو گیا اور اس کی قابلیت نا قابلیت سے اور نیک نامی بدنامی سے بدل گئی۔

وزیر اور بادشاہ کی مخالفت

تاہم ذوالفقار خاں میں اتنا ہوش اب بھی باقی تھا کہ وہ جہاندار شاہ کو اس کی تباہ کن حرکات سے روکتا اور بعض اوقات لال کنور اور اس کے عزیزوں تک کے مقابلہ پر اتر آتا تھا۔ لال کنور اور اس کے عزیز نعمت خاں کلانوت[1] کو جب ملتان کی صوبہ داری کی سند دی گئی تو ذوالفقار خاں نے اس کی سند جاری نہیں کی اور حق التحریر کے طور پر اس سے چند ہزار طنبورے اور ڈھول طلب کیے۔ اس نے لال کنور کے ذریعہ بادشاہ سے اس کی شکایت کی۔ بادشاہ نے ذوالفقار خاں سے ذکر کیا۔ اس نے جواب دیا کہ صوبوں کا انتظام اور مہام، بادشاہی کا انصرام امراء خاندانی کا کام تھا۔ اور گانا بجانا رقاصوں اور کلانوتوں کا کام۔ اب یہ کام ان سے لیا جاتا ہے۔ تو خاندانی امراء کے لیے ڈھول تاشے ہی مہیا کر دیے جائیں تاکہ یہ غریب گا بجا کر ہی کچھ کما کھائیں۔ لال کنور کے حقیقی بھائی خوشحال خاں نے نئی نئی دولت اور نوابی کے نشے سے بدمست ہو کر شرفاء کی بہو بیٹیوں پر دست درازیاں شروع کر دی تھیں۔ ایک دفعہ اسی قسم کی ایک بیہودہ حرکت کی شکایت ذوالفقار خاں

---

[1] بعض لوگوں نے اس واقعہ کو نعمت خاں کے بجائے خوشحال خاں، لال کنور کے حقیقی بھائی کی طرف منسوب کیا ہے جسے آگرہ کی صوبہ داری دی گئی تھی۔

سے کی گئی تو اس نے سپاہی بھیج کر خوشحال خاں کو کشاں کشاں بلوایا اور اپنے سامنے اتنا پٹوایا کہ بیہوش ہو گیا، پھر اسے قلعہ سلیم گڑھ میں قید کر دیا اور اس کے اموال ضبط کر لیے۔

چین قلیچ خاں کا واقعہ

اس سے زیادہ اہم واقعہ وہ ہے جو چین قلیچ خاں کے ساتھ پیش آیا۔ دہلی کی ایک کنجڑن لال کنور کی دوگانہ بنی ہوئی تھی۔ ملکۂ ہند ہونے کے بعد لال کنور نے اس کو زہرہ بیگم بنا دیا اور وہ صاحبِ جاگیر ہو گئی۔ وہ جب ہاتھی پر سوار ہو کر لال کنور سے ملنے کے لیے قلعہ جاتی تو اس کے ساتھ ملازموں کا ایک جمِ غفیر ہوتا اور یہ لوگ راستے میں بلا لحاظ شریف و وضیع ہر شخص کو چھیڑتے ہوئے چلتے۔ ایک مرتبہ چین قلیچ خاں بہادر کی سواری کا آمنا سامنا ہو گیا۔ چین قلیچ خاں اس زمانہ میں امارت چھوڑ کر فقر و درویشی اختیار کر چکے تھے۔ ان کی سواری کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے۔ زہرہ کے ملازموں نے ان کو بھی چھیڑا اور جب اس کی سواری چین قلیچ خاں کے قریب پہنچی تو اس نے پردے سے منہ نکال کر کہا کہ "اندھے (فیروز جنگ) کا بیٹا چین قلیچ خاں تو ہی ہے؟" اس بیہودگی پر ان کو غصہ آ گیا اور انھوں نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اس کو اور اس کے ہمراہیوں کو سزا دیں۔ اشارہ پاتے ہی سپاہی تلواریں سونت کر حملہ آور ہوئے اور اس کے ہمراہیوں کو مارنے کے بعد انھوں نے خود زہرہ کو بھی ہاتھی سے اتار کر خوب لات گھونسے سے اس کی خبر لی۔ اس کے بعد چین قلیچ خاں سیدھے ذوالفقار خاں کے پاس پہنچے اور اس کو سارا واقعہ سنا دیا۔ ذوالفقار خاں نے اسی وقت بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ "ہم سب خانہ زادوں کی آبرو ایک ہے اور ہیں

اس معاملہ میں چین قلیچ خاں کے ساتھ ہوں"۔ اس پیغام سے بادشاہ کو کچھ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی ورنہ لال کنور نے اسے آمادۂ انتقام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اسی قسم کے واقعات نے ایک طرف تمام امرا و اعیان سلطنت کو بادشاہ سے نفور کر دیا تھا اور دوسری طرف بادشاہ اور وزیر کے درمیان روز بروز کشیدگی بڑھتی جاتی تھی۔

مشرق میں فرخ سیر کی تحریک

جبکہ دارالسلطنت میں حالات اس ڈھنگ پر جاری تھے مشرق کی جانب ایک اور انقلاب کی تیاری ہو رہی تھی۔ بہادر شاہ کی وفات کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی تھی اس میں شاہزادہ عظیم الشان اور اس کے بڑے بیٹے محمد کریم کے مارے جانے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ عظیم الشان عالمگیر کے زمانہ میں بنگال اور بہار کا صوبہ دار تھا۔ وفات سے کچھ مدت قبل جب عالمگیر نے اس کو احمد نگر بلایا تو وہ اپنے دوسرے بیٹے فرخ سیر[1] کو بنگال میں چھوڑ آیا تھا۔ بہادر شاہ کے عہد میں عظیم الشان کو اپنے ان صوبوں کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا اور نوجوان فرخ سیر باپ کی نگرانی سے دور بنگال ہی میں رہا۔ ۱۱۲۲ھ میں دکن سے واپس ہو کر بہادر شاہ نے اعزالدولہ خان عالم (ابن خان جہاں کوکلتاش عالمگیری) کو نائب صوبہ دار بنگال بنا کر بھیج دیا اور فرخ سیر کو اپنے پاس طلب کیا۔ چنانچہ وہ راج محل سے روانہ بھی ہو گیا مگر وہ باپ

---

[1] یہ شاہزادہ ۹ رمضان ۱۰۹۴ھ (۱۱ ستمبر ۱۶۸۳ء) میں بمقام اورنگ آباد دکن پیدا ہوا تھا

اور دادا کے پاس جانا نہ چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنے سفر میں بہت تساہل سے کام لیا۔ یہاں تک کہ جب وہ پٹنہ میں تھا تو اسے بہادر شاہ کی وفات کی خبر پہنچی اس نے کسی مزید ہدایت کا انتظار کیے بغیر پٹنہ میں اپنے باپ عظیم الشان کی بادشاہی کا اعلان اور اس کے نام کا سکہ و خطبہ جاری کر دیا۔ مگر اس کے چند ہی روز بعد اسے اطلاع ملی کہ عظیم الشان جہاندار شاہ سے شکست کھا کر بے نشان ہو گیا۔ اول اول تو وہ سخت پریشان ہوا اور دکن یا بنگال کی طرف بھاگنے کی فکر کرنے لگا مگر اس کی ماں اور بعض دوستوں نے اسے قسمت آزمائی کرنے کا مشورہ دیا اور اس نے کسی ساز و سامان اور تیاری کے بغیر ربیع الاول ۱۱۲۴ھ اپریل ۱۷۱۲ء میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت اس کے ساتھ ہم سو آدمیوں سے زیادہ کی جمعیت نہ تھی۔ طاقتور امراء جن کو اس کے باپ نے بڑھایا تھا اس کی مدد کے لیے تیار نہ تھے مرشد قلی خاں دیوانِ بنگال، اعز الدولہ خانِ عالم نائب صوبہ بنگال، سربلند خاں[1]، علی اصغر خاں فوجدارِ اٹاوہ، چھبیلہ رام ناگر فوجدار کڑہ مانک پور غرض سب نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اس حالت میں اس نے سید حسین علی خاں صوبہ دار عظیم آباد (پٹنہ)، سے مدد کی درخواست کی۔ اس کی ماں نے انتہائی الحاح و زاری کے ساتھ اس سے التجائیں کیں، اور ان باتوں سے متاثر ہو کر نہ صرف وہ خود فرخ سیر کی حمایت پر آمادہ ہو گیا بلکہ اس نے اپنے بڑے بھائی سید حسن علی خاں صوبہ دار الہ آباد کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

---

[1] یہ شخص عظیم الشان کا ہمزلف تھا اور اسی رشتہ کی بدولت اسے ترقی حاصل ہوئی تھی

سادات بارھہ فرخ سیر کی حمایت پر

یہ دونوں بھائی جو تاریخ میں "بادشاہ گر" مشہور ہیں، اعاظم ساداتِ بارھہ سے تھے۔ اور ساداتِ بارھہ وہ لوگ تھے جن کی شجاعت و شمشیر زنی اکبر بادشاہ کے زمانہ سے شہرۂ آفاق تھی۔ ان کا باپ سید عبداللہ خاں عالمگیر کے زمانہ میں بیجاپور اور اجمیر کی صوبہ داریوں پر رہ چکا تھا، اور اخیر زمانہ میں شاہزادہ محمد معظم کی ملازمت میں تھا۔ سید حسن علی خاں عالمگیر کے زمانہ میں سلطان پور نذربار (یا نندربار) سیونی اور اورنگ آباد دکن کی فوجداریوں پر، اور سید حسین علی خاں رنتھنبور اور ہنڈورہ بیانہ کی فوجداریوں پر رہ چکا تھا۔ ۱۱۰۶ھ ۱۶۹۴ء میں جب عالمگیر نے شاہزادہ معز الدین (جہاندار شاہ) کو ملتان کی صوبہ داری پر مقرر کیا تو یہ دونوں بھائی اس کے ساتھ بھیجے گئے، مگر اس سے ان کی نہ بنی اور یہ بگڑ کر لاہور چلے گئے۔ یہ جہاندار شاہ سے اُنکی مخالفت کی ابتدا تھی۔ عالمگیر کی وفات کے بعد جب شاہ عالم بہادر شاہ حصول تخت کی جدوجہد کے لیے پشاور سے لاہور پہنچا تو اس نے ان دونوں کو سہ ہزاری اور دو ہزاری منصب علی الترتیب دے کر اپنے ساتھ لے لیا اور جنگِ جاجو میں انھوں نے بڑی جانفشانی دکھائی جس کے صلہ میں ان دونوں کو چہار ہزاری منصب دیا گیا اور بڑے بھائی حسن علی خاں کو سید عبداللہ خاں کا خطاب دیا گیا۔ لیکن بادشاہ کے بیٹے جہاندار شاہ اور وزیر اعظم کے بیٹے خانہ زاد خاں سے مخالفت ہونے کے باعث ان کو کوئی عہدہ نہ مل سکا اور یہ ایک مدت تک بیکار رہے۔ آخر فرخ سیر کے باپ شاہزادہ عظیم الشان نے ان کی حمایت کی اور سید عبداللہ خاں کو اپنے نائب کی حیثیت سے الٰہ آباد کے صوبہ پر اور سید حسین علی خاں کو بہار کے صوبہ پر

مقرر کر دیا۔ یہ فرخ سیر کے ساتھ ان کی موافقت کی ابتدا تھی جہاندار شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد سید عبداللہ خاں کو الہ آباد سے معزول کر کے سید راجی محمد خاں کو اس کی جگہ مامور کیا اور نئے صوبہ دار نے ایک شخص سید عبدالغفار خاں کو اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ مگر عبداللہ خاں نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ اب جہاندار شاہ نے اپنے اس فعل کی تلافی کرنی چاہی اور عبداللہ خاں کو صوبہ داری کا پروانہ بھیج دیا لیکن اس کے دل میں جو گرہ پہلے سے پڑی ہوئی تھی وہ اور مضبوط ہو گئی اور اس نے فرخ سیر کی تائید و حمایت کے لیے حسین علی خاں کی دعوت کو قبول کر لیا۔

فرخ سیر کے دوسرے حامی

اسی زمانہ میں فرخ سیر کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی شامل ہو گئے جنہوں نے بعد کے واقعات میں نمایاں حصہ لیا۔ ان میں سے ایک خواجہ عاصم تھا جو ابتدءً عظیم الشان کے والاشاہیوں میں شامل تھا۔ فرخ سیر کے ساتھ بچپن سے اس کے تعلقات تھے اور وہ پہلوانی، تیر اندازی، چوگان بازی، شہسواری اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں میں اس کا شریک رہتا تھا۔ اس کے تعلقات یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ فرخ سیر کے دوسرے ساتھیوں نے عظیم الشان کو اس کی شکایات لکھ کر بھیجیں اور اس نے بہادر شاہ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل اس کو لاہور بلا لیا۔ جہاندار شاہ اور عظیم الشان کی لڑائی کے موقع پر یہ شخص موجود تھا۔ عظیم الشان کے مارے جانے کے بعد جان بچا کر آگرہ کی طرف بھاگا اور وہاں سے سیدھا فرخ سیر کے پاس پہنچا۔ یہاں پھر وہی تعلقات تازہ ہو گئے اور فرخ سیر نے اسے

اشرف خاں کا خطاب دے کر داروغگی دیوان خاص و داروغگی توپخانہ کا عہدہ دیا اور پھر اپنے خاص دوستوں میں شامل کر لیا چونکہ آدمی پورا درباردار تھا، کم علمی کے باوجود اپنی خوش گفتاری اور ظاہری شائستگی سے دوسروں پر اثر قائم کر لیتا تھا۔ اس لیے اسے فرخ سیر کے مزاج میں بڑا دخل حاصل ہو گیا۔ ایک دوسرا شخص عبید اللہ نامی تورانی الاصل تھا۔ اوائل عمر میں ہندوستان آیا۔ ملّا آدمی تھا۔ عالمگیر نے اس کو پہلے جہانگیر نگر (ڈھاکہ) اور پھر عظیم آباد (پٹنہ) کا قاضی مقرر کیا۔ اسی زمانہ میں عظیم الشان اور خصوصاً فرخ سیر سے اس کے تعلقات قائم ہوئے اور نوجوان شاہزادے پر اس نے بہت گہرا اثر جما لیا۔ بعد میں اس کو شریعت اللہ خاں کا خطاب مل گیا تھا۔ ان دونوں اشخاص نے آئندہ تاریخ میں جو حصّہ لیا ہے اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

فرخ سیر کی پہلی کامیابی

جہاندار شاہ کو جب پیہم خبریں پہنچیں کہ بہار اور الٰہ آباد کے صوبہ دار فرخ سیر کی حمایت پر کھڑے ہو گئے ہیں اور وہ تخت حاصل کرنے کے لیے ایک زبردست مقابلہ کی تیاری کر رہا ہے تو اس نے اپنے بڑے بیٹے اعزّ الدین کو جمادی الاخریٰ ۱۱۲۴ھ جولائی ۱۷۱۲ء میں ۵۰ ہزار فوج کے ساتھ آگرہ کی جانب بھیجا، تاکہ وہ فرخ سیر کی پیش قدمی کو بروقت روک سکے لیکن لال کنور کے ساتھ اس کے تعلقات ناخوشگوار تھے اور اس کے اثر سے بادشاہ بھی اس سے ناراض تھا اس لیے خواجہ حسین خاں دوراں اور لطف اللہ خاں صادق کو اس کی اتالیقی پر مامور کر دیا۔ ذوالفقار خاں نے اس انتظام کی سخت مخالفت کی کیونکہ دونوں اتالیق فن حرب سے قطعی نابلد تھے اور خان دوراں نے تو میدان جنگ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ خود شاہزادہ اعزّ الدین اس پر بہت

آزردہ ہوا کہ فوج کی قیادت میں اس کے ساتھ دو آدمیوں کو شریک بلکہ شریک غالب کر دیا گیا مگر کوکلتاش خاں کے اثر سے بادشاہ نے وزیر اور شاہزادے دونوں کی رائے کے خلاف عمل کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعزالدین بددل ہو گیا اور عملاً فوج کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی جو ۵۰ ہزار فوج تو در کنار ۵۰ آدمیوں کو بھی لڑانے کی قابلیت نہ رکھتے تھے۔

شعبان (ستمبر) میں فرخ سیر پٹنہ سے ۲۵ ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستہ میں حسین علی خاں اور سید عبداللہ خاں اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ مل گئے اور متحدہ فوج آگرہ کی طرف روانہ ہوئی، ادھر اعزالدین آگرہ میں بیٹھا وقت ضائع کر رہا تھا دہلی سے اس کو پیش قدمی کے لیے احکام بھیجے گئے مگر اس نے جنبش تک نہ کی، آخر جب تقاضے حد سے بڑھ گئے تو وہ آگرہ سے "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کی نصیحت پر عمل کرتا ہوا روانہ ہوا۔ یہ بددلی اس کی ساری فوج میں سرایت کر چکی تھی حتیٰ کہ فوج اور توپخانہ کے بہت سے افسر ایسے تھے جو فرخ سیر کے حامیوں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کر رہے تھے اور انہوں نے یہ سازش کر لی تھی کہ مقابلہ کے وقت وہ ۲۰ ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر فرخ سیر کی فوج سے جا ملیں گے۔ غرض اس حالت میں دونوں حریف ایک دوسرے کی طرف بڑھتے رہے یہاں تک کہ شوال کے آخر میں کھجوہ پر (الٰہ آباد اور اٹاوہ کے درمیان)، دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں خیمہ زن ہوئے ۲۹، شوال ۸/۲ نومبر کا دن جنگ کے لیے مقرر ہوا، مگر ۲۸، اور ۲۹، کی درمیانی شب کو مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں خواجہ حسین خاں دوراں اور لطف اللہ خاں صادق نے شاہزادہ کو بھاگ جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے بھاگنے سے انکار کیا اور جواب دیا کہ آج تک

تیموری نسل کا کوئی شخص لڑے بغیر میدان سے نہیں ہٹا ہے۔ اس پر خاں دوراں نے لال کنور اور کوکلتاش خاں کے جعلی خطوط پیش کیے جن میں لکھا تھا کہ "بادشاہ مرچکا ہے۔ اگر شاہزادہ اعزالدین فوراً پہنچ جائے تو تخت اس کو مل جائے گا"۔ اس کا وہی اثر ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ آدھی رات کو اعزالدین اور اس کے دونوں اتالیق گنتی کے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر میدان جنگ سے بھاگ گئے اور ۵۰ ہزار فوج، خزانہ، ساز و سامان سب کچھ دشمن کے رحم پر چھوڑ گئے۔

مقابلہ کے لیے جہاندار شاہ کی تیاری

جہاندار شاہ کو اس غداری کا حال معلوم ہوا تو وہ خواب غفلت سے چونکا اور اس نے خود غنیم کے مقابلہ پر جانے کا ارادہ کیا۔ غداروں نے مشورہ دیا کہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تغلق آباد پر (جو دہلی سے ۸ میل جانب جنوب واقع ہے)، مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مگر اس نے آگرہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور فوج کی تیاری کا حکم دیا۔ فوج کا حال یہ تھا کہ گیارہ مہینہ سے اس کو تنخواہ نہیں ملی تھی۔ سامان جنگ اور ضروری آلات و اسباب کی سخت قلت تھی۔ خزانہ میں جس قدر دولت جمع تھی سب بادشاہ کے مشاغل کی نذر ہو چکی تھی۔ زمینداروں اور عاملوں نے انقلاب کے آثار نمایاں اور مرکزی حکومت کی کمزوری آشکار دیکھ کر محاصل ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تقریباً ایک سال سے سلطنت کے خزانہ میں ہندوستان کے مختلف اقطاع سے کوئی آمدنی داخل نہ ہو سکی تھی۔ لیکن اب فوج فراہم کرنی ضروری تھی۔ اس لیے خزانہ کی بچی کھچی رقم خرچ کرنے کے بعد سونے چاندی کے آلات و ظروف جواہر کے زیورات اور سامان حتیٰ کہ چھتوں اور دیواروں کے سنہری نقوش تک اکھیڑ اکھیڑ کر فروخت کر ڈالے گئے اور جب ان سے بھی کام نہ چلا تو شاہی گوداموں کے دروازے

کھول دیے گئے اور روپے کے بدلے سپاہیوں کو سامان تقسیم کر دیا گیا۔ ان طریقوں سے ۸۰ ہزار فوج مہیا کی گئی۔ ان تیاریوں کے دوران میں ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی تجربہ کار شخص کو فوراً آگرہ کی حفاظت پر مامور کر دیا جائے تاکہ بادشاہ کے پہنچنے سے پہلے فرخ سیر اس پر قابض نہ ہو جائے۔ اس کام کے لیے شاہی امراء پر نظر دوڑائی گئی تو چین قلیچ خاں سے بہتر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے چین قلیچ خاں شاہی دربار کا رنگ دیکھ کر بہادر شاہ کے عہد سے گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ اس دوران میں صرف ایک مرتبہ انہوں نے سیاسیات میں حصہ لینے کی کوشش کی تھی یعنی بہادر شاہ کی وفات کے بعد وہ عظیم الشان کی حمایت کے لیے (جو فی الواقع بہادر شاہ کے بیٹوں میں سب سے بہتر تھا) ایک مختصر سی فوج لے کر دہلی سے ایک دو منزل تک گئے تھے۔ لیکن جب ان کو جہاندار شاہ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو فوراً دہلی واپس ہو کر پھر اسی گوشہ عزلت میں جا بیٹھے تھے۔ پھر جب شاہزادہ اعزالدین کو فرخ سیر کے مقابلہ کے لیے بھیجا گیا تھا اور وہ آگرہ جا کر بیٹھ رہا تھا تو اس وقت اسد خاں کی وساطت سے ذوالفقار خاں نے چین قلیچ خاں سے صفائی کر لی اور ان کے سابق خطابات و مناصب بحال کر کے انہیں آگرہ بھیجا۔ مگر اتنے بڑے نامور جنرل کو اعزالدین جیسے ایک ناتجربہ کار لڑکے اور خواجہ حسین اور لطف اللہ خاں صادق جیسے جاہل محض آدمیوں کے ماتحت کر کے یہ امید کرنا کہ وہ جنگ میں کوئی حصہ لے گا، ایک صریح احمقانہ فعل تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ وہ خاموشی کے ساتھ آگرہ جا کر بیٹھ گئے اور انہوں نے عملاً کچھ نہ کیا۔ اب دوبارہ ان کو احکام بھیجے گئے کہ وہ آگرہ کی حفاظت کا ذمہ لیں۔ دوسری طرف محمد امین خاں چین بہادر کو بھی جو تورانی امراء میں چین قلیچ خاں کے بعد سب سے زیادہ ممتاز

تھا، سرہند سے واپس بلایا گیا اور شاہی فوج میں میمنہ کی قیادت پر مامور کیا گیا۔

جہاندار شاہ کی شکست

ذی القعدہ ۱۱۲۴ھ دسمبر ۱۷۱۲ء کے وسط میں دار السلطنت کا انتظام اسد خاں کے سپرد کر کے جہاندار شاہ ۸۰ ہزار فوج کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہوا، اور ذی الحجہ کی ابتدا میں آگرہ کے قریب سموگڑھ کے میدان میں خیمہ زن ہوا جہاں عالمگیر نے دارا شکوہ کو شکست دی تھی۔ دوسری طرف فرخ سیر بھی اس زمانہ میں اعتماد پور پہنچ کر ٹھیر گیا جو سموگڑھ سے شمال مشرق میں پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ دونوں لشکروں کے درمیان جمنا حائل تھی تقریبًا ایک ہفتہ تک دونوں ایک دوسرے کے مقابل پڑے رہے اور کسی نے حرکت نہ کی۔ فرخ سیر نے اس لیے کہ اس کے پاس فوج کم تھی اور ساز و سامان نہ ہونے کے برابر تھا اور جہاندار شاہ نے اس لیے کہ وہ خود کوئی رائے نہ رکھتا تھا اور اس کی فوج کے امرا میں باہم شدید عداوتیں تھیں۔ ذو الفقار خاں اور کوکلتاش خاں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اور ایک جو رائے دیتا تھا، دوسرا اس کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا تیسری جماعت تورانی امرا کی تھی جسے یہ دونوں ابھرنے نہیں دیتے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ یہ لوگ جنگ میں کارِ نمایاں نہ دکھا سکیں۔ اس کا نتیجہ ایک تو یہ ہوا کہ محمد امین خاں اور چین قلیچ خاں کے دلوں میں جہاندار شاہ کی حمایت کا جو تھوڑا بہت جذبہ پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور فرخ سیر کے دوست عبید اللہ خاں (شریعت اللہ خاں) نے خفیہ طور پر مراسلت کر کے ان دونوں کو اس کی حمایت و تائید پر راضی کر لیا۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ذو الفقار خاں اور کوکلتاش خاں کی مخالفت کے باعث سرے سے کوئی نقشہ جنگ ہی نہ بنایا جا سکا۔ اور ایک ہفتہ تک

شاہی فوج بے حرکت پڑی رہی۔ آخر کار سید عبد اللہ خاں اور سید حسین علی خاں بغیر اس کے کہ جانب مخالف کو ان کی نقل و حرکت کی کوئی خبر ہوتی، اپنی تمام فوج لے کر جمنا پار کر آئے۔ اور ۱۳ ذی الحجہ ۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء کو جنگ ہوئی۔ ابتدا ءً جہاندار شاہ کا پلہ بھاری رہا اور فرخ سیر کی شکست یقینی نظر آنے لگی۔ مگر عین موقع پر سید عبد اللہ خاں نے ایک طاقتور دستہ کے ساتھ خاص اس مقام پر حملہ کر دیا جہاں جہاندار شاہ موجود تھا۔ اور یہ چال ایسی کامیاب ہوئی کہ تھوڑے مقابلہ کے بعد جہاندار شاہ کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ لال کنور کو ساتھ لے کر میدانِ جنگ سے سیدھا دہلی کی طرف بھاگ نکلا۔ ذوالفقار خاں نے یہ نقشہ سوچا تھا کہ خود جنگ کے ہنگامہ سے الگ کھڑا تماشہ دیکھتا رہے، اور جب کوکلتاش خاں اور اس کی جماعت لڑ کر ختم ہو جائے تو عین وقت پر مداخلت کر کے فتح کا سہرا اپنے سر باندھ لے مگر جہاندار شاہ کے فرار سے اس کی یہ خود غرضانہ تدبیر ناکام ہوئی اور وہ میدان جنگ میں اکیلا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے دستوں نے مشورہ دیا کہ آپ خود فرخ سیر سے جنگ کریں اور اسے شکست دے کر سلطنتِ ہندوستان کے مالک بن جائیں کیونکہ پادشاہی کسی کی میراث نہیں ہے۔ مگر اس نے کہا کہ اس حرکت سے ہمیشہ کیلئے مجھ پر اور میرے خاندان پر نمک حرامی کا داغ لگ جائیگا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ دکن کی طرف بھاگ جائے اور داؤد خاں کی مدد سے از سر نو جد و جہد کرے، مگر سبھا چند نے کہا کہ بوڑھے باپ کو دشمن کے ہاتھ میں چھوڑ کر خود بچ نکلنا جوانمردی کے خلاف ہے۔ آخر کو مجبور ہو کر وہ بھی راتوں رات دہلی کی طرف فرار ہو گیا۔ اس طرح فرخ سیر کی فتح مکمل ہو گئی۔

۵- فرخ سیر کا دورِ حکومت

۱۴ ذی الحجہ/۱۱ جنوری ۱۷۱۳ء کو فرخ سیر نے باقاعدہ اپنی شہنشاہی کا اعلان کیا۔ چین قلیچ خاں، محمد امین خاں اور دوسرے امراء کو جنہوں نے جہاندار شاہ کی حمایت سے عملاً احتراز کیا تھا، معاف کر کے اپنی ملازمت میں لیا۔ جزیہ کی معافی کا اعلان کیا اور سید عبداللہ خاں کو دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے بعجلت روانہ کیا۔ چنانچہ وہ ۱۷ کو آگرہ سے چل کر ۲۵ کو دہلی کے قریب پہنچ گیا۔ دہلی میں اسد خاں اس وقت گورنر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ذوالفقار خاں میدان جنگ سے بھاگ کر سیدھا اس کے پاس پہنچا اور اس کے بعد جہاندار شاہ بھی اس کی پناہ لینے کے لیے آ گیا۔ ذوالفقار خاں کی رائے یہ تھی کہ جہاندار شاہ کو لے کر ملتان یا کابل یا دکن بھاگ جائے اور پھر ایک مرتبہ قسمت آزمائی کرے لیکن اسد خاں نے اسے ناپسند کیا اور یہ شرمناک روش اختیار کی کہ جہاندار شاہ کو قید کر دیا اور سید عبداللہ خاں کو اپنی اور ذوالفقار خاں کی جانب سے اطاعت نامہ لکھ بھیجا۔ اس طرح بغیر کسی مشقت کے عبداللہ خاں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ سابق بادشاہ اور اس کے حامی اس کے قابو میں آ گئے اور دارالسلطنت پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

اسد خاں اور ذوالفقار خاں کا حشر

اس کے بعد خود فرخ سیر آگرہ سے روانہ ہوا اور ۱۵ محرم کو دہلی کے قریب بارہ پلہ پر جا کر ٹھہرا۔ یہاں ذوالفقار خاں اور اسد خاں دست بستہ اس کے پاس معافی طلب کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ ان دونوں باپ بیٹوں سے سید عبداللہ خاں

نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کے توسط سے پیش ہوں گے تو وہ ان کو ضرور بچالے گا۔ لیکن شریعت اللہ خاں جو ایک سازشی فطرت کا تنگ دل اور پست خیال آدمی تھا یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ قدیم امراء کے خاندانوں کو تباہ کر کے چھوڑے گا۔ کیونکہ ان کی موجودگی میں اس جیسے ادنیٰ درجہ کے آدمیوں کا چراغ جلنا مشکل تھا۔ اس لیے اس نے ایک طرف بادشاہ کو اس کے باپ عظیم الشان اور بھائی محمد کریم کا انتقام لینے پر اکسایا اور دوسری طرف ذوالفقار خاں اور اسد خاں کو قرآن کی قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ اس کی سفارش سے وہ نہ صرف معاف کیے جائیں گے بلکہ ان کے مراتب و مناصب بھی بحال رہیں گے۔ چنانچہ یہ دونوں باپ بیٹے اس دھوکہ میں آکر شریعت اللہ خاں کے توسط سے بادشاہ کے پاس حاضر ہو گئے اور بادشاہ نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ذوالفقار خاں کو قتل کرا دیا اور اسد خاں کو تمام جائیداد اور اموال کی ضبطی کے بعد بوڑھاپے کے دن رو رو کر کاٹنے کے لیے جیتا چھوڑ دیا۔

دہلی میں فرخ سیر کا داخلہ

دوسرے دن دہلی سے جہاندار شاہ کا سر بھی آگیا اور ۱۷ محرم کو نیا بادشاہ اپنے دارالسلطنت میں اس شان کے ساتھ داخل ہوا کہ آگے آگے وہ تھا اور اس کے پیچھے پیچھے ایک ہاتھی پر اس شخص کا سر جا رہا تھا جو مہینہ بھر پہلے تک اس ملک کا بادشاہ تھا۔ دوسرے ہاتھی پر سابق بادشاہ کی لاش رکھی تھی اور اس کی دم سے سابق وزیر ذوالفقار خاں کی لاش بندھی ہوئی لٹک رہی تھی اور سب کے پیچھے ایک پالکی میں ۹۰ برس کا بوڑھا اسد خاں جو ۳۰ برس تک عالمگیر بادشاہ کا وزیر اعظم رہا تھا اور جس نے شاہجہان کی آنکھیں دیکھی تھیں بحال تباہ و خراب جا

رہا تھا۔ یہ عبرت ناک جلوس تمام دہلی کی اشک بار آنکھوں کے سامنے سے گذرا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اب ان کی حکومت کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس کے بعد فرخ سیر نے ان سب اشخاص کو جنہوں نے گذشتہ انقلاب میں حصہ لیا تھا۔ یا جن پر اس کا شبہ تھا۔ قید، قتل اور اندھا کرانا شروع کر دیا۔ اور اس کے مظالم سے لوگوں پر ایسی ہیبت طاری ہو گئی کہ عالمگیر اور بہادر شاہ کے امراء میں سے جب کوئی شخص اس کے دربار میں جانے لگتا تو اہل و عیال سے رخصت ہو کر جاتا اور اگر زندہ واپس آ جاتا تو صدقے اور نذریں دیتا۔

فرخ سیر کے امرا

فرخ سیر نے سلطنت پانے کے بعد ان سب لوگوں کو اعلیٰ درجہ کا صلہ دیا جن کی مدد سے اس نے یہ کامیابی حاصل کی تھی، سید عبداللہ خاں کو قطب الملک یمین الدولہ، ظفر جنگ، سپہ سالار، یارِ وفادار کے خطابات دیئے اور اپنا وزیر اعظم بنایا۔ سید حسین علی خاں کو عمدۃ الملک امیر الامراء فیروز جنگ، سپہ سردار کے خطابات عطا کیے اور میر بخشی کا عہدہ دیا۔ خواجہ عاصم کو صمصام الدولہ خان دوراں بہادر منصور جنگ کا خطاب اور بخشی والا شاہیاں کا عہدہ عطا کیا۔ قاضی عبداللہ (شریعت اللہ خاں) کو معتمد الملک میر جملہ معظم خاں خانخاناں بہادر مظفر جنگ کا خطاب اور داروغگی دیوان خاص و داروغگی غسل خانہ و ڈاک چوکی کا عہدہ دیا۔ ان لوگوں کے ساتھ تورانی امراء پر بھی نوازش کی گئی۔ کیونکہ وہ سابق بادشاہ کے عہد میں معتوب

۱؎ یہ خاندان جو اس طرح تباہ ہوا امرائے سلطنت میں معزز ترین خاندان تھا۔ اسد خاں، یمین الدولہ آصف خاں کا داماد، شاہجہان کا ہمزلف اور عالمگیر بادشاہ کا حقیقی خالو تھا۔ ذوالفقار خاں عالمگیر بادشاہ کا سگا خالہ زاد بھائی ہوتا تھا اور امیر الامراء شائستہ خاں کی بیٹی اس سے بیاہی ہوئی تھی جو عالمگیر کی ماموں زاد بہن ہوتی تھی۔

رہے تھے اور ان کی خفیہ امداد فرخ سیر کے شامل حال تھی۔ محمد امین خان کو چین بہادر اعتماد الدولہ نصرت جنگ کا خطاب اور بخشی دوم کا عہدہ ملا۔ ان کے بیٹے قمر الدین خان کو بخشی احدیان کا عہدہ دیا گیا۔ چین قلیج خاں گوشہ عزلت سے ہمیشہ کے لیے نکالے گئے اور انہیں ہفت ہزاری منصب اور نظام الملک بہادر فتح جنگ کا خطاب دیکر شش صوبۂ دکن کی صوبہ داری پر مقرر کیا گیا۔ ان کے علاوہ سلطنت کے دوسرے اہم عہدے ایسے اشخاص کو دیئے گئے جو بادشاہ کے ہوا خواہ تھے اور صوبوں کی حکومتوں پر بھی اسی قسم کے لوگوں کو مامور کیا گیا۔ ان میں سے بجز چند آدمیوں کے اکثر وہ تھے جو عالمگیر اور بہادر شاہ کے زمانہ میں ذمہ دار عہدوں پر رہ چکے تھے اس لیے بظاہر سلطنت کا انتظام درست نہ ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن بادشاہ کی اپنی نااہلیت اس کے جلیسوں اور مشیروں کی نااہلی، اور عہدوں کے لیے آدمیوں کا صحیح انتخاب نہ کرنے کی غلطی، ان تین چیزوں نے مل جل کر ایسے حالات پیدا کر دیے جن کے تباہ کن نتائج اول دن سے ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

فرخ سیر اور اس کے ارکان دولت کی سیرت

فرخ سیر عقل، تدبر، سیاست فہمی اور کار فرمائی کے جوہر سے عاری اور رائے صائب سے بے بہرہ تھا۔ مزاج میں استقامت نہ تھی۔ کانوں کا کچا تھا، دوسروں کے کہے سُنے پر چلتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پست حوصلہ اور بزدل بھی تھا۔ مردم شناسی جو ایک فرمانروا کے لیے بہت ضروری چیز ہے اس میں مطلق نہ تھی۔ اس نے اپنے گرد کمینے، خوشامدی اور سازشی لوگوں کو جمع کر لیا تھا۔ اور وہ جس طرف اسے موڑتے تھے اسی طرف مڑ جاتا تھا۔ اس کے جلیسوں اور مشیروں میں میر جملہ کی شخصیت سب

سے زیادہ نمایاں تھی جس کے ہاتھ میں وہ دو سال تک موم کی ناک بنا رہا۔ اور اس شخص کا حال یہ تھا کہ سخت حاسد منافق اور سازش پیشہ تھا۔ اگرچہ اپنے واقف کاروں اور عام حاجت مندوں کو فائدہ پہنچانے میں وہ بہت فراخ حوصلہ تھا اور بکثرت لوگ اس سے فیض یاب ہوتے تھے لیکن اس کی فطرت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی تھی کہ اپنے سے بلند تر عمارتوں کو گرا کر تہ خاک کر دینا چاہتا تھا اور نیچی عمارتوں کو اٹھا کر بس اتنا اونچا کرتا تھا کہ وہ خود اس سے فروتر اور اپنے قیام و بقاء کے لیے اس کی رہین منت رہیں۔ اس نے اپنی ذاتی اغراض کی خاطر جوڑ توڑ کیے اور سازشوں کے ایسے جال بچھائے جن میں الجھ کر وہ خود اور اس کے مخالفین اور بادشاہ سب تباہ ہو گئے۔

فرخ سیر نے اپنے وزیر اعظم اور سپہ سالار کے انتخاب میں بھی غلطی کی اور اس کا انجام بھی اس کے اور سلطنت کے حق میں برا نکلا۔ اس میں شک نہیں کہ سید عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں شجاعت، فیاضی، عالی حوصلگی اور دوسرے تمام شریفانہ خصائل سے متصف تھے لیکن ان میں دل و دماغ کی وہ قابلیتیں ہرگز نہ تھیں جو ایک عظیم الشان سلطنت کا نظام چلانے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کا سارا خاندان تلوار کا دھنی تھا اور وہ خود بھی اس صفت میں کسی سے پیچھے نہ تھے مگر ان کو تلوار چلانے کے سوا اور کچھ نہ آتا تھا۔ اکبر اعظم کے زمانہ سے بہادر شاہ کے زمانہ تک ان سے یہی کام لیا جاتا رہا۔ اس سے بڑھ کر سلطنت کے سیاسی اور انتظامی معاملات میں دخل دینے کے قابل نہ انہیں کبھی سمجھا گیا اور نہ اس کا موقع دیا گیا۔ سادات بارھہ کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوا جو سیاسیات و فرمانروائی اور تدبیر امور جہانبانی سے کسی قسم کا لگاؤ رکھتا ہو۔ اس کلیہ سے یہ دونوں بھائی بھی مستثنیٰ نہ تھے۔

ان کے متعلق عالمگیر کے زمانہ میں ایک مرتبہ ذوالفقار خاں نے سفارش کی تھی کہ بڑے بھائی کو ہشت صدی سے ترقی دے کر ہزاری اور چھوٹے بھائی کو ہفت صدی سے ہشت صدی منصب عطا کیا جائے۔ اس پر عالمگیر نے جو بڑا مردم شناس شخص تھا، یہ توقیع کی تھی کہ سادات کی محبت میرا اور ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے مگر ان لوگوں کو ایسی ترقی دینا جس سے یہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں اپنی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کرنا ہے۔ بارھہ کے سید کو جب غیر معمولی ترقی دی جاتی ہے تو وہ انا ولا غیری کا دم بھرنے لگتا ہے اور اپنے مقام کو بھول کر اونچے اونچے خواب دیکھنا اور فساد برپا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اپنی آخری وصیت میں بھی عالمگیر نے سادات بارھہ کے خطرہ کو محسوس کر کے ان کے متعلق یہ الفاظ لکھے تھے:۔

"با ساداتِ لازم السعادات بارھہ بموجب آیۂ" وآتِ ذی القربیٰ حقہ
عمل باید نمود۔ در احترام و رعایت فرو گذاشت نباید کرد۔ ازیں راہ کہ بموجب
آیۂ کریمۂ "لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ" محبت ایں
جماعہ اجر نبوت است۔ ہرگز مقصر نباید بود۔ کہ خیر دنیا و آخرت است
لیکن با ساداتِ بارھہ کمال احتیاط باید نمود۔ در محبت باطنی قصور نباید کرد
و بحسب ظاہر مرتبہ ایں ہا نباید افزود کہ شریک غالب بلکہ طالب ملک
اند۔ اگر اندک اسنترخائے عنان شود، ندامت نخواہ شد"

عالمگیر کی یہ پیش گوئی ان دونوں بھائیوں کے حق میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ ان کو جب سپاہیوں کی صف سے نکال کر وزارت اور امیر الامرائی کی مسند پر بٹھا دیا گیا تو ان میں استبداد، تجبّر، اور تکبّر پیدا ہو گیا اور یہ اپنے آپ کو سلطنت کا

مالک و مختار، اور بادشاہ کو اپنی شطرنج کا ایک مہرہ سمجھنے لگے۔ مخالفین میں کھلم کھلا ان کے مقابلہ کی قوت نہ تھی اس لیے انہوں نے خفیہ سازشوں اور جوڑ توڑ سے کام لیا چھ سات برس تک مسلسل داؤں پینچ اور اکھیڑ پچھاڑ کا سلسلہ جاری رہا اور اس کش مکش نے سلطنت کو ایسا جھنجوڑا کہ اس کی بنیادیں ہل گئیں۔

فرخ سیر اور سادات بارھہ کی مخالفت

چونکہ فرخ سیر کی پادشاہی کا قوام ہی ان مختلف عناصر کی ترکیب سے ہوا تھا اس لیے جس روز اس کی تعمیر پوری ہوئی، اسی روز سے خرابی شروع ہو گئی۔ آگرہ کی جنگ کے بعد سید عبداللہ خاں دہلی کی تسخیر کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ اور حسین علی خاں جنگ میں سخت مجروح ہونے کے سبب دربار کی شرکت اور سیاسیات میں حصہ لینے کے قابل نہ تھا۔ میر جملہ نے اس فرصت کے زمانہ سے خوب فائدہ اٹھایا اور بادشاہ کے پرانے دوست خاں دوراں (خواجہ عاصم)، کے ساتھ مل کر ایک پارٹی بنائی جس کا مقصد سادات کے زور کو توڑنا تھا۔ اس پارٹی نے بادشاہ کے دل میں دونوں بھائیوں کی طرف سے یہ شبہ پیدا کرنا شروع کر دیا کہ یہ اپنے آپ کو سلطنت کا اصلی مالک سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ انہی نے سلطنت آپ کو دلوائی ہے۔ اس لیے یہ آپ کو برائے نام بادشاہ رکھ کر خود حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ فرخ سیر کے وہمی اور کمزور دل میں یہ بیج بہت جلد جڑ پکڑ گیا۔ دوسری طرف حسین علی خاں کو بھی اس کے حامیوں نے یہ خبریں پہنچا دیں اور اس نے اپنے بھائی کو لکھ بھیجا کہ "بادشاہ کی باتوں اور اس کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ میں خدمات اور جان نثاریوں کی کوئی قدر نہیں ہے وہ وفا، احسان شناسی اور پاس عہد سے عاری ہے اور شرم و

غیرت تک نہیں رکھتا۔ لہٰذا ہم کو اب خود اپنی بہتری کی فکر کرنی چاہیئے"۔ ان باتوں نے دونوں جانب مخالف کے جذبات پیدا کر دیے اور مہینہ بھر بعد جب بادشاہ دہلی گیا تو اس کے اور دونوں سیدوں کے درمیان غبارِ کدورت نمایاں نظر آنے لگا۔ انتظام سلطنت شروع ہوا تو عہدوں کی تقسیم میں سخت اختلافات پیدا ہوئے جس کو بادشاہ مقرر کرتا اسے وزیر اور امیر الامراء نامنظور کرتے اور جس کو وزیر اور امیر الامراء مقرر کرتے اسے بادشاہ نامنظور کرتا۔ دونوں بھائی چاہتے تھے کہ سلطنت کا کوئی کام ان کی رائے کے خلاف نہ ہو اور بادشاہ کی کوشش تھی کہ وہ ہر معاملہ میں اپنے شاہانہ اختیارات کو استعمال کرے۔ بیچ والوں نے اس اختلاف کی آگ کو اور زیادہ بھڑکایا۔ ادھر بادشاہ پر میر جملہ اور خان دوراں حاوی تھے۔ خصوصیت کے ساتھ میر جملہ کو تو بادشاہ نے اپنے دستخطِ خاص کا مختار بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ بادشاہ کے علم و اجازت کے بغیر کاغذات پر اس کی جانب سے دستخط کر دیتا تھا۔ اور جس معاملہ میں اسے وزیر یا امیر الامراء کی مخالفت کرنی ہوتی تھی اس میں شاہی دستخط کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ ادھر سید عبداللہ خاں، نے جالسٹھ کے ایک بنیے رتن چند نامی کو جو سخت حریص تنگ نظر خود غرض اور جاہل مطلق تھا، اپنا دیوان بنا کر سلطنت کا سارا کاروبار اس کے سپرد کر دیا اور خود اس قدر عیاشی میں منہمک ہوا کہ بسا اوقات تین تین چار چار مہینے سلطنت کے معاملات کی طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ رتن چند کا یہ حال تھا کہ وہ کوئی کام رشوت لیے بغیر نہ کرتا۔ جن لوگوں کو میر جملہ شاہی دستخط سے کوئی سند دے کر بھیجتا ان کی سندیں جاری نہ ہوتیں اور جن سے رتن چند کو رشوت پہنچ جاتی انہیں وہ جاری کر دیتا۔ اس نے اپنے استبداد سے دیوانِ تن اور دیوان خالصہ دونوں کو معطل اور

تمام متصدیوں اور عاملوں کو بیکار کر دیا تھا. مالی اور ملکی محکموں پر اس کی مطلق العنان حکومت تھی اور وہ محالات خالصہ کو اجاروں پر دے کر لاکھوں روپے وصول کر لیتا تھا. آخر زمانہ میں اپنے دیوانی سے گذر کر شرعی معاملات میں بھی دخل دینا شروع کر دیا تھا اور قاضی تک اس کی تجویز سے مقرر ہوتے تھے. بادشاہ اور وزیر کے ان دونوں سپٹھوؤں کا وجود فتنہ کا ایک مستقل سرچشمہ تھا جس کی بدولت ایک طرف سلطنت کا سارا انتظام خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف باہمی عداوتوں اور مخالفتوں کا رخنہ وسیع سے وسیع تر ہو کر ایک زبردست فساد کے لیے تیار ہو رہا تھا.

سازشوں اور دورخی چالوں کی ابتدا

بہادر شاہ کی وفات کے بعد سے مرکزی سلطنت کا اقتدار جس قدر ضعیف ہو گیا تھا اس کی بدولت باج گذار رئیسوں اور راجاؤں میں انحراف کی جرأت پیدا ہو گئی تھی اور ان میں سے اکثر نے خراج دینا اور احکام کی اطاعت کرنا چھوڑ دیا تھا. لیکن جودھپور کے راجہ اجیت سنگھ نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور اپنے حدود مملکت میں گائے کی قربانی اور اذان بند کر دی، متعدد مسجدوں کو مسمار کیا، اور شاہی ملازموں کو جو اس کی ریاست میں مقرر تھے نکال دیا. اس حد تک اس کی تمام زیادتیاں برداشت کی گئیں مگر جب اُس نے شاہی حدود میں داخل ہو کر خاص شہر اجمیر پر قبضہ کر لیا تو اس کو دفع کرنے کی ضرورت زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کی گئی، اور فرخ سیر نے خود اس کے مقابلہ پر جانے کا ارادہ کیا لیکن میر جملہ اور اس کے ساتھیوں نے اسے روک کر یہ رائے دی کہ حسین علی خاں کو اس کے مقابلہ پر بھیجے اور خفیہ طور پر اجیت سنگھ کو ہدایت کرے کہ وہ اس سے لڑ کر اس کا خاتمہ کر دے. چنانچہ اس سازش کے ساتھ ذی الحجہ ۱۱۲۵ھ جنوری ۱۷۱۴ء

میں ایک طرف حسین علی خاں کو راجہ کے مقابلہ پر روانہ کیا گیا اور دوسری طرف اجیت سنگھ کو لکھا گیا کہ اگر اس نے حسین علی کو ہلاک کر دیا تو نہ صرف اس کا تمام مال و اسباب اسے عطا کر دیا جائے گا بلکہ مزید براں اور بھی الطاف و عنایات سے مالا مال کیا جائے گا یہ شرمناک سازش جس مقصد کے لیے کی گئی تھی اس میں ناکامی ہوئی۔ اجیت سنگھ حسین علی خاں جیسے بہادر سپہ سالار کے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اسے بھاگ کر بیکانیر کے ریگستان میں پناہ لینی پڑی اور آخر کار اس نے نہ صرف شاہی اطاعت قبول کی بلکہ اپنی بیٹی کا ڈولہ فرخ سیر کے لیے بھیجنے کا عہد کر کے صلح کر لی۔

سیدوں اور بادشاہ کے درمیان کشمکش

رجب ۱۱۲۶ھ جولائی ۱۷۱۴ء میں حسین علی خاں راجپوتانہ کی مہم سے واپس ہوا اور مہم کے دوران میں یا دہلی واپس ہو کر وہ اصل خطوط اس کے ہاتھ آ گئے جو اس کے خلاف اجیت سنگھ کو بھیجے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اور ان دونوں بھائیوں کے درمیان عداوت اور زیادہ شدید ہو گئی اور بارہا یہاں تک نوبت پہنچی کہ دونوں بھائیوں نے دربار میں جانا بند کر دیا۔ اپنی محلسراؤں کے گرد مورچہ بندی کر لی۔ فوجیں جمع کر کے مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ بادشاہ کی ماں نے کئی مرتبہ مداخلت کی اور خود وزیر اور امیرالامراء کے ہاں جا کر صفائی کرانے کی کوششیں کیں مگر فتنہ کا سرچشمہ کھلا ہوا تھا اور سیلاب بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لیے اس کا کوئی انسداد نہ ہو سکا۔ آخری تدبیر یہ نکالی گئی کہ دونوں بھائیوں کے مقابلہ میں اتنی طاقت فراہم کی جائے کہ بآسانی ان کا سر کچل دیا جا سکے۔ چنانچہ میر جملہ اور خان دوراں دونوں کو منصب ہفت ہزاری ہزار سوار پر ترقی دی گئی، میر جملہ کے ماتحت ۵ ہزار والا شاہیوں کو اور خاں دوراں کے

ماتحت ۵ ہزار مغل سپاہیوں کو مقرر کیا گیا۔ اور ان کے علاوہ میر جملہ کو خاص طور پر ہندوستان زا مغلوں کی ایک فوج بھرتی کرنے کا حکم دیا گیا جس کی تعداد ۶ ہزار تھی لیکن اتنی فوجیں فراہم کرنے کے باوجود دونوں میں سے ایک میں بھی نہ اتنی جرأت تھی اور نہ قیادت و جنگ آزمائی کی اس قدر قابلیت کہ حسین علی خاں اور عبداللہ خاں جیسے بہادروں کے مقابلہ پر آسکتے۔ اس کے بعد اعتماد الدولہ محمد امین خاں پر نظر دوڑائی گئی۔ اور اس سے کہا گیا کہ وہ شاہی فوجوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر سیدوں کا خاتمہ کر دے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ سیدوں کا قلع قمع ہوتے ہی قبل اس کے کہ میں سنبھل سکوں یہ خود میرا قلع قمع کرنے کی فکر کریں گے۔ اس لیے اس نے اس سازش میں دخل دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اب فرخ سیر بالکل بے بس تھا۔ اس نے چند بااثر آدمیوں کو بیچ میں ڈالا جنہوں نے دونوں بھائیوں سے اس کی صلح کرانے کی کوشش کی۔ ان کے توسط سے اس بات پر تصفیہ ہوا کہ میر جملہ کو بہار کی صوبہ داری پر بھیج دیا جائے اور حسین علی خاں دکن کی صوبہ داری پر چلا جائے۔ چنانچہ اس تصفیہ کے مطابق ذی الحجہ سنہ ۱۱۲۶ھ دسمبر ۱۷۱۴ء میں میر جملہ پٹنہ کی طرف بھیج دیا گیا اور اس کے چند مہینے بعد ربیع الاول سنہ ۱۱۲۷ھ اپریل ۱۷۱۵ء میں امیر الامراء بھی دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگرچہ امیر الامراء کو اس سے بہت پہلے دکن کی صوبہ داری کا پروانہ رمضان سنہ ۱۱۲۶ھ ستمبر ۱۷۱۴ء میں مل چکا تھا۔ مگر وہ خود وہاں نہ جانا چاہتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ذوالفقار خاں کی طرح داؤد خاں کو پھر اپنے نائب کی حیثیت سے وہاں مقرر کر دے لیکن اب اسے تصفیہ کے مطابق مجبوراً وہاں جانا پڑا اور اس نے اس شرط پر جانا قبول کیا کہ شش صوبۂ دکن میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام عہدہ داروں کا عزل و نصب اس کے ہاتھ میں ہو حتیٰ کہ اسے قلعہ داروں سے

تغیر و تبدل تک کا اختیار حاصل رہے۔ حالانکہ قلعہ دار کا عہدہ سلطنت مغلیہ میں اس قدر اہم تھا کہ وہ بادشاہ کے سوا کسی کا تابع فرمان نہ ہوتا تھا۔ ان شرائط کے ساتھ حسین علی خاں دکن کی جانب روانہ ہوا اور چلتے وقت بادشاہ سے کہہ گیا کہ اگر میرے بھائی پر کسی قسم کی دست درازی کی گئی تو ۲۰ دن کے اندر میں دہلی کے سامنے موجود ہونگا۔

حسین علی خاں کا قدم دلی سے نکلنا تھا کہ فرخ سیر پھر اپنے سازشی دوستوں کے اثر میں آگیا اور اس نے انہی دورُخی چالوں سے کام نکالنا چاہا جو اجیت سنگھ کی مہم کے موقع پر آزمائی جا چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے داؤد خاں صوبہ دار گجرات کو برھانپور کی صوبہ داری پر مقرر کیا اور اسے خفیہ طور پر خط لکھا کہ وہ جس طرح ہو سکے حسین علی خاں کو روکے اور اگر ممکن ہو تو اسے قتل کر دے۔ اس خدمت کے صلہ میں اسے امید دلائی کہ وہ بالاستقلال دکن کا صوبہ دار بنا دیا جائے گا[1]۔ ان ہدایات کے مطابق برھانپور پر داؤد خاں نے حسین علی خاں کا راستہ روکا۔ ۸ رمضان ۱۱۲۷؁ھ ۶ ستمبر ۱۷۱۵؁ء کو دونوں میں جنگ ہوئی جس میں داؤد خاں مارا گیا اور حسین علی خاں کے لیے دکن کی صوبہ داری ہر مخاصم و مزاحم کے وجود سے پاک ہو گئی۔

اب ہم صوبہ دکن کے حالات اس وقت سے بیان کرنا چاہتے ہیں جب کہ نظام الملک اس کی حکومت پر مقرر کیے گئے تھے۔ ہم نے سلسلۂ بیان کو قائم رکھنے کے لیے ان حالات کو ابتدا میں بیان کرنے سے پرہیز کیا تھا۔

---

[1] یہ خطوط داؤد خاں کے قتل کے بعد حسین علی خاں کے ہاتھ آگئے اور اس نے انہیں سید عبداللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔

دکن میں مرہٹوں سے نظام الملک کے معاملات

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۱۲۵ھ ۱۷۱۳ء کی ابتدا میں نظام الملک دکن کی صوبہ داری پر بھیجے گئے تھے اور داؤد خاں گجرات کی صوبہ داری پر بدل دیا گیا تھا۔ داؤد خاں نے مرہٹوں سے چوتھ کے متعلق جو سمجھوتا کر رکھا تھا اس کی تائید میں کوئی شاہی سند موجود نہ تھی۔ اس لیے اس کے ہٹتے ہی وہ سمجھوتا ٹوٹ گیا اور نظام الملک نے ان کو چوتھ یا شاہی محصولات میں سے کسی اور قسم کا حصہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان تمام ناجائز محاصل کو جو داؤد خاں کے عُمّال ضلع داری، فوجداری اور راہ داری وغیرہ کے نام سے وصول کیا کرتے تھے، یک قلم موقوف کر دیا۔ اور اپنے متصدیوں، فوجداروں اور عاملوں کو شدید احکام دیئے کہ قانون کی رو سے رعایا پر جو محاصل مقرر ہیں ان کے سوا ایک پیسہ کسی سے ظلمانہ وصول کریں۔ فوجی انتظامات کے سلسلہ میں انہوں نے اورنگ آباد پہنچنے کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ مرہٹوں سے متصل علاقوں میں فوجیں پھیلا دیں اور امن کی حفاظت کا شدید انتظام کیا جس سے مرہٹوں کی غارت گری میں بہت کچھ کمی واقع ہو گئی۔ راجہ ساہو نے اس نقصان کا تدارک فوجی حملہ سے کرنا چاہا اور چندر سین اپنے سیناپتی (سپہ سالار) کو ستارا سے ایک زبردست فوج دے کر شاہی علاقہ کی طرف بھیجا تاکہ چوتھ، سر دیس مکھی اور گھاس دانہ وصول کرے۔ اس مہم میں ساہو نے بالاجی وِشوناتھ کو جو اس وقت تک ایک کارکن کی حیثیت رکھتا تھا (اور چندر سین کے باپ کا ملازم رہ چکا تھا)، حسابات کی نگرانی کے لیے چندر سین کے ساتھ مقرر کر دیا۔ چندر سین کو یہ نگرانی سخت ناگوار ہوئی اور شاہی علاقہ میں پیش قدمی سے پہلے اس میں اور بالاجی میں لڑائی ہو گئی۔ بالاجی جان بچا کر بھاگا اور ساہو کے حکم سے پنڈو گڑھ کے

قلعہ دار نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ مگر چندر سین نے ساہو کی حمایت کی بھی پرواہ نہ کی اور پنڈو گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ ساہو نے اس کے مقابلہ کے لیے ہیبت راؤ نبال کو بھیجا جو مرہٹہ فوج میں سر لشکر کا عہدہ رکھتا تھا۔ دونوں میں جنگ ہوئی جس میں چندر سین نے شکست کھائی۔ اس پر چندر سین سیدھا نظام الملک کے پاس اورنگ آباد چلا گیا اور انہوں نے بڑے اعزاز کے ساتھ اسے اپنی ملازمت میں لے لیا، بیدر سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر بھالکی اور اس کے نواح کا ایک وسیع علاقہ اسے جاگیر میں دیا۔ اور اس کے ساتھیوں میں سے شرزہ راؤ گھنگے اور رنبھاجی[1] نبالکر کو بھی جاگیریں دیں۔ اب مرہٹوں نے محسوس کیا کہ نظام الملک نے ان کی طاقت کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے طرح طرح سے چندر سین کو رام کرنے کی کوشش کی مگر نظام الملک کو آدمی کی دلجوئی اور استمالت کے ایسے ڈھنگ آتے تھے کہ ان کے لطف و نوازش کا گرویدہ ہونے کے بعد پھر کوئی چیز چندر سین کو راجہ ستارہ کے پاس واپس جانے پر آمادہ نہ کر سکی۔ اس واقعہ کو نظام الملک نے خود اپنی ایک عرضداشت میں جو فرخ سیر کے نام لکھی تھی اس طرح بیان کیا ہے:۔

زوجہ راناۓ جھنی (یعنی تارا بائی) و ساھوی شقاوت خوی ہر کدام مردم معتبر نزد او فرستادہ بوۓ عہدۂ مدار المہامی ساختن و اختیار جمیع کارہا باد دادن، طلب داشتہ اند۔ لہذا مردم فہمیدہ و دانا را واسطۂ استمالتِ او قرار دادہ تمہیدات و وعدہ ہا نقوش وہم و

---

[1] رنبھاجی کو بعد میں راؤ رنبھ کا خطاب عطا ہوا۔ اور یہ خطاب اب تک اس کی اولاد میں باقی ہے۔

دسواس را از صفحۂ باطنش سترده رام و مطمئن نموده شد ..... چنانچه ۲۱ ذی الحجہ ۱۱۳۱ھ راجہ چندر سین با جمعے کہ اسامی آں ہا سمت تحریر یافت بصدق اعتقاد قدم بر جادۂ انقیاد گذاشتہ آمدہ ملاقات نمود۔ استماع ایں مراتب جمع دیگر را نیز از نا سرداران مائل بصراطِ مستقیم اطاعت ساختہ ..... اغلب کہ عنقریب بہ تبعیتِ راجہ ایں ہا نیز بگروند"

چندر سین بدلہ لینا چاہتا تھا، اور نظام الملک غارت گری کو روکنے کی فکر میں تھے۔ اس لیے دونوں نے متفقہ طور پر ایک فوج سر لشکر کے مقابلہ پر بھیجی۔ ادھر سے ساہو نے بالاجی وشواناتھ کو سر لشکر کی امداد کے لیے ایک فوج کے ساتھ بھیجا۔ پُورنددھر کے قریب جنگ ہوئی جس میں ساہو کی فوج شکست کھا کر سالپی گھاٹ کی طرف پسپا ہو گئی۔ رنبھاجی بنالکر نے بڑھ کر پونا کے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور نظام الملک نے اسی کے نواحی میں اس کو جاگیر عطا کر دی۔ یہ حال دیکھ کر ساہو خوفزدہ ہو گیا اور اس نے نظام الملک سے چند شرائط پر صلح کر لی۔ یہ شرائط کسی تاریخ میں نظر نہیں ملیں۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً حکومت کے لیے مفید ہوں گی اور ان کا ماٰل یہ ہو گا کہ ساہو کی جانب سے آئندہ شاہی علاقہ میں غارت گری نہ ہونے پائے گی۔ لیکن یا تو ساہو نے خود اس عہد کی پابندی نہ کی یا وہ اپنے آدمیوں پر اتنا قابو نہ رکھتا تھا کہ انہیں پابندی پر مجبور کر سکتا۔ بہر حال اس صلح کے بعد بھی مرہٹوں کی جانب سے متعدد مرتبہ غارت گری کے واقعات پیش آئے اب نظام الملک نے ان کا زور توڑنے کے لیے ایک اور تدبیر اختیار کی جو پہلی تدبیر سے زیادہ موثر تھی۔ یہ ساہو کے مقابلہ میں اس کے کولہاپور والے حریف کو قوت پہنچانے کی تدبیر تھی۔

نظام الملک کی آمد سے پہلے داؤد خاں کی نائب صوبہ داری کے زمانہ کا واقعہ ہے

کہ ۱۷۱۲ء میں راجہ رام کا بیٹا شیواجی جو تارا بائی کے بطن سے تھا مر گیا اور اس کے ساتھ ہی تارا بائی کا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ ریاست کے عمائد نے راجہ رام کے دوسرے بیٹے، سنبھاجی کو گدی پر بٹھا دیا۔ اور تارا بائی کو قید کر دیا۔ اس انقلاب سے کولہاپور کی ریاست نسبتاً کمزور ہو گئی تھی کیونکہ اسے تارا بائی جیسی فرزانہ اور بہادر رانی کی رہنمائی حاصل نہ رہی تھی۔ ساہو کو داؤد خاں کی حمایت پہلے ہی حاصل تھی۔ تارا بائی کے ہٹ جانے سے اسکو اور زیادہ فائدہ حاصل ہوا اور مرہٹہ قوم میں اس کا اقتدار بہت مضبوط ہو گیا۔ نظام الملک نے اورنگ آباد پہنچتے ہی پیش رو کی اس غلطی کو محسوس کر لیا تھا اور وہ ابتدا سے اس فکر میں تھے کہ ساہو کے مقابلہ میں سنبھاجی کو قوت پہنچائیں۔ مگر بعد میں ساہو کی روش اور اس کی عہد شکنی سے ان کو اس حکمتِ عملی کی ضرورت اور زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی اور انہوں نے اپنے اثر سے کام لے کر بڑے بڑے مرہٹہ سرداروں کو سنبھاجی کی حمایت پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ مشہور مرہٹہ لیڈر سنتاجی گھوڑپڑے کا بھتیجا سیدوجی گھوڑپڑے سنبھا سے مل گیا اور اس کے ساتھ گھوڑپڑے خاندان کے بہت سے سردار کولہاپوری فوج میں شامل ہو گئے۔ سیدوجی کا دوست اور نظام الملک کا ماتحت رئیس نواب ساوانور بھی سنبھا کا مددگار ہو گیا۔ ایک اور طاقت ور مرہٹہ سردار اوداجی چوہان نے ساہو کو اس قدر پریشان کیا کہ اسے اپنے چند تعلقوں کی چوتھ دے کر اس سے صلح کرنی پڑی۔ اس کے علاوہ بہت سے اور چھوٹے بڑے سرداروں نے بھی اپنا وزن سنبھا کے پلڑے میں ڈال دیا جن میں سب سے زیادہ خوفناک کنہوجی انگریا تھا۔ یہ ساونت واڑی سے لے کر بمبئی تک کے ساحل پر قابض تھا اور اس کا اثر کوکن کے سواحل پر تیزی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ ان حالات نے چند مہینوں کے اندر ساہو کا زور آدھے سے زیادہ توڑ دیا۔ مگر نظام الملک یہ بھی نہیں چاہتے تھے

کہ اس کو بالکل مٹا کر سنبھا کو اس کی جگہ دے دیں۔ اس لیے انہوں نے توازن قائم رکھنے اور تالیف قلب کرنے کے لیے اس کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ فرخ سیر سے سفارش کر کے اسے منصب دہ ہزاری ذات وسوار دلوایا۔ اور اس سلسلہ میں ساہو سے پھر ایک مرتبہ یہ تسلیم کرالیا کہ وہ خواہ اپنے زعم میں ہندوؤں کا بادشاہ ہو۔ لیکن مغل شہنشاہی میں اس کی حیثیت ایک زمیندار یا دلیشکھ سے زیادہ نہیں ہے۔

نظام الملک کے عزل کا اثر دکن کی سیاست پر

نظام الملک نے اپنی اس پالیسی سے مرہٹہ طاقت کو قابو میں لانے اور دکن کے فتنہ کو فرو کر دینے کا پورا بندوبست کر لیا تھا لیکن ابھی اس پالیسی کی ابتدا ہی تھی کہ دو واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے سارا نقشہ بدل دیا۔ ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء کے اواخر میں ایک طرف شاہی فرمان کے مطابق نظام الملک دکن کی صوبہ داری سے معزول کر کے دہلی طلب کر لیے گئے اور ان کی جگہ امیر الامرا سید حسین علی خاں کو دکن بھیجا گیا جو اسکے صوبے کے سیاسی معاملات سے بالکل ناواقف، نفس سیاست سے بے بہرہ، اور ایک نرا سپاہی آدمی تھا۔ دوسری طرف اسی سال راجہ ساہو نے اپنا پیشوا یا مکھ پر دھان (وزیر اعظم)، بالاجی وشوا ناتھ کو بنایا اور خود اپنی حویلی میں محو عیش و نشاط ہو کر ریاست کے تمام اختیارات اس کے سپرد کر دیئے۔ یہ شخص سپاہیت کے اعتبار سے تو حسین علی خاں کے ساتھ کوئی نسبت

---

[1] یہ مرہٹہ ریاست میں پیشوا کے اقتدار کی ابتدا تھی۔ اس وقت سے ستارا کا راجہ ایک برائے نام راجہ رہ گیا اور حکومت کلیتہً بالاجی وشوا ناتھ کے خاندان میں آگئی جو پیشواؤں کا خاندان کہلاتا ہے۔

نہ رکھتا تھا، مگر سیاسی تدابیر میں حسین علی خاں اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے آتے ہی مرہٹہ راج کے تنِ مردہ میں جان ڈال دی۔ بدنظمی و طوائف الملوکی کو دور کیا۔ سرکش سرداروں کو دبایا اور ایک قلیل مدت میں از سرِ نو ایک مضبوط و مستحکم حکومت قائم کر لی۔ دوسری طرف دکن کے مورکھ صوبہ دار کو اس نے سیاست کے میدان میں شکستِ فاش دی اور محض اپنی فرزانگی و فطانت کے بل پر اس سے ایک ایسا معاہدہ کر لیا جس کی بدولت مرہٹے نہ صرف شش صوبۂ دکن کے شاہی محاصل میں ۳۵ فیصدی کے حصہ دار ہو گئے بلکہ آئندہ کے لیے ان کو پوری سلطنت کے معاملات میں مداخلت کرنے اور پورے ملک پر چھا جانے کے مواقع مل گئے۔ اس کی ان کامیابیوں کو دیکھ کر اکثر مورخین نے اس کو سیواجی کے بعد مرہٹہ سلطنت کا بانی دوم قرار دیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ سیواجی کے بعد اس کے خاندان میں کوئی اس قابلیت کا شخص نہ ہوا تھا جو سلطنتِ مغلیہ کے مقابلہ میں مرہٹہ راج کا علم بلند رکھ سکتا۔ سنبھا کی نالائقی مسلّم تھی۔ رام راجہ نرا جنگ جو تھا۔ تعمیری قابلیت کا اس نے کوئی ثبوت نہیں دیا۔ تارا بائی کی فرزانگی و شجاعت دونوں مسلّم ہیں مگر عالمگیر کے مقابلہ میں خراب شدہ مرہٹہ ریاست کی بازتعمیر وہ بھی نہ کر سکی۔ ساہو فطرتاً کمزور اور عیش پسند طبیعت کا آدمی تھا[1] اور پندرہ بیس سال تک

---

[1] لچھمی نرائن شفیق اپنی کتاب بساط الغنائم میں لکھتا ہے "ساہو سخت زانی و حرام کار بود۔ ہر جا کہ زن جمیلہ از رعایا و سپاہی می شنید، بزور و زر طلبید و مباشرت نمودہ سر میداد۔ اکثر اوقات بخانہ کسانیکہ زن شکیل می یافت خود رفتہ دار شانش را بعنف و عذر بدر کردہ شب ہا می ماند۔"

ساہو کی وفات کے سبب میں بھی اس مصنف نے ایک نہایت شرمناک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

مغل دربار میں رہ کر اس کے اندر بھی وہ خصائل پیدا ہو گئے تھے جو اس زمانہ کے مغل امراء میں عام تھے۔ان انتہا کو پہنچے ہوئے شہری خصائل کو لے کر وہ ایک ایسی بدوی قوم کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا جو ابھی ترقی کی ابتدائی منزلوں میں تھی اور جسے مغلوں کے مقابلہ میں جگہ حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ جدوجہد کرنی تھی۔اس کی نااہلی کے ساتھ خانہ جنگی کے تباہ کن اثرات نے مل جل کر ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جن سے مرہٹہ راج فنا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ان حالات کو جس شخص نے آکر دفعتہً بدل دیا وہ بالاجی وشوانا تھ ہی تھا اور یہ اس کی اعلیٰ قابلیت تھی جس نے مرہٹہ راج کو پھر زندہ کر کے اس میں ایسی روح پھونکی کہ وہ سیواجی کے عہد کی نسبت سے بدرجہا زیادہ طاقتور ہو گیا۔اس لیے اسے مرہٹہ راج کا بانی دوم کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بالاجی کی کامیابیوں میں اس کی قابلیت اور ہوشیاری کے ساتھ مغل شہنشاہ اور اس کے مشیروں اور مدبروں کی ناقابلیت اور حماقت بھی برابر کی شریک تھی۔اگر وہ اس نازک موقع پر نظام الملک جیسے لائق صوبہ دار کو نہ ہٹاتے تو بالاجی ہرگز وہ کامیابی حاصل نہ کر سکتا جو حسین علی خاں کی صوبہ داری میں اس نے حاصل کی۔ہر شخص جس نے نظام الملک اور بالاجی کا موازنہ کیا ہے اس امر کا اعتراف کرے گا کہ قیادت وسپہ سالاری اور سیاسی تدبر دونوں کے اعتبار سے نظام الملک کا درجہ بالاجی سے بہت بڑھا ہوا تھا اور جیسا کہ گرانٹ ڈف نے تصریح کہا ہے، ان کی پالیسی اور ان کی طاقت ایسی تھی جو بڑی حد تک مرہٹوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔اگر انہیں اس پالیسی کو جاری رکھنے کا موقع دیا جاتا اور بالاجی کے دور حکومت کی ابتدا ہی میں وہ اس کی چالوں اور تدبیروں کا توڑ کرنے کے لیے موجود ہوتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ بالاجی مرہٹہ راج کو

اس درجہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتا تھا جس میں حسین علی خاں کی بدولت کامیاب ہوا۔

مرہٹوں کے مقابلہ میں حسین علی کی ناکامی

نظام الملک کی دکن سے واپسی اور حسین علی خاں کی آمد کے درمیان جو وقفہ گذرا اس میں مرہٹوں نے پھر شاہی علاقوں میں غارت گری شروع کر دی۔ کھنڈو راؤ ڈبھاڑے[1] جو کئی سال سے گجرات اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا خاندیس کے علاقہ میں آن بسا اور اس نے مٹی کی گڑھیاں بنا کر جگہ جگہ تھانے قائم کر لیے۔ بندرگاہ سورت سے جس قدر تجارتی قافلے دکن اور وسط ہند کی طرف جاتے تھے ان کے گذرنے کا رستہ یہی تھا۔ کھنڈو نے ان قافلوں کو روک روک کر ان سے چوتھ وصول کرنی شروع کر دی اور اسی طرح نواحی خاندیس کے دیہات میں بھی اس کے آدمی پھیل گئے اور چوتھ کی تحصیل کا بازار گرم ہو گیا۔ حسین علی خاں داؤد خاں کو شکست دینے کے بعد جب اورنگ آباد پہنچا تو اس نے اپنے بخشی ذوالفقار بیگ کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ اورنگ آباد سے ستر کوس کے فاصلہ پر، پرگنہ بھانیر میں جو بگلانہ اور کالنہ کی سرحد پر واقع ہے، مقابلہ ہوا۔ تھوڑی سی زد و خورد کے بعد مرہٹے اپنے مخصوص طریقِ جنگ کے مطابق خدع کے طور پر فرار ہوئے اور ذوالفقار بیگ اس فرار کو شکست کا فرار سمجھ کر تعاقب میں پڑا۔ جب بہت دور جنگلوں میں جا کر بخشی کی فوج پراگندہ ہو گئی تو کھنڈو راؤ

---

[1] اس شخص کا نام تاریخوں میں بہت غلط چھپا ہے۔ کسی میں دیبار بہے کسی میں دبیدڑیہ اور کسی میں پہاڑ۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ اصل مصنفین کی غلطی نہیں ہے بلکہ بعد کے مصححین اور کاتبوں نے صحیح نام سے واقف نہ ہونے کے سبب یہ غلطیاں کی ہیں۔

نے پلٹ کر حملہ کیا اور اس کی فوج کو بالکل تباہ کر دیا۔ خود بخشی بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد حسین علی خاں نے اپنے بھائی سیف الدین علی خاں اور اپنے دیوان محکم سنگھ کو بھیجا اور چندر سین جادو کو ان کی کمک پر مقرر کیا۔ لیکن یہ لوگ کھنڈو راؤ کی قوت توڑنے اور اس کے تھانوں کو اٹھانے اور قافلوں کو اس کی ایذا رسانی سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب شاہی فوج کسی تھانے کے قریب پہنچتی تو مرہٹے اسے چھوڑ کر بھاگ جاتے اور جب وہ وہاں سے ہٹ جاتی تو وہ پھر آکر وہیں قائم ہو جاتے۔ کھلے مقابلوں میں شاہی فوجوں نے مرہٹوں کو متعدد شکستیں دیں اور صاحب مآثر الامرا کے قول کے مطابق انکو دباتی سورت اور ستارہ تک پہنچ گئیں لیکن اپنے اصل مقصد قیام امن میں ان کو کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر کار حسین علیخاں نے اپنی فوج کو اورنگ آباد واپس بلا لیا اور ساہو نے کھنڈو راؤ کو اس کی کامیابی کے صلہ میں سینا پتی دریہ سالار بنا دیا۔

مرہٹوں سے حسین علی کی صلح

اس زمانہ میں فرخ سیر کے سر پر سیدوں کی مخالفت کا ایسا جنون سوار تھا کہ وہ ان کو تباہ کرنے کی خاطر ہر بری سے بری تدبیر کرنے کے لیے تیار تھا، خواہ وہ خود اس کی اپنی سلطنت اور اپنے ملک ہی کو تباہ کرنے والی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے پھر انہی خفیہ سازشوں سے کام لینے کی کوشش کی جو اجیت سنگھ اور داؤد خاں کے معاملہ میں ناکام ہو چکی تھیں۔ بادشاہ کی طرف سے صوبہ دار کے خلاف دکن کے ایک ایک دیوان، زمیندار، فوجدار اور عامل کو خفیہ فرامین بھیجے گئے جن میں تاکید کی گئی کہ صوبہ دار کے احکام کی اطاعت نہ کریں اور حتی الامکان اس کی اتنی مزاحمت کریں کہ وہ حکومت کا کام نہ چلا سکے۔ حد یہ ہے کہ خود راجہ ساہو کو بھی جو علانیہ سلطنت سے برسر پیکار تھا۔ حسین علی خاں کے خلاف خطوط لکھے گئے اور بادشاہ نے خود اپنے صوبہ دار کے

مقابلہ میں اپنے اور اپنی سلطنت کے دشمن کی ہمت افزائی کی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرناٹک، بیجاپور اور حیدر آباد کے صوبوں میں شاہی حکام نے علانیہ صوبہ دار کی اطاعت سے سرتابی کی، اور جو صوبے دار الحکومت (اورنگ آباد) سے قریب واقع تھے۔ ان میں بھی چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام سرکاری ملازموں میں سرکشی و نافرمانی کی روح دوڑ گئی۔ حکومت کے انتظام میں خلل عظیم برپا ہو گیا اور مرہٹوں نے یہ دیکھ کر کہ صوبہ دار کی حکومت اندرونی اضطراب میں مبتلا ہے اور اسے شاہی حکومت کی تائید بھی حاصل نہیں ہے، اتنا زور پکڑا کہ ان کے غارت گر دستے چوتھ اور سردیسکھی وصول کرتے ہوئے اورنگ آباد کے قریب تک پہنچنے لگے۔

حسین علی خاں کو معلوم تھا کہ یہ سب بادشاہ کے اشارہ سے ہو رہا ہے۔ اسی دوران میں اس کو دہلی سے بھی پیہم خبریں پہنچ رہی تھیں کہ بادشاہ اور اس کے درباریوں کی سازشیں سید عبداللہ خاں کے خلاف برابر جاری ہیں۔ اس لیے اس نے بھی سلطنت اور ملک کے مفاد کو نظر انداز کر کے ہر وہ تدبیر اختیار کرنے کا عزم کر لیا جو خود اس کے اپنے مفاد کے لیے مناسب ہو۔ اس موقع سے ایک پرانے مرہٹہ برہمن نے فائدہ اٹھایا جس کا نام شنکراجی ملہار تھا۔ یہ شخص سیواجی اور سنبھاجی کا کارکن رہ چکا تھا اور سنبھا کے بعد رام راجہ نے اسے اپنا پچیو (سرنویس یا چیف سکرٹری) بنا لیا تھا۔ جب جنجی کا قلعہ فتح ہوا اور رام راجہ وہاں سے بھاگا تو اس نے دنیا ترک کر دی اور بنارس جا بیٹھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد شاہی ملازمت اختیار کر لی اور جب حسین علی خاں دکن جانے لگا تو یہ اس کے ہمراہی ملازموں میں شامل ہو گیا۔ یہاں اس نے ستارہ کے مرہٹہ کارپردازوں سے خفیہ مراسلت شروع کر دی اور آہستہ آہستہ حسین علی خاں پر بھی اپنا اعتماد قائم کرتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ حسین علی

بادشاہ، اپنے ماتحت عُمّال، اور مرہٹہ تینں تین مخالفوں کے درمیان گھر کر پریشان ہو گیا ہے تو اس نے ہمدردی و خیر خواہی کے انداز میں اسے مشورہ دیا کہ اگر مرہٹوں کے مطالبات منظور کر لیے جائیں تو ملک کے امن و امان کی طرف سے بھی اطمینان ہو جائے گا اور مخالفوں کے لیے مرہٹوں سے فوجی امداد بھی حاصل ہو گی۔ محمد انور خاں برہانپوری نے بھی جس پر حسین علی خاں کو کافی اعتماد تھا اس رائے کی تائید کی اور بعض دوسرے امراء بھی اس کے ہم نوا ہو گئے، حسین علی خاں اس پر راضی ہو گیا اور اس نے خود شنکراجی کو اپنا سفیر بنا کر ستارا بھیجا تاکہ وہ اس کی طرف سے مرہٹوں کے ساتھ صلح اور اتحاد کی گفت و شنید کرے۔ چنانچہ یہ گرگ باراں دیدہ ستارا گیا اور وہاں ساہو کے چالاک وزیر بالاجی وشوا ناتھ کے ساتھ مل کر اس نے ۱۱۳۰ھ ۱۷۱۸ء میں ایک معاہدہ طے کیا جس کی دفعات حسب ذیل تھیں۔

معاہدہ کی تفصیلات

(۱) ساہو کو دکن کے چھ صوبوں میں جن کے اندر کرناٹک، بیجاپور اور کرناٹک حیدرآباد کی فوجداریاں، اور میسور، ترچناپلی اور تنجاور کی باجگذار ریاستیں بھی شامل تھیں، تمام محالات خالصہ و جاگیرات کے محصولات سے ۲۵ فیصدی بطریق چوتھ اور دس فی صدی بصیغہ سردیسکھی وصول کرنے کا حق دیا گیا۔

(۲) اسے اختیار دیا گیا کہ ہر محال دپرگنہ، میں اپنا ایک کمائیش دار یا مکاسہ دار[2] چوتھ وصول کرنے کیلیے ایک گماشتہ یا نائب سردیسکھی وصول کرنے کے لیے اور ایک شریک

---

[1] آزاد بلگرامی نے معاہدہ کی تاریخ ۱۱۲۹ھ لکھی ہے۔

[2] یہ مقاطعہ دار کا مرہٹی ملفظ ہے۔

راہداری چنگی کے محال وصول کرنے کے لیے مقرر کرے۔

(۳) صوبہ دار دکن نے اقرار کیا کہ اگر کسی سال میں زمینداروں، مقدموں یا سرکاری حکام کی سرکشی کے باعث ساہو کے گماشتے چوتھ یا سردیسکمی وصول نہ کر سکیں گے تو صوبہ دار کی جانب سے اس کی تحصیل میں اعانت کی جائے گی۔

(۴) ان تمام علاقوں میں جو سیواجی کی وفات کے وقت اس کے قبضہ میں تھے ساہو کو سوراج عطا کیا گیا۔ خاندیس کے کچھ علاقے ترمبک کا قلعہ مع نواحی، اور دریائے ورندھا اور دریائے تنگبھدرا کے جنوب کے علاقے سوراج سے مستثنیٰ کر لیے گئے اور ان کے عوض ٹٹوارا سے مچھندر گڑھ اور پندرپور تک کا علاقہ اس میں شامل کیا گیا اور وہ علاقہ بھی جو ساہو کی شادی کرتے وقت عالمگیر نے اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔

(۵) ساہو کی ماں اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد کو جو اب تک شاہی قید میں تھے رہا کر دینے کا وعدہ کیا گیا۔

ان رعایات کے معاوضہ میں ساہو نے حسب ذیل باتوں کا وعدہ کیا۔

۶ یہ کہ وہ سوراج کے علاقہ کا پیش کش دس لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرے گا۔

۷ یہ کہ سردیسکمی کے معاوضہ میں وہ صوبجات دکن میں امن قائم کرنے کا ذمہ دار ہوگا اور غارت کو روکنا، بدامنی کرنے والوں کو گرفتار کرنا اور سرقہ اور ڈاکہ کے نقصانات کی تلافی کرنا اس کا فرض ہوگا۔

۸ یہ کہ چوتھ کے عوض وہ شاہی اغراض کے لیے ۱۵ ہزار فوج ہمیشہ مستعد رکھے گا تا کہ صوبہ دار یا فوج دار یا کسی اور شاہی ملازم کے زیر حکم خدمت انجام دے۔

معاہدہ پر تبصرہ

اس معاہدہ کی رو سے فریقین کی سیاسی پوزیشن پر جو اثر پڑا اس کی توضیح کے لیے ضروری ہے کہ یہاں اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

اولاً اس معاہدہ نے اس ناتمام غلطی کی تکمیل کردی جو بہادر شاہ کے عہد میں ذوالفقار خاں نے کی تھی اور جس کا ارتکاب بے ضابطہ طریقہ سے داؤد خاں اپنی نائب صوبہ داری کے زمانہ میں کرتا رہا تھا۔ اب تک مرہٹے چوتھ اور سردیسکھی وصول کرنے کے لیے جتنی بھی غارت گری کرتے تھے اس کی حیثیت محض لوٹ مار کی تھی کیونکہ ان کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا مگر اب خود شاہی حکومت کی طرف سے ان کا یہ حق تسلیم کیا گیا اور ان کی غارت گری نے قانون کی حیثیت اختیار کرلی۔

ثانیاً اس سے مرہٹوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ مزید غارتگری کرنے سے مالوہ، گجرات اور دوسرے شاہی صوبوں میں بھی چوتھ وصول کرنے کا حق حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ چند سال بعد انہی ترکیبوں سے یہ حق بھی انہیں حاصل ہوگیا۔

ثالثاً، اس معاہدہ کی رو سے ہر ہر پرگنہ میں شاہی عاملوں کے ساتھ تین تین مرہٹہ تحصیل دار اپنے سواروں اور سپاہیوں سمیت متعین ہوگئے۔ ان کی کچہریاں قائم ہوئیں جگہ جگہ چنگی کے ناکوں پر شاہی چبوتروں کے ساتھ ان کے چبوترے بنے طومارِ واصلات پر شاہی عمال کے ساتھ ان کے بھی دستخط ہونے لگے اور ہر صوبہ میں شاہی صوبہ دار کے برابر مرہٹہ راجہ کی طرف سے بھی ایک صوبہ دار مقرر ہوگیا۔ اس دوعملی سے رعایا سخت تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہوگئی۔ حکومت کے انتظام میں عام برہمی پھیل گئی اور سب

سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ حکومت میں مرہٹہ راجہ مغل بادشاہ کے ساتھ برابر کا شریک بن گیا۔

رابعاً اس معاہدہ سے مرہٹوں کی مالی حالت بہت مضبوط ہو گئی۔ دکن کے چھ عظیم الشان صوبوں کی آمدنی میں سے ان کو ۳۵ فیصد حصہ مل گیا بغیر اس کے کہ حکومت کے مصارف کا کوئی حصہ ان کے ذمہ عائد کیا جاتا۔ اس سے ان کو جو فائدہ حاصل ہوا اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا ہے۔ مرہٹوں کے سرکاری رجسٹروں کے مطابق اس زمانہ میں دکن کے صوبوں کی جو آمدنی گرانٹ ڈف[1] نے بیان کی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

صوبہ اورنگ آباد	۱،۲۳،۷۶،۰۴۲
" برار	۱،۱۵،۲۳،۵۰۸
" بیدر	۷۴،۹۱،۸۷۹
" بیجاپور	۷،۸۵،۰۸،۵۶۰
" حیدر آباد	۶،۴۸،۶۷،۴۸۳
" خاندیس	۵۷،۴۹،۹۱۸
کل :-	۱۸،۰۵،۱۷،۲۹۱

اس آمدنی میں سے جملہ مصارف وغیرہ منہا کرنے کے بعد خالص ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ مرہٹوں کے حصہ میں آیا اور اس کے موازی ان پر کوئی ایسا نیا خرچ عائد نہیں ہوا۔

---

[1] یہاں گرانٹ ڈف کے بیان کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ وہ مرہٹہ ماخذ پر مبنی ہے اور ظاہر ہے کہ چوتھ اور سردیس مکھی کی تشخیص اسی آمدنی پر ہوئی ہوگی۔

جو وہ اس سے قبل برداشت نہ کرتے ہوں۔ بلکہ ان کے سابق خرچ میں اور کمی ہو گئی۔ چونکہ وصول کرنے والا عملہ پہلے بھی موجود تھا اور اب وہ موجود رہا۔ اس عملہ کو مدد دینے کے لیے جو غارت گرد ستے متعین کیے جاتے تھے۔ ان کی اب ضرورت نہ رہی کیونکہ تحصیل میں مدد دینے کی ذمہ داری صوبہ دار نے اپنے سر لے لی۔ دکن کے صوبوں میں امن قائم کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے معنی اس سے زیادہ کچھ نہ تھے کہ خود مرہٹے اپنے غارت گر دستوں کو ہٹا لیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے ہٹا لیا۔ رہی وہ ۱۵ ہزار فوج جو شاہی خدمت کے لیے رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا، سو اس کے لیے بھی انہیں کوئی علیحدہ بھرتی کرنی نہیں پڑی بلکہ جو فوج ان کے پاس موجود تھی وہی بوقت ضرورت انہوں نے بھیج دی۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاہدہ میں اس امر کی بھی تصریح کر دی گئی تھی کہ جب اس فوج سے خدمت لی جائے گی تو اس کا خرچ شاہی حکومت کے ذمہ ہو گا۔ اس طرح بغیر کسی خرچ کے یا (اگر کچھ خرچ تھا بھی تو) بہت تھوڑے خرچ پر مرہٹہ راجہ کی آمدنی میں ۲ کروڑ روپیہ سے زیادہ کا اضافہ ہو گیا۔ جو لوگ پیٹ بھرنے کے لیے لوٹ مار کرنے پر مجبور تھے۔ وہ دفعتہً اتنے مالدار ہوئے کہ ان کی حویلیاں مغل امراء کے محلات کی ہمسری کرنے لگیں اور انہوں نے بہت قلیل عرصہ میں کثیر التعداد فوج اور سامان حرب بہم پہنچا کر اپنے اندر سلطنتِ مغلیہ کو الٹ دینے کی قوت بہم پہنچا لی۔

خامساً، دکن کے صوبوں کی آمدنی میں خود بادشاہ کا حصہ مرہٹہ راجہ سے کم رہ گیا کیونکہ بقیہ ۶۵ فیصد میں سے ۲۵ فی صدی نظم و نسق کے مصارف کے لیے فوجدار کے سپرد کر دیا جاتا اور باقی ماندہ ۴۰ فیصدی کا ایک بڑا حصہ ان جاگیرداروں کے حصہ میں آتا جو شاہی خدمت کے لیے فوجیں رکھتے تھے[1]

---

[1] لچھمی نرائن نے حقیقتہائے ہندوستان میں محمد شاہ کے عہد کا جو حساب آمد و خرچ دیا ہے اس سے

ساد ستا، مرہٹوں کو ایک وسیع رقبہ میں سوراج مل گیا جو مہاراشٹر کے حسب ذیل ۱۶ اضلاع پر مشتمل تھا۔ (۱) پونا (۲)، سوپہ (۳)، اندر پور (۴)، وائی (۵)، ماول (۶)، ستارا (۷)، کراڑ (۸)، کٹھو (۹)، مان (۱۰)، پھولٹن (۱۱)، ملکاپور (۱۲)، تارلہ (۱۳)، پنہلہ (۱۴)، ازیرہ (۱۵)، جُنیر اور (۱۶) کولھاپور۔ اس کے علاوہ تنگبھدرا کے شمال میں کُپل، گدک، ہلیل وغیرہ اور کوکن کے ساحلی علاقہ میں جیول، دابل، راجپوری وغیرہ بھی مرہٹہ سوراج میں شامل کیے گئے۔ اس طرح شاہی حکومت نے پہلی مرتبہ دکن کے شمالی مغربی علاقہ پر مرہٹوں کا قبضہ

؎ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دکن کی آمدنی اس تناسب سے صرف ہوتی تھی:۔

آمدنی:۔ ۱۷۹۸۰۱۲۹۳

خرچ:۔

منہائی بابت اسلام گڈھ (دیوگڈھ)،	۱۱۳۳۲۸۳
منہائی بابت تصرف مرہٹہ	۱۷۵۰۰۰۰
منہائی بابت جاگیر زمینداران وغیرہ	۱۱۰۲۵۶۵۸
غیر وصول شدہ رقمیں	۲۵۲۷۲۴۶۰
تتمہ سہ بندی	۹۹۸۶۹۵۰۲
جملہ	۱۵۴۸۰۰۹۰۰
باقی	۲۵۰۰۰۳۶۰

اس ڈھائی کروڑ کی بچت میں سے ایک کروڑ روپیہ خزانۂ شاہی میں داخل ہوتا تھا اور ڈیڑھ کروڑ روپیہ مرہٹوں کے حصہ میں آتا تھا۔

تسلیم کر لیا گیا اور بیجا پور اور اورنگ آباد کے صوبوں کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ کے لیے مغل حکومت سے الگ ہو گیا۔ لچھمی نرائن شفیق کے بیان کے مطابق اس زمانہ میں مرہٹوں کی اس آزاد ریاست کی آمدنی پونے دو کروڑ روپیہ تھی۔

یہ تو فوائد تھے جو اس معاہدہ سے مرہٹوں کو حاصل ہوئے۔ اب ان فوائد پر بھی نظر ڈالیے جو بظاہر شاہی حکومت کے حصہ میں آئے۔

اولاً، عہد کیا گیا تھا کہ سوراج کے علاقہ کا پیش کش دس لاکھ سالانہ ادا کیا جائیگا مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس کے وصول ہونے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔

ثانیاً، امن قائم کرنے اور غارت گری کو روکنے کے متعلق جو دفعہ تھی اس کا مقصود اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ مرہٹے آئندہ غارت گری نہ کریں گے کیونکہ اب جنہوں نے قیام امن کا ذمہ لیا تھا، وہی دراصل بدامنی پھیلانے والے تھے اور ان کا یہ کہنا تھا کہ اب ہم بدامنی کو روکیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا تھا کہ اب ہم بدامنی نہ پھیلائیں گے۔ اس دفعہ کی رو سے گویا شاہی حکومت نے تسلیم کر لیا کہ دکن میں اس کے مقبوضات کا امن مرہٹوں کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔

ثالثاً، ۱۵ ہزار فوج شاہی خدمت کے لیے مستعد رکھنے کی دفعہ دراصل اس غرض کے لیے نہیں تھی کہ وہ شاہی اغراض کے لیے مفید ہو بلکہ یہ صرف حسین علی خاں نے اپنے فائدہ کے لیے رکھی تھی تاکہ جب وہ بادشاہ کے مقابلہ کے لیے دہلی جائے تو مرہٹے اس کو فوجی امداد دیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ حسین علی خاں کے ساتھ جانے کے بعد پھر دکن کے صوبہ دار یا کسی علاقہ کے فوج دار کو مرہٹوں سے کوئی خاص فوجی امداد نہیں ملی۔

شاہی اجازت کے بغیر معاہدہ کی توثیق

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ معاہدہ از الف تا یا مرہٹوں کے مفید مطلب تھا اور اس میں شاہی حکومت کے لیے بجز نقصان کے اور کچھ نہ تھا مگر حسین علی خاں نے محض اپنے ذاتی نفع، اور نفع بھی حقیر نفع کی خاطر اسے منظور کر لیا اور شاہی سند و اجازت کے بغیر اس کی توثیق کر کے ساہو کے گماشتوں کو تحصیل چوتھ و سردیسمکھی و راہ داری کے لیے تمام محالات میں دخل دے دیا۔ بعد میں بادشاہ کو اس کارروائی کی اطلاع پہنچی اور اس نے ایسے نقصان دہ معاہدہ کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا لیکن بادشاہ کی رضا و عدم رضا حسین علی خاں کے نزدیک کوئی چیز نہ تھی۔

اب وہ زمانہ آتا ہے جبکہ دہلی سے بادشاہ اور عبداللہ خاں کے اختلافات کی پیہم خبریں حسین علی خاں کو پہنچتی ہیں اور وہ اورنگ آباد سے دہلی واپس جاتا ہے۔ لہذا اب سلسلہ کو قائم کرنے کے لیے ہمیں اس وقت سے دارالسلطنت کے معاملات کو بیان کرنا چاہیے جب حسین علی خاں نے دہلی چھوڑی تھی۔

نظام الملک فوجداری مراد آباد پر

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حسین علی خاں نے دکن جانے سے قبل میر جملہ کو پٹنہ کی جانب رخصت کرا دیا تھا۔ اور اس کے چلے جانے سے ان سازشوں کا سب سے بڑا رکن ساقط ہو گیا تھا جو محلسرائے شاہی میں دونوں سیدوں کے خلاف ہوتی تھیں۔ حسین علی کی روانگی کے تین مہینہ بعد جمادی الآخر ۱۱۲۷ھ جون ۱۷۱۵ء میں نظام الملک دہلی پہنچے، اب تک دونوں سیدوں سے نظام الملک کے تعلقات نہایت شگفتہ تھے حتی کہ وہ دونوں نظام الملک کو اپنا بڑا بھائی کہتے تھے لیکن اب جو سیدوں نے سلطنت

میں من مانی کارروائیاں کرنی شروع کیں اور نظام الملک کو بلا وجہ دکن سے معزول کر کے ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا گیا تو وہ ان سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور اس کبیدگی کا پہلا اظہار اس طرح ہوا کہ دکن سے آتے وقت وہ حسین علی کے قریب چند میل کے فاصلہ سے گذرے اور قصداً اس سے ملنے نہیں گئے۔ حسین علی خاں نے اس کو اپنی توہین قرار دیا کیونکہ وہ میر بخشی تھا اور مرتبہ میں ان سے زیادہ تھا مگر عبداللہ خاں صرف اتنی سی بات پر نظام الملک جیسے شخص سے لگاڑنا نہ چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے دہلی سے باہر بارہ پلہ تک نکل کر ان کا استقبال کیا اور مبالغہ کے ساتھ عذر و معذرت کرتے ہوئے کہا کہ تمام وزارت از شما است تا بصوبہ دار یہا چہ رسد۔ محض برای رفع مجبلہ ہارفتن امیر الامرا ضرور شد۔ حالا ہر صوبہ بخواہند حاضر است"۔ ان چکنی چپڑی باتوں کی تہ میں جو کچھ پنہاں تھا وہ نظام الملک کی نظر سے مخفی نہ تھا۔ انہوں نے عبداللہ خاں کا پیش کیا ہوا کوئی عہدہ قبول نہ کیا اور پھر وہی گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا جو بہادر شاہ اور جہاندار شاہ کے زمانہ میں انہوں نے اختیار کیا تھا۔ بادشاہ کے لیے اس سے بہتر کوئی موقع نہ ہو سکتا تھا کہ وہ نظام جیسے طاقتور اور باتدبیر امیر کو اپنے مشیروں میں شامل کرتا اور انہیں اس جماعت کا لیڈر بناتا جو دونوں سیدوں کے اقتدار کو الٹ دینے کے لیے جد و جہد کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں کہ ایک بھائی ہزار میل دور دکن میں بیٹھا تھا اور دوسرا بھائی تمام امور سلطنت رتن چند کے ہاتھ میں چھوڑ کر غرقِ عیش و نشاط تھا، اگر بادشاہ اپنے معاملات نظام الملک کے سپرد کر دیتا تو وہ بڑی آسانی سے دونوں سیدوں کی مطلق العنان کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ فوجی قابلیت میں وہ ان دونوں سے کم نہ تھے۔ سیاسی قابلیت میں

ان کو ان سے کوئی نسبت نہ تھی، اور ان کی حمایت پر اگر سادات بارھہ تھے، تو ان کی حمایت پر پوری مغل اور شاہی پارٹی تھی لیکن بادشاہ میں خود سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت نہ تھی اور اس کے گرد ایسے لوگ جمع تھے جو بجا طور پر یہ اندیشہ رکھتے تھے کہ بادشاہ پر کسی لائق شخص کے حاوی ہو جانے کے بعد محلسرا کی سیاست میں خود ان کے لیے کوئی مرتبہ و مقام حاوی نہ رہے گا۔ یہ لوگ عموماً ادنیٰ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ذہنیت، خیالات، بات چیت، طور طریقے، آداب معاشرت غرض ہر چیز میں اس قدر دنائت تھی کہ عالمگیر کے تربیت کردہ نظام الملک کے لیے ان کے ساتھ نباہ کرنا ناممکن تھا۔ اس وجہ سے دو سال تک وہ سیاسی معاملات سے بالکل بے تعلق رہے، اور جمادی الاولیٰ ۱۱۲۹ھ/ اپریل ۱۷۱۷ء میں جب بادشاہ نے ان کو مراد آباد کی فوجداری[۱] پر مقرر کیا تو انہوں نے اپنی جانب سے کسی نائب کو بھیجنے کے بجائے خود وہاں جانے کو ترجیح دی کیونکہ وہ اس سازشوں کے گھر سے دور ہی رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

فرخ سیر اور سید عبداللہ خاں کے اختلافات

دو سال تک فرخ سیر اپنے ان مشیروں کے اشاروں پر چلتا رہا اور اس زمانہ میں سید عبداللہ خاں سے حسب معمول کشمکش جاری رہی۔ اس پوری مدت میں اس سے اگر کوئی عقلمندی کا کام سرزد ہوا تو وہ یہ تھا کہ اس نے عنایت اللہ خاں

۱؎ منسارام لکھتا ہے کہ نظام الملک کی فوجداری میں سنبھل مراد آباد کے علاوہ بعض اور علاقے بھی شامل کیے گئے تھے جو پہلے اس فوجداری کے ماتحت نہ تھے۔

کشمیری[1] کو جو عالمگیر کے عہد میں دیوانِ خالصہ تھا، پھر بلا کر دیوانِ خالصہ اور دیوانِ تن مقرر کر دیا (۱۱۲۹ھ / ۱۷۱۷ء) لیکن رتن چند اور عبداللہ خاں نے اس کی سخت مخالفت کی اور یہ بادشاہ اور وزیر کے درمیان اختلاف کا ایک اور وسیلہ بن گیا۔ عبداللہ خاں تین تین چار چار مہینہ دفترِ وزارت کی صورت تک نہ دیکھتا تھا۔ عنایت اللہ نے اس پر اعتراض کیا۔ عنایت اللہ نے غیر مسلموں پر پھر جزیہ عائد کر دیا۔ اس پر رتن چند نے اعتراض کیا۔ عنایت اللہ نے جاگیرات کی جانچ کی تو معلوم ہوا کہ بکثرت لوگوں نے رشوتوں اور جعلسازیوں کے ذریعہ سے اعلیٰ اعلیٰ درجہ کی زمینیں بلا کسی استحقاق کے جاگیر کے طور پر حاصل کر لی ہیں۔ اس نے چاہا کہ ایسی تمام جاگیروں کی سندیں منسوخ کر دی جائیں اور آئندہ کے لیے اس کی روک تھام کی جائے مگر رتن چند نے اس کی مخالفت کی کیونکہ یہی اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اراضی کے بندوبست پر عنایت اللہ نے نظر ڈالی تو دیکھا کہ رتن چند اَمانی کا طریقہ[2] موقوف کر کے اجارہ کے طریق کو رائج کر رہا ہے اجارہ میں اس کا یہ فائدہ تھا کہ جو مستاجر زیادہ سے زیادہ رقم پیش کرتا تھا وہ اس کو اجارہ دے دیتا تھا مگر حکومت کا یہ نقصان تھا کہ مستاجر اپنی پیش کردہ رقم سے کئی گنی زیادہ رقم رعایا سے وصول کرتا تھا اور اس سے رعایا مفلس ہوتے ہوتے حکومت کو مالگذاری ادا کرنے کے قابل نہ رہتی تھی۔ اس طرح حکومت کی آمدنی روز بروز گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ عنایت اللہ نے اس

---

[1] یہ وہی عنایت اللہ خاں ہے جس کا بیٹا ہدایت اللہ خاں بہادر شاہ کے عہد میں وزارت خاں کے خطاب کے ساتھ نائب وزیر مقرر ہوا تھا۔

[2] تنخواہ دار ملازموں کے ذریعہ سے براہ راست انتظام کرنے کا طریقہ۔

طریقہ کی اصلاح کرنی چاہی اور رتن چند نے اس کی بھی مخالفت کی۔ عنایت اللہ نے رتن چند کے متوسلین سے حساب فہمی کی تو ان کے ذمہ حکومت کی بڑی بڑی رقمیں واجب الادا نکلیں مگر جب یہ رقمیں ان سے وصول کرنے کی کوشش کی گئی تو رتن چند نے ان کی حمایت کی اور شاہی احکام تک کو ٹھکرا دیا۔ ان معاملات میں بنائے مخاصمت زیادہ تر رتن چند کی ذات اور اس کی اغراض تھیں لیکن عبداللہ خاں اس کی حمایت کرتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے اور بادشاہ کے درمیان عداوت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

محمد مراد کشمیری کا ظہور اور اس کی سازشیں

اس زمانہ میں بادشاہ کو خوف پیدا ہوا کہ ان اختلافات کی خبر سن کر کہیں حسین علی خاں دکن سے نہ آجائے۔ اس لیے اس نے محمد امین خاں چین بہادر کو مالوہ کی صوبہ داری پر مقرر کیا تاکہ وہ حسین علی خاں کا راستہ روک دے۔ مگر محمد امین خاں نے اپنے مستقر کی جانب روانہ ہونے میں بہت تساہل کیا اور جتنا وہ تساہل کرتا گیا اتنی ہی بادشاہ کی بے چینی بڑھتی گئی۔ ایک کشمیری الاصل محمد مراد نامی نے جو میر توزک سوم کے عہدے پر تھا محمد امین خاں کو کوچ کرنے پر راضی کر دینے کا ذمہ لیا اور وہ اپنی ایک چال سے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ فرخ سیر کی چھوٹی سی نظر میں یہ کام اتنا بڑا تھا کہ اسی روز سے اس نے محمد مراد کو اپنا مشیر خاص اور ہمدم و ہمراز بنا لیا اور وہ جگہ جو میر جملہ کے جانے سے خالی ہو گئی تھی اس طرح پر ہو گئی۔ یہ ایک ۶۲ برس کا بڈھا علت المشائخ میں بدنام، اور اپنے برے افعال کے لیے مشہور انام تھا۔ قابلیت بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ باتیں بنانی خوب جانتا تھا اور سبز باغ دکھانے کے فن میں طاق تھا۔ اس کے سوا کوئی علمی قابلیت اسمیں نہ تھی۔ عالمگیر کے زمانہ

ؔ ابوالفیض نے اس شخص کی سیرت اس طرح بیان کی ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں اسے منصب پانصدی حاصل تھا۔ بہادر شاہ کے عہد میں ہزاری ہو گیا اور وکالت خاں کا خطاب ملا۔ جہاندار شاہ کے زمانہ میں اس نے کوکلتاش خاں (علی مراد) کی مصاحبت اختیار کی اور پنج ہزاری منصب تک ترقی کر گیا۔ جب فرخ سیر آگرہ کی فتح کے بعد دہلی پہنچا تو اس کا نام ان لوگوں کی فہرست میں تھا جو گردن زدنی قرار دیئے گئے تھے مگر سید عبداللہ خاں اور حسین علی خاں سے اس کی پرانی ملاقات تھی۔ ان کی سفارش پر اسے معاف کر دیا گیا اور دو ہزاری منصب پر بحال کیا گیا۔ بعد میں حسین علی خان کی مہربانی سے محمد مراد خاں کا خطاب، دو ہزار و پانصدی منصب اور میر توزک سوم کا عہدہ پایا اس لحاظ سے اس کی زندگی اور اس کی ترقی سب دونوں سیدوں کے احسان کا نتیجہ تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ کے پاس تقریب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ان دونوں کی مخالفت ہے تو اس نے ان کے احسانات کو یک قلم فراموش کر دیا اور اپنی پوری قوت ان کی برائیاں کرنے، ان کے استیصال کے لیے نئی نئی تدبیریں سجھانے اور ان کے خلاف سازشیں کرنے میں صرف کر دیں۔ اس نے رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل سے صمصام الدولہ خاں دوراں (خواجہ عاصم)، کے اثر کو بھی دور کر دیا اور اس کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ خاں دوراں پوشیدہ طور پر سیدوں سے ملا ہوا ہے اور اسی وجہ

محمد مرادِ کہ آں ناتمام — بُد از علتِ اُبنہ رسوائے عام

شدہ رہبرِ آں شہ بے خبر — با غوای او دار دایں شور و شر

ایک اور جگہ لکھتا ہے :۔

کہ بودہ است کشمیر اندر نژاد — اگرچہ بمرداں بدادے مراد

سے ان کے مقابلہ میں کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان تدبیروں سے وہ بادشاہ پر اتنا حاوی ہو گیا کہ وہ اسے اپنا سب سے بڑا دوست اور اپنی سلطنت کا سب سے زیادہ قابل آدمی سمجھنے لگا۔ اسے رکن الدولہ اعتقاد خاں بہادر فرخ شاہی کا خطاب، ہفت ہزاری دہ ہزار سوار منصب، داروغگی ہرکارہ[1]، داروغگی خواص اور داروغگی گرز برداراں کا عہدہ دیا اور گجرات دہلی اور آگرہ کے صوبوں میں جو بہترین زمینیں تھیں وہ اسے جاگیر میں عطا کیں۔ مگر محمد مراد نرا باتوں کا آدمی تھا۔ سیدوں سے علانیہ مقابلہ کرنے کی نہ اس میں جرأت تھی نہ قابلیت۔ اس لیے اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ سربلند خاں صوبہ دار بہار کو بلا کر اس کی قوت سے ان دونوں کا استیصال کرے۔ چنانچہ وہ حسب طلب شعبان ۱۱۳۰ھ جولائی ۱۷۱۸ء میں دہلی پہنچا۔ محمد مراد نے اسے منصب ہفت ہزاری شش ہزار سوار اور خطاب مبارز الملک سربلند خاں نامور جنگ دلوایا۔ اور امید دلائی کہ اگر اس نے دونوں سیدوں کا استیصال کر دیا تو اسے وزارت دی جائے گی۔ لیکن دوسرے ذرائع سے اس کو معلوم ہوا کہ یہ محض دھوکہ ہے اور وزارت کسی اور کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو مہلکہ میں ڈالنے سے پہلے خود بادشاہ سے اس کی تحقیق کرنی

---

[1] سلطنتِ مغلیہ میں داروغہ ہرکارہ کا عہدہ وہی اہمیت رکھتا تھا جو سلطنتِ عباسیہ میں صاحب البرید کو حاصل تھی۔ یہ عہدہ دار براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا۔ سلطنت کے وزیر اعظم کو بھی اس پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ بادشاہ کو ملک رعایا اور اس کے چھوٹے بڑے ملازموں کے تمام حالات سے باخبر رکھے اس کو موجودہ زمانہ کی (Intelligence) کا ہم معنی سمجھنا چاہیے۔

ضروری سمجھی اور ایک روز دریافت کیا کہ دونوں سیدوں کو الگ کرنے کے بعد وہ کس کو وزارت دینا چاہتا ہے؟ بادشاہ نے بے تکلف جواب دیا کہ "میری نگاہ میں اس جگہ کے لیے اعتقاد خاں سے بہتر کوئی اور کوئی آدمی نہیں ہے" اس جواب نے سربلند خاں کی تمام سرگرمیوں کو سردمہری سے بدل دیا، اس نے دونوں سیدوں کی مخالفت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سید عبداللہ خاں نے اس کی مالی امداد کرکے اسے اپنے حامیوں میں شامل کر اس کے بعد اجیت سنگھ راجہ جودھ پور پر نظر ڈالی گئی جو بادشاہ کا خسر بھی تھا۔ اسے لانے کے لیے ایک شخص ناہر خاں کو بھیجا گیا جس کے متعلق یقین کیا جاتا تھا کہ بادشاہ کا ہوا خواہ ہے۔ لیکن ناہر خاں دراصل سیدوں کا دوست تھا۔ وہ اجیت سنگھ کو لایا تو ضرور، مگر بادشاہ کے بجائے سیدوں کا دوست بنا کر۔ اس طرف سے مایوس ہو کر نظام الملک پر نظر ڈالی گئی اور شوال ۱۱۳۰ھ ستمبر ۱۷۱۸ء میں وہ مراد آباد سے طلب کر لیے گئے۔ انہوں نے آکر بادشاہ سے عرض کیا کہ آپ مجھے وزارت پر سرفراز کر دیں اور خرچ سپاہ کے لیے چالیس لاکھ روپیہ نقد دیں۔ پھر عبداللہ خاں سے میں خود سمجھ لوں گا مگر بادشاہ نے ان کی یہ درخواست قبول نہ کی اور ان سے یہ خواہش کی کہ کسی بات کا اظہار کیے بغیر وہ اپنے کسی وفادار آدمی کو بھیج کر سید عبداللہ خاں کو خفیہ طریقہ سے قتل کرا دیں۔ نظام الملک نے ایسے طریقوں سے کام کرنا پسند نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے ان کو فوجداری مراد آباد سے معزول کر دیا اور مراد آباد کو رکن آباد نام دے کر ایک مستقل صوبہ کی حیثیت سے محمد مراد خاں کے حوالہ کر دیا۔ اس طرح نظام الملک بھی بادشاہ کے دوستوں کی فہرست سے خارج ہو گئے۔ اب میر جملہ پر قرعہ فال پڑا اور اسے لاہور سے طلب کیا گیا[1]

---

[1] یہ پٹنہ کی صوبہ داری میں ناکام ہو کر دہلی بھاگ آیا تھا اور بعد میں اس کو پنجاب کی صوبہ داری پر مقرر کر دیا گیا تھا۔

اس پر سید عبداللہ خاں نے دھمکی دی کہ میر جملہ کے بلانے سے وہ معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے جس کی رو سے حسین علی خاں دکن بھیجا گیا تھا۔ فرخ سیر یہ سن کر اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس نے میر جملہ کا فرمانِ طلب منسوخ کر دیا اور اسے راستے سے واپس کر دینے کے لیے قاصد بھیج مگر باوجود اس کے میر جملہ ذی قعدہ ۱۱۳۰ھ ستمبر ۱۷۱۸ء میں دہلی پہنچ گیا اور وہاں یہ دیکھ کر کہ اب وزیر کا پلّہ بادشاہ سے بھاری ہے اس نے سید عبداللہ خاں سے معافی مانگ لی اور اس کے ہوا خواہوں میں داخل ہو گیا۔ فرخ سیر اس غداری پر اتنا غضب ناک ہوا کہ اس نے میر جملہ کے خطابات و مناصب ضبط کر لیے اور اسے عبداللہ خاں کے ہاں سے نکالنے کے لیے آدمی بھیجے۔ یہ گویا وزیر کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس نے بادشاہ کے اس فعل کو اپنی صریح توہین قرار دیا اور اسی دن ۵ ذی القعدہ مطابق ۲۹ ستمبر کو حسین علی خاں کے نام پیغام بھیج دیا کہ وہ فوراً دکن سے آ جائے۔

دکن سے حسین علی خاں کی واپسی

حسین علی خاں جو اس زمانہ میں مرہٹوں سے صلح کر کے دہلی جانے کے لیے مستعد بیٹھا تھا۔ عبداللہ خاں کا پیغام پہنچتے ہی یکم محرم ۱۱۳۱ھ ۲۳ نومبر ۱۷۱۸ء کو اورنگ آباد سے روانہ ہو گیا۔ اس نے دکن میں اپنے بھتیجے اور منہ بولے بیٹے عالم علی خاں کو جو ایک بیس برس کا نوجوان تھا، نائب صوبہ دار کی حیثیت سے اپنے پیچھے چھوڑا۔ اپنے ساتھ ۱۵ ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ فوج لی جس میں ۱۲ ہزار مرہٹے[1] بھی بالاجی وشوا ناتھ اور کھنڈے راؤ

---

[1] اس مرہٹہ فوج کو حسین علی خاں نے نربدا پار کرنے کے بعد سے واپسی تک ۸ روپیہ فی کس کے حساب سے معاوضہ دیا تھا۔

دُبھارے کی سرکردگی میں شامل تھے۔ فرخ سیر کو خوف زدہ کرنے کے لیے اس نے سب سے بڑی چال یہ کھیلی کہ تیموری خاندان کے ایک فرضی شاہزادے کو ساتھ لے لیا تاکہ بوقت ضرورت اسے تخت کا مدعی بنا کر فرخ سیر کے مقابلہ میں استعمال کر سکے۔ یہ دکن کے ایک قاضی کا لڑکا تھا جو اپنی ظاہری وجاہت کے لحاظ سے فی الواقع شاہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ حسین علی خاں نے مشہور کیا کہ یہ عالمگیر کے باغی بیٹے اکبر کا لڑکا معین الدین ہے جسے راجہ ساہو نے اس شرط پر میرے حوالہ کیا ہے کہ میں اس کے معاوضہ میں بادشاہ سے اس کی ماں اور بہن وغیرہ کو رہا کرا دوں۔ اس دعوے کو نباھنے کے لیے حسین علی نے نام نہاد شاہزادے کے لیے خیمہ و خرگاہ، سواری اور علم وغیرہ کا ویسا ہی انتظام کیا جیسا تیموری شاہزادوں کے لیے کیا جاتا تھا اور روزانہ وہ خود اس کے حضور میں جا کر شاہی آداب کے مطابق مجرا بجا لاتا تھا

بادشاہ کی بے کسی اور خوشامد

ان خوفناک اطلاعات سے فرخ سیر کانپ اٹھا اور اس نے ایک شخص اخلاص خاں کو جس سے حسین علی خاں کے گہرے تعلقات تھے روانہ کیا تاکہ وہ اسے ٹھنڈا کر کے دکن واپس کر دے۔ یہ شخص مانڈو کے قریب حسین علی سے ملا اور اس نے بادشاہ کی سفارت کا حق ادا کرنے کے بجائے سپہ سالار کو الٹا یقین دلایا کہ دہلی میں فی الواقع اس کے بھائی کی زندگی خطرے میں ہے اور اس کا وہاں پہنچنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حسین علی خاں نے اپنی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ اُجین میں محمد امین خاں صوبہ دار مالوہ موجود تھا۔ بادشاہ نے اسے احکام بھیجے کہ حسین علی خاں کا راستہ روکے مگر محمد امین خاں نے ان احکام کی تعمیل کے بجائے سیدھا دہلی کا راستہ لیا۔ اس کی اس حرکت

پر بادشاہ نے غضب ناک ہو کر اس کے خطابات و مناصب ضبط کر لیے اور سید عبداللہ خاں نے اس سے فائدہ اٹھا کر محمد امین خاں کو بھی اپنے دوستوں میں شامل کر لیا اس کے ساتھ ہی عبداللہ خاں نے نظام الملک کو بھی دوست بنانے کی کوشش کی کیونکہ آئندہ جو کارروائی یہ دونوں بھائی کرنا چاہتے تھے اس میں اگر انہیں کسی کی مخالفت کا خطرہ تھا تو وہ نظام الملک ہی کی ذات تھی۔ چنانچہ ۱۰ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ، فروری ۱۷۱۹ء کو عبداللہ خاں خود نظام الملک سے ملنے گیا۔ اس کے تین چار دن بعد اپنے ہاں ان کی دعوت کی اور بیش قیمت تحفے دیئے۔ اس کے دوسرے دن اس نے بادشاہ سے ان کے لیے بہار کی صوبہ داری کا فرمان حاصل۔ اس طرح حسین علی خاں کے آنے سے پہلے عبداللہ خاں نے سربلند خاں، اجیت سنگھ، نظام الملک، محمد امین خاں اور دوسرے تمام طاقتور امراء کو فرخ سیر سے الگ کر کے کم از کم اس حد تک اپنا حامی بنا لیا کہ ان لوگوں سے اسے کسی مخالفت کا خطرہ باقی نہ رہا۔ اب امراء میں راجہ جے سنگھ والئی جے پور کے سوا اور کوئی شخص فرخ سیر کا حامی نہ تھا۔

ربیع الاول کے آخر میں حسین علی خاں دہلی کے قریب پہنچ گیا۔ بادشاہ کا یہ حال تھا کہ خوشامد کے مارے ہر ہر منزل پر اسے میوے، پان، عطریات اور خوش آمدید کے پیغام بھیجتا تھا اور حسین علی خاں کی کیفیت یہ تھی کہ علانیہ کہتا تھا کہ میں اب بادشاہ کا ملازم نہیں ہوں۔ حد یہ ہے کہ دہلی کے باہر فیروز شاہ کے کوٹلہ پر جب اس نے پڑاؤ ڈالا تو آداب شاہی کے خلاف اپنے سامنے نوبت بجوائی۔ یہ گویا اس کی جانب سے بغاوت کا کھلا اعلان تھا مگر باوجود اس کے خوفزدہ بادشاہ یہ سمجھتا رہا کہ وہ خوشامد کر کے اس کو راضی کر لے گا چنانچہ اس نے اشتیاق ملاقات ظاہر کر کے

اسے قلعہ میں آنے کی دعوت دی۔ اس نے جواب دیا کہ جب تک قلعہ کی حفاظت، توپخانہ کی دار وغگی اور بادشاہ کی ذاتی خدمات پر میرے آدمی مقرر نہ ہوں گے میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ بے وقوف بادشاہ نے ان باتوں کو بھی قبول کر لیا۔ قلعہ سے صمصام الدولہ پانچ چھ ہزار والا شاہی فوج سمیت رخصت کر دیا گیا۔ حسین علی خاں کے آدمیوں کو قلعہ کے اندر تمام وہ عہدے سپرد کر دیئے گئے جو اس وقت بادشاہ کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھے، اور اس طرح بادشاہ خود بخود اپنے دشمن کی ہاتھ میں قید ہو گیا۔ راجہ جے سنگھ جو اس وقت ۲۰ ہزار فوج لیے ہوئے دہلی کے باہر پڑا تھا آخر وقت تک اس کو روکتا رہا۔ اس نے کہا کہ ہمت کر کے جنگ کا اعلان کر دیجئے۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ پر آنچ نہ آنے دوں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ ایک مرتبہ جب آپ اٹھ کھڑے ہوں گے تو بہت سے امراء جو اس وقت خاموش تماشا دیکھ رہے ہیں آپ کے علَم کے نیچے آ جائیں گے۔ مگر فرخ سیر نے صرف یہی نہیں کہ اس کی بات نہ مانی بلکہ سیدوں کو خوش کرنے کیلئے اسے حکم دیا کہ دہلی سے اپنے وطن آنبیر واپس چلا جائے۔ جب بادشاہ کے پاس اس کے حامیوں میں سے محمد مراد خاں، امتیاز خاں، مشرف دیوان خاص اور ظفر خاں (جو لبعد میں روشن الدولہ اور محمد شاہ کا یار غار ہوا)، کے سوا کوئی باقی نہ رہا تو حسین علی خاں اور عبداللہ خاں اس سے ملنے گئے اور شان یہ تھی کہ دہلی دروازے سے لے کر لال قلعہ کے دروازے تک مرہٹہ سواروں کی صفیں بندھی ہوئی تھیں[1]۔ فرخ سیر نے حسین علی خاں سے پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا کہ "تمہارا قیدی شاہزادہ اکبر کا بیٹا کہاں ہے؟" حسین علیخاں نے جواب دیا کہ وہ میرے ساتھ ہے، مگر مرہٹوں نے یہ عہد لے کر اس کو میرے حوالہ

---

[1] تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مرہٹہ فوجیں مغلوں کے دارالسلطنت میں داخل ہوئیں

کیا ہے کہ میں اسے آپ کے سپرد کرنے سے قبل راجہ ساہو کی ماں اور اس کے بھائی وغیرہ کو رہا کرالوں۔ بادشاہ نے اسی وقت ان قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دیا مگر حسین علیخاں نے فرضی شاہزادے کو اس کے حوالہ نہ کیا۔

شہر میں ہنگامہ اور مرہٹوں کا قتل عام

اس کے بعد ۸ ربیع الثانی، ۲۸ فروری کو عبداللہ خاں اور اجیت سنگھ نے قلعہ میں جاکر پوری طرح اپنا فوجی قبضہ قائم کر لیا، بادشاہ کے تمام حامیوں کو حتیٰ کہ محمد مراد خاں کو بھی نکال باہر کیا۔ اور اسی روز حسین علی خاں اپنی پوری فوج کے ساتھ دہلی میں داخل ہو کر شائستہ خاں کی بارہ دری میں ٹھہرا۔ رات عبداللہ خاں نے قلعہ میں گذاری۔ دوسرے دن شہر میں خبر اڑ گئی کہ عبداللہ خاں قلعہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس پر بادشاہ کے حامیوں نے جن کے سردار محمد مراد خاں، سادات خاں (خسر بادشاہ) اور چند اور لوگ تھے۔ حسین علی خاں کے آدمیوں پر حملہ کر دیا اور اسی دوران میں مرہٹہ سپاہیوں سے مغل سپاہیوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ چند ہی چوٹیں کھانے کے بعد مرہٹے اس قدر بدحواس ہو کر بھاگے کہ انہیں تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ خافی خاں اس موقع پر دہلی میں موجود تھا وہ مرہٹوں کی اس حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے۔

"لچھای بازار و تماشائیاں بیکار و مغلان بے روزگار خبر دار گشتہ تیغہا آختہ از ہر طرف دست و بازو بکشتن و تاراج نمودن آں جماعۂ بدفرجام کشادند و دستار از سر و سر از بدن و نیزہ از دست و شمشیر از کمر می ربودند حتیٰ قصابان و گاذران و خاک روبان و دیگر کاسبانِ بازار بضرب شمشیر و دشنہ، زبان و نگاہِ زہر چشم ہر چہ می توانستند از آں دل باختگانِ تبہ کار

مردم آزاد کشیدہ می گرفتند..... و لبسیارے ازاں مُدبران بے عار سراپا برہنہ و عریاں گشتہ مشت مشت خس و خاشاک بازار و کاہِ نجاست آلودہ خاک در دہاں در دہاں گرفتہ باظہار عجز دامانِ جاں موافق روئیہ دکنیاں در فرار بر یکدیگر سبقت می نمودند..... و از سر رشتۂ چوک سعد اللہ خاں کہ نزدیک دروازۂ قلعہ ارک واقع شدہ تا بنگاہِ آں گروہ کہ از سہ چہار کروہ زیادہ مسافت داشت ہمہ جا ازاں قوم ضال کشتہ و زخمی گشتہ قطار در قطار در رستہ و بازار افتادہ بودند؛

دوسرے مورخین نے بھی قریب قریب ایسا ہی بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔ کہ سینکڑوں ہزاروں مرہٹے ارے باپ! ارے باپ رے! کہتے ہوئے بھاگے جا رہے تھے۔ راستے میں کہیں کوئی دکاندار انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھتا تو یہ اپنی تلوار اور ڈھال پھینک دیتے اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر "نکوانکو!"[1] کہتے ہوئے رحم کی درخواست کرنے لگتے۔ اس دار و گیر میں تقریباً ڈیڑھ دو ہزار مرہٹے مارے گئے جن میں سنتاجی بھونسلے اور دو تین دوسرے نامور سردار بھی تھے اور مرہٹوں کا جس قدر مال لوٹا گیا اس کا کوئی شمار نہیں ہے۔[2]

---

[1] دکھنی زبان میں نکو، نہیں کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

[2] دہلی میں مرہٹوں کی اس طرح گت بننے پر خافی خاں اس طرح اظہار مسرت کرتا ہے
ایں معنی محض از افضال الٰہی روداد والا فرزندان آں مدبران قرنہائی بے شمار سرمایہ لاف و گزاف می نمودند کہ بیائی دہلی رفتیم و بمدد و بازدی مرہٹہ پادشاہ ہند مقید گشتند و دیگرے اسیر بر آرامی در دہلی گردانیم (۲ ۔ ۸۰۹-۱۱)

فرخ سیر کا عزل

مرہٹوں کی اس شکست سے بادشاہ کے حامیوں کی ہمتیں اور بڑھیں اور انہوں نے خاص حسین علی خاں کے مستقر پر حملہ کر دیا۔ حسین علی خاں نے یہ حال دیکھ کر سید عبداللہ خاں کو کہلا بھیجا کہ اب توقف کا موقع نہیں ہے۔ چنانچہ عبداللہ خاں کے حکم سے افغان سپاہی اور چیلے فرخ سیر کو پکڑنے کے لیے محلسرا میں گھس گئے۔ عورتوں کو مار پیٹ کر ان سے اس مقام کا پتہ معلوم کیا جہاں بادشاہ چھپا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے زبردستی کھینچتے ہوئے باہر لائے۔ بادشاہ کی ماں بیوی، بیٹی اور دوسری محل کی بیگمات حائل ہوئیں مگر وحشی سپاہیوں نے انہیں دھکے دے دے کر ہٹا دیا اور بادشاہ کو سخت ذلت کے ساتھ کشاں کشاں سید عبداللہ خاں کے پاس لے گئے جس نے اس کی آنکھوں میں تیل کی سلائی پھیر کر اس کو اندھا کر دیا، اور ترپولیہ کے اوپر ایک تنگ و تاریک حجرے میں قید کرا دیا۔ اس ہنگامہ کے وقت شاہجہان اور عالمگیر کے محلات میں خواتین حرم پر جو کچھ گذری، جس طرح ان کی بے حرمتیاں ہوئیں۔ ان کے زیورات لٹے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اس بات کا تصور کر لینا کافی ہے کہ ان لوگوں کو پہلی مرتبہ اس جگہ بار ملا تھا جہاں اس سے پہلے ان کے تخیل کو بھی رسائی حاصل نہ ہو سکتی تھی اور جہاں کے حسن اور دولت کے فسانے یہ لوگ اور ان کے بڑے، بوڑھے بچپن سے اپنے گہواروں میں سنتے چلے آئے تھے۔ ایک مشہور روایت یہ بھی ہے کہ خود سید عبداللہ خاں نے بھی اس نادر موقع سے فائدہ اٹھا کر حرم شاہی کی دو تین مہجبینوں پر قبضہ کر لیا۔

۶- رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ

بادشاہ وقت کو اس طرح معزول کرنے کے بعد دونوں سیّد سلطنت کے مالک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ تیموری خاندان کا خاتمہ کر کے ہندوستان پر خاندان سادات کی حکومت قائم کر دی جائے اور حالات یقیناً ایسے تھے کہ اس قسم کا خیال دلوں میں آنا غیر فطری نہ تھا۔ لیکن اغلب خیال یہ ہے کہ اس تجویز کو دو وجوہ سے رد کر دینا پڑا ہو گا۔ ایک یہ کہ ملک کے تمام طاقتور سیاسی گروہ، مثلاً تورانی، ایرانی، افغانی اور راجپوت جو تیموری خاندان کی وفاداری پر متفق تھے، سادات کی بادشاہی کو کسی حال میں قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے اور سادات کے پاس ہرگز اتنی قوت نہ تھی کہ وہ ان سب گروہوں کو بجبر اپنی اطاعت پر راضی کر سکتے یا ان کی طاقت کو بزور شمشیر مٹا سکتے۔ دوسرے یہ کہ خود دونوں بھائیوں میں نفسانیت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی اطاعت قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ عباسیوں میں منصور اور سفاح کے درمیان جو اتحاد تھا وہ ان بھائیوں میں نہ تھا۔ یہاں تو اگر ایک اپنی بادشاہی کا اعلان کرتا تو دوسرا غیروں سے پہلے اس کے مقابلہ میں تلوار کھینچ کر کھڑا ہو جاتا۔ ان وجوہ سے سلطنتِ ہند میں ایک نہایت اہم انقلاب ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اب خود تیموری خاندان میں سے ایک شخص کو بادشاہ بنانا ضروری تھا۔ مگر وہ ایسا ہونا چاہئے تھا کہ تخت پر وہ بیٹھے اور حکومت دونوں سید کریں۔ چنانچہ ایسے ایک مورکھ شاہزادے کو لانے کے لئے ایک جماعت محلات میں گھسی اور رفیع الشان بن شاہ عالم بہادر شاہ کے سب سے

چھوٹے بیٹے رفیع الدرجات، کو پکڑ لائی جو ایک ۲۰ برس کا دِق زدہ لڑکا تھا۔ عبداللہ خاں اور اجیت سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسی لباس میں جو وہ پہنے ہوئے تھا اسے تخت طاؤس پر لا بٹھایا۔ ۹ ربیع الآخر ۱۱۳۱ھ اور نقار خانہ شاہی کے شادیانوں نے شہر میں نئے بادشاہ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اس آواز نے فرخ سیر کے حامیوں کی ہمتیں پست کر دیں۔ حسین علی خاں کے مقابلہ میں جو ہنگامہ برپا تھا آن کی آن میں سرد ہو گیا اور گروہ مخالف کے سردار محمد مراد خاں، سادات خان اور دوسرے لوگ گرفتار کر لیے گیے۔

ابوالبرکات سلطان شمس الدین محمد رفیع الدرجات کی تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے جو انتظامات کیے گیے وہ یہ تھے۔

راجہ اجیت سنگھ والی جودھپور، اور راجہ رتن چند دیوان کی درخواست پر جزیہ ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا گیا۔

مختلف جماعتوں کے سرداروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلہ میں محمد امین خاں کو بخشی دوم اور ظفر خاں کو بخشی سوم کا عہدہ دیا گیا۔

نظام الملک صوبہ داری مالوہ پر

نظام الملک کو فرخ سیر کے آخر عہد میں بہار کی صوبہ داری دی گئی تھی مگر وہ اپنے مستقر پر جانے کے بجائے دہلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس زمانہ میں جو کچھ ہو رہا تھا اسے خاموشی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ان کی یہ خاموشی دونوں سیّدوں کیلئے سخت پریشان کن تھی اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے لیے اگر کسی طرف سے خطرہ ہے تو وہ نظام الملک ہی کی ذات ہے۔ حسین علی خاں کی قطعی رائے یہ تھی کہ ان کو

قتل کر دیا جائے۔ مگر سید عبداللہ خاں اس کا مخالف تھا۔ کیونکہ نظام الملک پر ہاتھ ڈالتے ہی تورانی پارٹی کے تمام لیڈر مقابلہ پر کھڑے ہو جاتے اور ایک فتنہ عظیم برپا ہو جاتا۔ آخر یہ رائے قرار پائی کہ ان کو دارالسلطنت سے دور بھیج دیا جائے اور جب وہ اپنے حامیوں سے جدا ہو کر کمزور ہو جائیں تو ان کا استیصال کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کو مالوہ کی صوبہ داری پیش کی گئی جسے انہوں نے بہت انکار و تامل کے بعد قبول کر لیا۔ اور ۴ ربیع الآخر ۱۱۳۱ھ ۱۵ مارچ ۱۷۱۹ء کو دہلی سے روانہ ہو گئے۔ مگر آئندہ جو کچھ ہونے والا تھا۔ اس کا نقشہ انہوں نے اسی وقت اپنے ذہن جما لیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے تمام اہل خاندان اپنے مال و اسباب اور ان سب مغل سرداروں کو جو ان کے خاندان کے متوسل تھے۔ اپنے ساتھ لے گئے اور سید بھائیوں کے اصرار کے باوجود دربار میں اپنی نیابت کے لیے اپنے کسی بیٹے کو نہ چھوڑا۔

مرہٹوں کو چوتھ اور سردیسکھی کی اسناد

راجہ ساہو کے پیشوا بالاجی وشوا ناتھ کو چوتھ اور سردیس مکھی کی باضابطہ سندیں عطا کی گئیں اور اس طرح حسین علی خاں اور ساہو کے اس معاہدہ کی تصدیق بادشاہ کی طرف سے بھی ہو گئی جسے فرخ سیر نے رد کر دیا تھا۔ ان اسناد میں پہلی سند کی تاریخ تحریر ۲ ربیع الآخر ۱۱۳۱ھ ہے اور دوسری کی تاریخ ۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۱ھ

فرخ سیر کا قتل

فرخ سیر ابھی تک زندہ تھا اور اطراف ملک میں اس کے بہت سے حامی موجود تھے جن میں راجہ جے سنگھ سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اس سے سیدوں کو رجعت کا خطرہ ہوا اور انہوں نے ۸-۹ جمادی الاولیٰ کی درمیانی شب میں فرخ سیر کو سخت عذاب

کے ساتھ قتل کرا دیا[1]۔ اس حرکت سے تمام شہر میں ایک طوفان برپا ہو گیا معزول و مقتول بادشاہ کا جنازہ جب قلعہ سے ہمایوں کے مقبرے کی جانب روانہ ہوا تو پندرہ بیس ہزار آدمیوں کا مجمع روتا پیٹتا ساتھ ہو گیا۔ دہلی دروازے تک سڑک، گلی کوچوں اور دو رویہ عمارتوں پر لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے جن کی آہ و فغاں سے ہنگامۂ محشر بپا ہو گیا۔ جنازے کے ساتھ حفاظت کے لیے سیدوں نے ایک فوجی دستہ کر دیا تھا جس کے سر کردہ دلاور علیخاں اور سید علی خاں (دونوں سیدوں کی فوج کے بخشی) تھے۔ غضب ناک مجمع نے ان لوگوں پر اینٹ پتھر برسائے اور ہر طرف سے لعنت ملامت کی بوچھاڑ کر دی۔ فقیروں کو خیرات کے طور پر پیسے اور روٹیاں دی گئیں تو انھوں نے نفرت کے ساتھ انہیں پھینک دیا اور بھک منگوں نے اس کے بعد بھی ایک مدت تک ان امراء کی خیرات قبول نہیں کی جو فرخ سیر کے قتل میں شریک تھے۔ یہی نہیں بلکہ جب کبھی یہ امرا بازاروں سے گذرتے تھے تو عوام ان کو برملا گالیاں دیتے اور ان کے پیچھے آوازے کستے ہوئے دوڑتے تھے۔ خاص کر مہاراجہ اجیت سنگھ کے خلاف دکیونکہ وہ فرخ سیر کا خسر تھا، اس نفرت کا اظہار اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا تھا حتیٰ کہ اس نے شرم کے مارے عام شاہراہوں سے گذرنا چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ گجرات کی صوبہ داری پر جانے کے لیے شہر سے گذرا تو لوگوں نے اس پر گالیوں کی اتنی بوچھاڑ کی کہ وہ کھسیانا ہو گیا اور اس نے دو تین آدمیوں کو پکڑ کر قتل کرا دیا۔ یہ تو خیر عوام تھے خواص کا بھی یہ حال تھا کہ ایک قلیل جماعت کے سوا جن کا بیشتر حصہ شیعہ تھا، اہل الرائے لوگوں

---

[1] قتل کے وقت فرخ سیر کی عمر ۳۶ یا ۳۵ سال کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ حسین اور تنومند شخص تھا۔

نے اس فعل کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اس کا ارتکاب کرنے والوں پر ملامت کی۔ بیدلؔ جیسے سنجیدہ اور گوشہ نشین شخص کی اس معاملہ میں جو رائے تھی وہ اس نے اپنی اس رباعی میں ظاہر کی ہے۔

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند صدرجور وجفا زراہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد جستم فرمود سادات بوے نمک حرامی کردند

رائے عام کا یہ ہیجان جو بادشاہ اور شاہی خاندان کی اس طرح تذلیل و توہین ہوتے دیکھ کر فطری طور پر امنڈ آیا تھا۔ اس بنا پر اور بڑھ گیا کہ دونوں سیدوں نے فرخ سیر کو معزول کر کے جس بادشاہ کو تخت پر بٹھایا وہ برائے نام بادشاہ تھا اور سیدوں کا یہ ارادہ صریح ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ تیموری خاندان کی بادشاہی کا خاتمہ کر کے خود مالک الملک بننا چاہتے ہیں۔ انہوں نے نئے بادشاہ کو بالکل اپنے قیدی کی حیثیت سے رکھ چھوڑا تھا۔ قلعہ کے دروازے سے لے کر محلات تک ہر جگہ سیدوں کے آدمی متعین تھے۔ ایک شخص ہمت خاں بادشاہ کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا جس کی اجازت کے بغیر بادشاہ کھانا تک نہیں کھا سکتا تھا۔ محلسرا سے باہر نکلنے کا تو اس کو موقع ہی نہ دیا جاتا تھا۔ اس قید سے زیادہ ذلت کا برتاؤ تھا جو دونوں سید اس بادشاہ کے ساتھ کرتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب عورتوں کے شوقین تھے۔ انہوں نے خاص بادشاہ بیگم (عنایت بانو) کو محبت کا پیغام بھیجا۔ چھوٹے بھائی کو کبریائی کا شوق تھا۔ وہ ایک مرتبہ تسبیح خانہ میں بادشاہ کے برابر جا بیٹھے۔ تکبر کے جوش میں کبھی کبھی یہ صاحب یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ جس کے سر پر ہم اپنی جوتی رکھ دیں گے وہ عالمگیر بادشاہ کا جانشین

ہو جائے گا۔ لوگ ان واقعات کو سنتے تھے اور غم وغصہ سے بیتاب ہو جاتے تھے۔ ۱۲ برس قبل عالمگیر کے عہد میں جن آنکھوں نے مقام شاہی کی حرمت وعزت کے وہ سماں دیکھے تھے ان کو یہ مناظر اگر کانٹوں کی طرح نہ کھٹکتے تو اور کیا ہوتا۔

آگرہ میں نیکوسیر کا دعویٰ بادشاہی

ان حالات میں سیدوں کی طاقت کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں جو آخرکار ان کے لیے مہلک ثابت ہوئیں۔ اس سلسلہ کی پہلی سازش وہ تھی جو آگرہ میں ہوئی۔ قلعہ آگرہ میں تیموری خاندان کے متعدد شاہزادے قید تھے جن میں سے ایک عالمگیر کے باغی شاہزادے اکبر کا بڑا بیٹا نیکوسیر بھی تھا۔ گو اب اس کی عمر ۴۲ سال کی تھی مگر تین سال کی عمر سے یہ قلعہ میں مقید تھا۔ اور اس دوران میں کبھی اس کو باہر کی دنیا دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس کی ناواقفیت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اس نے ایک گائے کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا کہ یہ کیا جانور ہے اور اس کو کیا کہتے ہیں۔ اس طفل کہن سال کی خدمت میں ایک چالاک برہمن متر سین نامی شخص متعین تھا جس نے اپنے سودی کاروبار اور کچھ اپنی طبی واقفیت کی بنا پر قلعہ آگرہ کے فوجی افسروں اور سپاہیوں میں رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ جب فرخ سیر کے عزل اور قتل سے ملک میں عام طور پر دونوں سیدوں کے خلاف ناراضی کے جذبات مشتعل ہو گئے تو اس نے خیال کیا کہ اگر میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نیکوسیرؔ کو بادشاہ بنا دوں تو ملک کی رائے عام اور سیدوں کے مخالف امرا کی ایک طاقتور جماعت میرا ساتھ دے گی۔ بادشاہ میری مٹھی میں رہیگا اور میں سبھا چند اور رتن چند سے بھی بڑھ جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے قلعہ کی فوج کے ہزاریوں اور بکسریوں کو ہموار کر کے ۹ جمادی الآخریٰ ۱۱۳۱ھ ۸ مئی ۱۷۱۹ء کو نیکوسیر کی بادشاہی

کا اعلان کر دیا۔ خود ہفت ہزاری منصب اور راجہ بیربل کا خطاب حاصل کر کے اس کا وزیر بنا۔ ایک کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ قدیم شاہی خزانہ سے نکال کر فوج میں تقسیم کیا۔ فرخ سیر کے حامی امراء مثلاً نظام الملک صوبہ دار مالوہ، راجہ جے سنگھ والی آنبیر اور راجہ چھبیلہ رام ناگر صوبہ دار الہ آباد کو نیئے بادشاہ کی حمایت میں آنے کی دعوت دی اور سیدوں کے بھیجے ہوئے نئے صوبہ دار سید عزت خاں کو قلعہ کا قبضہ دینے سے انکار کر دیا۔

نیکوسیر کی دعوت رد کی جاتی ہے

مگر مترسین نے جو کچھ سوچا تھا اس میں وہ ناکام رہا۔ بغاوت قلعہ آگرہ کے حدود سے باہر نہ بڑھ سکی۔ راجہ جے سنگھ امداد کے لیے ضرور آمادہ ہوا لیکن وہ تنہا اپنے اندر دونوں سیدوں کے مقابلہ کی قوت نہ دیکھتا تھا۔ اس نے پہلے معلوم کرنا چاہا کہ نظام الملک اور چھبیلہ رام کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان دونوں امیروں میں سے چھبیلہ رام کی شرکت یقینی تھی کیونکہ وہ فرخ سیر اور اسکے باپ کے سرگرم حامیوں میں سے تھا۔ مگر سید عبداللہ خاں نے اس کو کالپی کے زمیندار حسن سنگھ کے ساتھ الجھا دیا اس لیے وہ جے سنگھ کے ساتھ اتحاد عمل کرنے سے معذور ہو گیا۔ رہے نظام الملک تو ان جیسے بالغ النظر مدبر کے لیے ناممکن تھا کہ وہ سیدوں کی مخالفت کے جوش میں اپنے آپ کو ایک ایسی بے بنیاد اور بے زور تحریک میں شامل کر دیتے جس کو بے سوچے سمجھے بغیر کسی تیاری اور بلا کسی پختہ اور مکمل نقشہ کے نیکوسیر جیسے بے خبر و بے عقل شاہزادے کو آلۂ کار بنا کر ایک ایسے شخص نے شروع کیا تھا جو چالاک اور منصوبہ باز تو ضرور تھا مگر نہ عامۂ خلائق یا امرا میں اس کا کوئی اثر تھا نہ آگرہ کی قلعہ نشین فوج کے سوا کوئی اور فوجی قوت اس کے ہاتھ میں تھی۔ نہ وہ سیاسی معاملات میں بصیرت اور عملی تجربہ رکھتا تھا اور نہ اس میں

سالاری وقیادت کی قابلیت تھی۔ انہوں نے اس تحریک کے بانیوں اور حامیوں کو نہ جواب صاف دیا نہ ان کی ہمت افزائی کی اور نہ ان کی تائید میں کوئی عملی قدم اٹھایا۔ یہ حال دیکھ کر جے سنگھ کا جوش وخروش بھی ٹھنڈا ہو گیا اور اس نے بھی نئے بادشاہ اور وزیر کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب مترشین نے ایک دوسرا ڈھنگ اختیار کیا۔ اس نے نیکوسیر کی جانب سے دونوں سیدوں کو لکھا کہ "تم نے یہ کس بچے کو ہندوستان کے تخت پر بٹھایا ہے۔ جب میں بڑا موجود ہوں تو چھوٹے کو بٹھانا کیسے جائز ہو سکتا تھا۔ اگر تم میری اطاعت کرو تو میں تمہارے وہی مراتب ومناصب برقرار رکھوں گا جو تم کو اب تک حاصل تھے"۔ عبداللہ خاں فطرتاً سہل تر راستہ کو اختیار کرنا پسند کرتا تھا۔ اسے ایک کاٹھ کے پتلے کی ضرورت تھی جسے تخت پر بٹھا کر وہ خود فرمانروائی کرے۔ یہ پتلا خواہ رفیع الدرجات کی صورت کا ہو یا نیکوسیر کی شکل کا اس سے کوئی بحث نہ تھی۔ اس لیے وہ نیکوسیر سے معاملہ طے کرنے اور اسے دہلی لے آنے پر آمادہ ہو گیا مگر حسین علی خاں ایک ضدی سپاہی تھا۔ اس نے اصرار کیا کہ آگرہ کے ان مٹھی بھر آدمیوں نے ہمارے ارادے میں مزاحمت کرنے کی جو جرأت کی ہے اس کی انہیں ایسی سزا دینی چاہیے کہ پھر کوئی ہمارے مقابلہ میں سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے۔ اس پر دونوں بھائیوں کے درمیان ایک عرصہ تک مناظرہ ہوتا رہا اور اسی وجہ سے حسین علی خاں کو جو ۲ رجب سے دہلی کے باہر فوجیں لے کر نکل آیا تھا آگرہ جانے میں دیر بھی لگی لیکن آخرکار حسین علی خاں کی ضد عبداللہ خاں کی صلح پسندی پر غالب آ گئی۔

رفیع الدولہ کی تخت نشینی

اس دوران میں رفیع الدرجات کا عارضۂ دق شدت اختیار کر گیا اور اس نے خواہش کی کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ چنانچہ

۲۷ رجب ۱۱۳۱ھ م ۴ جون ۱۷۱۹ء کو ۳ مہینہ کی حکومت کے بعد رفیع الدرجات تخت سے اتار دیا گیا۔[1] اور اس کے دو یا تین دن بعد رفیع الدولہ شاہجہاں ثانی[2] کے لقب سے تخت نشین کیا گیا۔ اب نیکو سیر کے ساتھ صلح ہونے کا جو تھوڑا بہت امکان تھا وہ بھی باقی نہ رہا۔

قلعہ آگرہ کی فتح

شعبان (جولائی ۱۷۱۹ء) میں حسین علی خاں اور اس کے ساتھ محمد امین خاں صمصام الدولہ خاں اور ظفر خاں آگرہ پہنچے اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ نیکو سیر کے حامی ایک مہینہ تک اس امید پر مدافعت کرتے رہے کہ جے سنگھ، چھبیلہ رام اور نظام الملک ان کی مدد کو آئیں گے مگر جب وہ بالکل مایوس ہو گئے تو انہوں نے ۲۷ رمضان ۱۲ اگست ۱۷۱۹ء کو ہتھیار ڈال دیئے اور قلعہ پر دونوں سیدوں کا قبضہ ہو گیا۔ نیکو سیر گرفتار ہو کر آیا تو حسین علی خاں اس کے سامنے ادب کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے مسند پر جگہ دی۔ مگر عالمگیر کا یہ پوتا جس نے ساری عمر محلسرا میں گذاری تھی۔ عاجزی کے ساتھ میر بخشی کے سامنے جھک گیا اور اس سے خالص بیگمات کی زبان، اور زنانہ لہجے اور انداز کلام میں بلک بلک کر اپنی جان بخشی کی التجائیں کرنے لگے۔ بابر و تیمور کی اولاد کو اتنی پستی کی حالت میں دیکھ کر حسین علی خاں کو بھی ترس

---

[1] اس کے چند روز بعد ۲۴ رجب کو رفیع الدرجات کا انتقال ہو گیا۔

[2] یہ رفیع الدرجات سے صرف ۱۸ مہینہ بڑا تھا۔ دونوں سیدوں نے اس کو رفیع الدرجات کی طرح قیدیوں کی طرح رکھا۔ اس کا اتالیق ہمت خاں بارھہ ہمزاد کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ جمعہ کی نماز ہو یا شکار، یا کسی امیر سے ملاقات غرض ہر موقع پر اس کا یا اس کے کسی آدمی کا بادشاہ کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔

آگیا۔ اس نے تسلی دلاسا دے کر اسے زندگی کے بقیہ دن گذارنے کے لیے سلیم گڈھ دہلی کے شاہی قید خانہ میں بھیج دیا۔ اس کے بعد قلعہ آگرہ کے قدیم دفائن وخزائن کی تلاش شروع ہوئی جو سکندر لودھی اور بابر کے زمانہ سے عالمگیر کے عہد تک جمع ہوتے رہے تھے اور جن کی شہرت افسانوں کی طرح دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ پرانے پرانے خزانچی اور نگہبان ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے گئے اور ان کو ہر قسم کی دھمکیاں اور لالچ دے کر چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ پوچھا گیا۔ اس طرح جس قدر نقد روپیہ اور قیمتی سامان حاصل ہوا اس کی مجموعی مالیت ایک اندازہ کے مطابق ایک کروڑ اسی لاکھ اور ایک دوسرے اندازہ کے مطابق دو اور تین کروڑ روپیہ کے درمیان تھی۔ ان میں ایسی بیش بہا چیزیں بھی دستیاب ہوئی تھیں جیسے نورجہاں کی مرصع بجواہر شال جہانگیر کی مرصع تلوار اور وہ موتیوں کی چادر جو شاہجہاں نے ممتاز محل کی قبر پر چڑھانے کے لیے بنوائی تھی۔ اس تمام دولت پر تنہا حسین علی خاں نے قبضہ کر لیا۔ عبداللہ خاں اس وقت بادشاہ کو لیے ہوئے دہلی سے آگرہ آرہا تھا اور ابھی راستہ میں تھا اسے یہ خبر پہنچی تو وہ تیزی کے ساتھ کوچ کرتا ہوا آگرہ پہنچا اور اس نے چھوٹے بھائی سے سختی کے ساتھ اپنے حصے کا مطالبہ کیا۔ دونوں بھائیوں میں اس پر سخت بدمزگی پیدا ہو گئی۔ رتن چند کو خوف ہوا کہ یہ نااتفاقی کہیں دونوں کو تباہ نہ کر دے۔ اس نے بیچ میں پڑ کر تصفیہ کرادیا جس کی رو سے بادشاہ کے حصہ میں صرف جہانگیر کی تلوار اور نورجہاں کی شال آئی۔ عبداللہ خاں کو ۱۲ لاکھ روپیہ ملا اور باقی سب مال حسین علی خاں کے قبضہ میں رہا۔ مورخین کا بیان ہے کہ تصفیہ ہو جانے کے باوجود اس واقعہ کے بعد سے دونوں بھائیوں کے درمیان اتفاق واتحاد باقی نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔

۷۔ محمد شاہ کا دورِ حکومت

اس واقعہ کے چند روز بعد رفیع الدولہ کی صحت نے بھی جواب دے دیا اور ۵ ذوالقعدہ ۱۱۳۱ھ ۷/۱۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو اس نے وفات پائی۔ اس کی بیماری ہی کے زمانہ میں دہلی سے جہاں شاہ ابن شاہ عالم بہادر شاہ کے بیٹے روشن اختر کو لانے کے لیے آدمی بھیج دیئے گئے تھے۔ یہ شاہزادہ رفیع الدولہ کی وفات کے ایک ہفتہ بعد آگرہ پہنچا اور ۱۵ ذی القعدہ ۱۱۳۱ھ ۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو ۱۸ سال کی عمر میں ابو الفتح ناصر الدین محمد شاہ کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا گیا۔

جے سنگھ سے مصالحت

آگرہ کی مہم اور نئے بادشاہ کی تخت نشینی سے فارغ ہونے کے بعد دونوں سیدوں نے اپنے مخالف امراء کی طرف توجہ کی جن سے انہیں خطرہ لگا ہوا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ سرگرم جے سنگھ تھا جو راجپوت رسم کے مطابق اپنا دارالریاست آنبیر برہمنوں کو دان دے کر زعفرانی لباس پہن کر مرنے مارنے کا عہد کر کے فرخ سیر کا بدلہ لینے کے لیے نکل آیا تھا۔ حسین علی خاں نے چاہا کہ اس کے مقابلہ پر فوج لے جائے مگر اجیت سنگھ والی جودھ پور نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دینے کا ذمہ لیا اور جے سنگھ سے مل کر اس نے اس طرح صلح کرائی کہ اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی۔ شاہی خزانہ سے لڑکی کے جہیز کے طور پر ۲۰ لاکھ روپیہ دیا گیا اور جے سنگھ کو سرکارِ سورت کی حکومت دی گئی۔ اس سے پہلے اجیت سنگھ کو اجمیر اور گجرات کی صوبہ داری پر مقرر کیا جا چکا تھا۔ اب اس کے داماد جے سنگھ کو سورت کی حکومت دے کر دونوں سیدوں نے ملک کا اتنا بڑا علاقہ ان طاقت ور راجپوت سرداروں کے حوالہ کر دیا جو دارالسلطنت کے جنوب میں ۶۰ میل کے فاصلہ سے شروع ہو کر ساحل سمندر تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ ان بادشاہ گر سیدوں کی نہایت فہمی کا حال تھا۔

گردھر بہادر سے مصالحت

جے سنگھ کے بعد دوسرا دشمن چھبیلہ رام ناگر تھا۔ فرخ سیر کے باپ عظیم الشان کا بنایا ہوا آدمی تھا۔ فرخ سیر نے تخت شاہی پر بیٹھتے ہی دیوانی کا عہدہ دینا چاہا تھا مگر عبداللہ خاں کی شدید مخالفت سے مجبور ہو کر اکبر آباد کا صوبہ دار مقرر کر دیا تھا اسوقت سے اسکے دل میں عبداللہ خاں کی طرف سے گرہ بیٹھ گئی تھی بعد میں وہ الہ آباد کے صوبہ پر منتقل کر دیا گیا اور وہاں فرخ سیر کے عزل و قتل کی خبر سنتے ہی اس نے علی الاعلان بغاوت کر دی۔ اس کی بغاوت کا ایک بڑا نقصان یہ تھا کہ بنگال اور بہار کے صوبوں سے دار السلطنت کا تعلق منقطع ہو گیا تھا اور ادھر سے مال خراج نہیں آسکتا تھا۔ سیدوں نے اس کو قابو میں لانے کے لیے اس کے بھتیجے گردھر بہادر کو پکڑ کر قید کر لیا اور اس کے مقابلہ میں کالپی کے زمیندار جن سنگھ کو کھڑا کر دیا مگر ان کی یہ چال کامیاب نہ ہو سکی۔ گردھر بہادر قید سے بھاگ کر اپنے چچا سے جا ملا اور دونوں نے مل کر جن سنگھ کو زیر کر لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد چھبیلہ رام ناگر مر گیا (ذی الحجہ ۱۱۳۱ھ نومبر ۱۷۱۹ء)، اور گردھر بہادر نے اس کی جگہ سنبھال کر فتنہ کو پہلے سے بھی زیادہ تیز کر دیا۔ اس پر محرم ۱۱۳۲ھ نومبر ۱۷۱۹ء میں حیدر قلی خاں اسفرائینی الہ آباد کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا جس نے گردھر بہادر کو محصور کر کے بہت پریشان کیا۔ مگر گردھر کے پاس فوج اور سامانِ رسد کی کمی نہ تھی اور الہ آباد کا مضبوط قلعہ اس کے قبضہ میں تھا۔ اس لیے حیدر قلی خاں اس کو زیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ حسین علی خاں نے چاہا کہ خود اس مہم پر جائے مگر عبداللہ خاں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس کے دل پر آگرہ کے خزانوں کا داغ تازہ تھا۔ اس نے کہا کہ حسین علی نے آگرہ کے خزانے لوٹے تو اب الہ آباد کا مال غنیمت میرے حصہ میں آنا چاہیے۔ قریب تھا کہ دونوں بھائیوں میں لڑائی ہو جائے لیکن رتن چند نے پھر مداخلت کی اور دونوں کے درمیان تصفیہ اس بات پر ہوا کہ رتن چند کو الہ آباد بھیجا جائے اور وہ گردھر بہادر سے صلح کر لے چنانچہ جمادی الاولیٰ میں وہ الہ آباد گیا اور جمادی الآخری ۱۱۳۲ھ مئی ۱۷۲۰ء میں گردھر

سے صلح کرلی جس کی رو سے وہ اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا۔ تمام ماتحت سرکاروں[1] کے دیوان اور فوجدار مقرر کرنے کا اسے اختیار دے دیا گیا اور ۳ لاکھ روپیہ انعام کے طور پر بھی دیا گیا۔

نظام الملک سے مخالفت کی ابتدا

ان دونوں مخالفوں سے دب کر صلح کرنے کی وجہ یہ تھی کہ دونوں سیدوں کو اپنے سب سے زیادہ طاقتور مخالف نظام الملک کے مقابلہ میں اپنی پوری قوت صرف کرنی تھی۔ انہوں نے نظام الملک کو مالوہ کی صوبہ داری پر اس مصلحت سے بھیجا تھا کہ ایک طرف دکن میں ان کا بھتیجا عالم علی خاں نائب صوبہ دار کی حیثیت سے موجود تھا، دوسری طرف ان کے احسان مند مرہٹے تھے، تیسری طرف آگرہ کے صوبہ میں ان کا بھائی غیرت خاں صوبہ دار تھا اور چوتھی جانب گجرات کا صوبہ دار ان کا سرگرم حامی اجیت سنگھ تھا۔ ان کو امید تھی کہ ان چار طاقتوں کے درمیان نظام الملک اس طرح گھرے رہیں گے کہ ان کو سرتابی کی جراءت نہ ہو سکے گی اور جے سنگھ چھبیلہ رام اور گردھر بہادر کو مطیع کرنے کے بعد ان کا بآسانی خاتمہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس منصوبے کے مطابق انہوں نے اپنے دوسرے مخالفین کو صلح و آشتی سے راضی کر کے نظام الملک سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ ان کے خلاف الزامات کی ایک فہرست تیار کی گئی جن کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ مرحمت خاں حاکم مانڈو کو حسین علی خاں نے اس قصور میں معزول کر دیا تھا کہ دکن سے واپسی پر جب حسین علی مانڈو کے قریب سے گذرا تھا تو وہ اس سے ملنے نہیں آیا تھا لیکن نظام الملک نے اسے معزول کرنے کے بجائے اپنی ملازمت میں رکھ لیا اور رام گڈھ کے

---

[1] لفظ سرکار قدیم اصطلاح میں ضلع کا ہم معنی تھا۔

زمیندار جے بندیلہ کے خلاف مہم پر بھیج دیا۔

۲- نظام الملک نے اپنے صوبہ کی ضرورت سے زیادہ مقدار میں سامان جنگ اور لشکر فراہم کرلیا۔

۳- انہوں نے پرگنۂ تالم کے ایک زمیندار کو بلا اجازت الگ کردیا۔

۴- ان کے علاوہ چند اراضی کے متعلق بھی نظام الملک کی کارروائی پہ اعتراض تھا۔

حسین علی خاں نے نظام الملک کے وکیل[1] کو بلا اجازت شکایات نہایت تلخ و درشت لہجہ میں پیش کیں۔ جواب میں نظام الملک نے خود حسین علی خاں کو ایک خط لکھا جس میں تمام الزامات کی صفائی پیش کی منجملہ ان کے فوج اور سامان جنگ فراہم کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ مالوہ کی جانب مرہٹوں کی غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور روک تھام کے لیے اس سے زیادہ فوج درکار ہے جس کی مالوہ کے انتظام کے لیے عموماً ضرورت ہوتی ہے۔ آخر میں انہوں نے لکھا کہ اگر میرا ارادہ مخالفت کا ہوتا تو اس کے لیے بہترین موقع وہ تھا جب نکوسیر نے مجھے آگرہ آنے کی دعوت دی تھی اور تمہارے مخالفین محض میری شرکت کے منتظر تھے لیکن اس جواب سے حسین علی خاں کی تسکین نہ ہوئی اور اس نے مالوہ سے نظام الملک کی علیحدگی کا فرمان جاری کرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی نیم سرکاری طریقہ سے نظام الملک کو لکھا گیا

---

[1] اس زمانہ میں دارالسلطنت کے باہر جو امرا صوبہ داری یا کسی اور خدمت پہ متعین ہوتے تھے تو ان کی طرف سے ان کے وکلا دربار میں رہتے تھے اور انہی وکلا کے توسط سے مراسلت ہوتی تھی۔

کہ دکن کی انتظامی ضرورت کیلیے یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ مالوہ کو ہم اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ آپ اکبر آباد ملتان، الہ آباد یا برہان پور کے صوبوں میں سے جو صوبہ چاہیں اپنے لیے پسند کرلیں نظام الملک نے اس تجویز کو دو وجوہ سے رد کر دیا۔ ایک یہ کہ مالوہ کی صوبہ داری پر مقرر کرتے وقت ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں پھر اس طرح معزول نہ کیا جائیگا جس طرح اس سے پہلے وہ دکن اور مراد آباد سے معزول کر دیئے گئے تھے دوسرے یہ کہ اس وقت تک فصل ربیع کے محاصل وصول نہ ہوئے تھے اور فوج وغیرہ پر جو کچھ خرچ کیا جا چکا تھا اس کی تلافی انہی محاصل کے وصول ہونے پر منحصر تھی لیکن دونوں سیدوں نے ان معقول عذرات کو قبول نہ کیا اور سید دلاور علی خاں کو جو حسین علی خاں کا بخشی فوج تھا تسخیر بوندی کے بہانہ سے دو بڑے طاقتور سرداروں کی معیت میں مالوہ کی مغربی سرحد پر بھیج دیا تاکہ بوقت ضرورت وہ فوراً نظام الملک کے مقابلہ پر جاسکے۔

دونوں سیدوں کے خلاف عام ناراضی

ایک طرف نظام الملک کے استیصال کی یہ کوششیں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف خود سیدوں کے خلاف اندر ہی اندر ایک زبردست مواد پک رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کے طرز عمل سے عوام، خواص، امراء اور بادشاہ سب نالاں تھے۔ انہوں نے اور ان کے دست راست رتن چند نے تمام ملکی اور مالی عہدے اور ہر قسم کے فوائد و منافع سادات بارھہ اور ان کے متوسلین اور رتن چند کے ہم قوم بقالوں کے لیے مخصوص کر رکھے تھے اور دوسرے لوگوں کے لیے اپنی نوازشات کے دروازے بند کر دیئے تھے اس سے ملک کے اہل سیف و اہل قلم شرفا میں بے کاری اور بے چینی پھیل رہی تھی اس پر مزید یہ کہ رتن چند اور اجیت سنگھ کے اثر سے متاثر ہو کر سیدوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچانا شروع کر دیا۔ انہوں نے فرخ سیر کے قتل کے بعد اس کی بیوہ کو جو اجیت سنگھ کی بیٹی تھی اجیت سنگھ

کے حوالہ کردیا[1] اور اس نے جودھ پور لے جا کر اس لڑکی کو پھر ہندو بنا لیا۔ خاندان مغلیہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جو عورت ان کے حرم میں داخل ہو جاتی تھی وہ پھر واپس نہیں جاتی تھی۔ اس سے پہلے راجپوت رئیسوں کی بہت سی لڑکیاں ان کے ہاں آئیں اور کبھی انہیں واپس نہیں کیا گیا۔ لیکن سیدوں نے نہ صرف اس رسم کو توڑا بلکہ قانون اسلام کے خلاف اجیت سنگھ کو اس کی اجازت بھی دے دی کہ وہ اپنی لڑکی کو جو مسلمان ہو چکی تھی پھر ہندو بنا لے اس پر مسلمانوں میں سخت ہیجان برپا ہوا اور قاضی شرع نے فتویٰ دیا کہ یہ فعل اسلامی شریعت کے بالکل خلاف اور شریعت کی توہین ہے۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک روز جمعہ کے دن آگرہ کی مسجد میں ایک ہندو عورت مسلمان ہوئی۔ اس کے عزیزوں نے رتن چند سے فریاد کی رتن چند نے اس معاملہ کو عبداللہ خاں کے سامنے بُرے رنگ میں پیش کیا اور اس کی اجازت سے یا اجازت کو توال شہر کو حکم دیا کہ اس نو مسلمہ کو ذلت کے ساتھ شہر میں تشہیر کیا جائے اور اس قسم کے مسلمان کو جو اس عورت سے نکاح کرنا چاہتا تھا ذلیل و خوار کر کے لشکر سے نکال باہر کیا جائے یہ اور قسم کے متعدد واقعات تھے جنہوں نے عام طور پر مسلمانوں میں دونوں سیدوں کے خلاف شدید ناراضی کے جذبات پیدا کر دیئے۔[2]

---

[1] باوجودیکہ فرخ سیر کی دوسری بیویوں کی املاک ضبط کر لی گئی تھیں عبداللہ خاں نے اجیت سنگھ کی لڑکی کو بدستور اس مال و متاع اور جائداد پر قابض رہنے دیا جو فرخ سیر کی طرف سے اس کو ملی تھی۔ اس کی مجموعی مالیت ایک کروڑ روپیہ بتائی جاتی ہے۔

[2] مذہبی حیثیت سے حسین علی خاں کا طرز عمل مسلمانوں کی نگاہ میں اتنا قابل اعتراض نہ تھا جتنا عبداللہ خاں کا تھا۔ اس پر ہندوؤں کا اثر اس قدر زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہندوؤں کے تہوار منایا کرتا تھا۔

رعایا کی طرح بادشاہ اور اس کا خاندان بھی دونوں بھائیوں کے استبداد سے بیزار تھا۔ دونوں بھائیوں نے رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات کی طرح محمد شاہ کو بھی قیدیوں کی طرح رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے گرد و پیش ہر خدمت پر انکے آدمی مقرر تھے حتیٰ کہ خواجہ سرا خواص، فیلبان، باورچی، رکاب دار، فراش اور خدمت گار سب ان کے متوسلین میں سے تھے ہمت خاں بارھہ اتالیق کی حیثیت سے سایہ کی طرح ساتھ لگا رہتا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر نہ وہ کہیں جا سکتا تھا اور نہ کسی سے بات کر سکتا تھا۔ جب وہ نماز جمعہ یا شکار کیلئے باہر نکلتا تو سیدوں کے آدمی اسطرح گھیرے رہتے جیسے وہ کوئی خطرناک قیدی ہے جس کے ہر وقت بھاگ جانے کا خوف ہے۔ امراء میں سب سے زیادہ امرائے تورانی دونوں سیدوں کے مخالف تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نظام الملک کا استیصال کرنے کے بعد یہ دونوں تورانی گروہ کے کسی شخص کو عزت و منزلت کے مقام پر نہ رہنے دیں گے۔ دربار میں محمد امین خاں اعتماد الدولہ اس گروہ کا لیڈر تھا۔ وہ بظاہر سیدوں کے ساتھ ملا ہوا تھا مگر بباطن ان کا سخت مخالف تھا۔ اس نے محمد شاہ کیساتھ ترکی زبان میں جسے سیدوں کے ملازم نہیں سمجھ سکتے تھے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا اور رفتہ رفتہ ان دونوں کے درمیان سیدوں کے خلاف اتحاد ہو گیا۔ محمد امین خاں نے خود اور اس کی معرفت محمد شاہ اور اس کی ماں نے نظام الملک کو پیہم خطوط لکھے جن میں ان سے استدعا کی کہ جسطرح ممکن ہو اپنی قوت و قابلیت سے سیدوں کے استبداد کا خاتمہ کریں، اور انہیں امید دلائی کہ اگر انکے

اسکے ہاں بسنت کی رسم اسطرح کی جاتی تھی جسطرح ہندو کرتے تھے اور ہولی کے تہوار میں وہ رنگ کھیلتا اور گلال اڑاتا تھا

حسن و تدبیر سے یہ کام انجام کو پہنچا تو وزارت انہی کو دی جائے گی۔ ان خطوط کا سلسلہ اس وقت جاری تھا جب آگرہ میں نیکوسیر کے قضیہ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا لیکن نظام الملک اپنی طرف سے پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس وقت تک انتظار کر رہے تھے جب سید خود انہیں چھیڑیں۔ چنانچہ اب سیدوں کی جانب سے ابتدا ہوئی اور نظام الملک اس کے جواب میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔

نظام الملک دکن پہنچتے ہیں

جب دلاور علی خاں ایک طاقتور فوج کے ساتھ مالوہ کی مغربی سرحد پر بھیجا گیا تو نظام الملک کے لیے اسکے سوا چارہ نہ رہا کہ یا تو مالوہ میں رہ کر مقابلہ کریں یا کسی اور علاقہ کی طرف نکل جائیں۔ پہلی صورت میں یہ خطرہ تھا کہ آگرہ کیطرف سے حسین علی خاں، دکن کیطرف سے عالم علی خاں اور بوندی کی طرف سے دلاور علی خاں دفعتہً ان پر حملہ آور ہونگے اور ہر جانب سے انہیں گھیر کر انکا خاتمہ کر دیں گے۔ اسلیئے انہوں نے مالوہ سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کی پہلی تجویز یہ تھی کہ جے سنگھ راجہ آنبیر کے ساتھ جا ملیں اور اس کی امداد سے آگرہ یا دہلی کی جانب حملہ آور ہوں لیکن جے سنگھ سیدوں سے صلح کر چکا تھا اسکی طرف سے نظام الملک کو کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ اس دوران میں مبارز خاں صوبہ دار حیدرآباد سین جادو جو حسین علی اور راجہ ساہو کی دوستی کے بعد سے دونوں سیدوں کا مخالف ہو گیا تھا، سعادت اللہ خاں فوجدار ارکاٹ اور دکن کے دوسرے سرداروں کی جانب سے ان کو خطوط ملے جن میں لکھا تھا کہ اگر فرخ سیر کے خون کا بدلہ لینے اور بادشاہ کو سیدوں کے استبداد سے نکالنے کیلئے تلوار اٹھائیں تو ہم آپ کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہیں۔ مزید براں دکن میں نظام الملک کے پھوپھا عضد الدولہ عوض خاں برادہ

کے صوبہ دار تھے اور انور خاں قطب الدولہ صوبہ دار خاندیس ایک کمزور آدمی تھا جس میں مدافعت کی بالکل قوت نہ تھی۔ ان وجوہ سے انہوں نے دکن جانے کا عزم کیا مگر علی الاعلان ادھر جانا اپنے اوپر خود ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ اسلیئے انہوں نے اپنے اصلی ارادہ کو بالکل مخفی رکھا اور جمادی الاولیٰ میں اجین سے دہلی کی جانب روانہ ہو گئے دونوں کو یہ اطلاع ملی تو وہ خوش ہوئے کہ شکار خود ان کی طرف آ رہا ہے اور انہوں نے بادشاہ کی طرف سے فرمان بھیجا کہ تم سید ہو۔ اگرہ آؤ یہاں پہنچتے ہی تمہیں اس صوبہ کی حکومت دے دی جائے گی لیکن نظام نے اجین دہلی کی سڑک سے دفعتًہ اپنا رخ بدل دیا اور تیزی کیساتھ کوچ کرتے ہوئے دکن کی جانب چلے یہاں تک کہ یکم رجب ۱۱۳۲ھ ۸ مئی ۱۷۲۰ء کو نربدا اترے کے بعد قبل اس کے کہ عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن کو خبر ہوتی، انہوں نے ۱۳ رجب کو آسیر کے مشہور قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے تیسرے دن ۱۶ رجب کو خاندیس کے دار الحکومت برہانپور کو بھی مسخر کر لیا جہاں انور خاں نے ان کی اطاعت قبول کر لی اسطرح مخالفین کے ہوشیار ہونے سے پہلے نظام الملک اپنی ایک ہی چال میں دکن کے دو صوبوں برار اور خاندیس پر متصرف ہو گئے۔ اب انہوں نے پہلی مرتبہ دونوں سیدوں کی مخالفت کا اعلان کیا جو دوسرے الفاظ میں تخت شاہی کے تمام وفادار امراء کے نام ان کا دعوت نامہ تھا۔ اس اعلان کے الفاظ یہ تھے کہ "بذل جہد محض تخلیص خداوند نعمت است کہ بدست صاحب مداراں آں چناں گرفتار اند، کہ بے اذن نمی توانند برائی ادائی نماز جمعہ بروند تا بدیگر امور چہ رسد"[۱] اسکے ساتھ ہی حکم دیا کہ تمام مسجدوں میں جمعہ کے دن محمد شاہ کی رہائی کے لیے دعا کی جائے اور خطبہ میں دعا کے وقت یہ الفاظ کہے جائیں کہ وہ محمد شاہ دین پناہ دشمنوں کی قید میں ہے۔

---

[۱] منتخب اللباب ج ۲، ص ۹۸؟

اور جملہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اسے قید سے چھڑائیں"۔ ان باتوں سے مدعا یہ تھا کہ عوام اور خواص سب میں دونوں سیدوں کے خلاف ایک ہمہ گیر ہیجان پیدا ہو جائے۔

دلاور علی خاں کی شکست

نظام الملک کے نربدا پار اترنے اور اسیر و برہانپور پر قبضہ کر لینے کی اطلاعات، پے در پے آگرہ پہنچیں تو دونوں سید حیران رہ گئے۔ حسین علی خاں نے فوراً دکن کی طرف جانے کا ارادہ کیا لیکن عبداللہ خاں اور صمصام الدولہ خاں دوراں نے رائے دی کہ شمال سے دلاور علی خاں کو بڑھنے کا حکم دیا جائے، یہ دونوں مل کر باغی نواب کا باسانی استیصال کر دیں گے۔ چنانچہ اس تجویز سے مطابق دلاور علی خاں کو احکام بھیجے گئے کہ راہ بھیم، سنگھ اڑا راجہ گنج سنگھ اور دوست محمد خاں[1] کو لے کر فوراً نظام الملک کے مقابلہ پر جائے دوسری طرف عالم علیخاں کو حکم دیا گیا کہ وہ اورنگ آباد سے نظام الملک کی جانب پیشقدمی کرے۔ لیکن عالم علی کے پاس فوج تیار نہ تھی۔ اس لیے وہ فوراً اورنگ آباد سے کوچ نہ کر سکا اور اس اطراف و نواحی سے فوج فراہم کرنے اور مرہٹوں سے امدادی فوج منگانے میں دیر لگا دی بخلاف اس کے دلاور علی خاں کے پاس فوج مستعد تھی اس لیے وہ حکم ملتے ہی برہانپور کی جانب چل پڑا اور رجب کے اواخر میں نربدا پار کر کے سرکار ہانڈیہ[2] میں داخل ہو گیا۔ نظام جیسے آزمودہ کار سپہ سالار کیلئے مشکل تھا کہ وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔ سیدوں کا نقشہ جنگ یہ تھا کہ دلاور علی اور عالم علی بیک وقت دو جانب سے انپر حملہ کریں مگر اب دونوں جنرلوں میں سے ایک پہلے آگیا تھا اور دوسرے کے

---

[1] بانی ریاست بھوپال

[2] نربدا کے جنوبی ساحل پر برہانپور سے ۹۲ میل جانب شمال۔

آنے میں دیر تھی اس سے ان کو یہ موقع مل گیا کہ دونوں کے اجتماع سے پہلے ایک سے الگ نمٹ لیں۔ اس موقع سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر برہانپور سے روانہ ہو گئے۔ ۱۳؍ شعبان ۱۱۳۲ھ ۱۹؍ جون ۱۷۲۰ء کو برہانپور اور نربدا کے درمیان پنڈھر کے پہاڑی علاقہ میں دونوں کا مقابلہ ہوا[1]۔ دلاور علی خاں کے ساتھ سادات بارھہ، افاغنہ، اور راجپوتوں کی بہترین فوج تھی لیکن قائدانہ قابلیت کے اعتبار سے اس کو نظام الملک سے کوئی نسبت نہ تھی اسنے سادہ لوح سپاہیوں کی طرح تلوار سے کام لینا چاہا مگر نظام الملک نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اسے تلوار چلانے کا موقع ہی نہ دیا اور اپنے توپخانہ کو اسطرح استعمال کیا کہ دلاور علی خاں اپنی فوج کے چار پانچ ہزار سپاہیوں اور اکثر و بیشتر نامور سرداروں سمیت مارا گیا اور اس کے مقابلہ میں خود نظام الملک کے کل سو آدمی زخمی ہوئے اور ۳۰ مارے گئے۔

نظام الملک کے نام صوبہ داری دکن کا فرمان

شعبان کے آخر میں دلاور علی خاں کی شکست اور اس کے قتل کی خبر آگرہ پہنچی تو دونوں سید سخت سراسیمہ ہوئے۔ اب عالم علی خاں ایک بیس اکیس برس کا لڑکا جہاندیدہ نظام الملک کے مقابلہ میں تنہا رہ گیا تھا۔ حسین علی خاں کے بیوی بچے دولت آباد کے قلعہ میں تھے اور آگرہ سے دکن کا فاصلہ اتنا تھا کہ فیصلہ کن جنگ ہونے سے پہلے نظام الملک کے سر پر جا پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس حالت میں دونوں بھائی حیران تھے کہ کیا کریں۔ کبھی ارادہ کرتے کہ دونوں بادشاہ کو لے کر دکن جائیں۔ کبھی فیصلہ کرتے کہ حسین علی خاں بادشاہ کے ساتھ دکن جائے۔ اور عبداللہ دہلی چلا جائے۔ کبھی

---

[1] بعض مصنفین نے اس جنگ کا مقام حسن پور بتایا ہے اور بعض نے رتن پور منعم خاں لکھتا ہے کہ نربدا سے ۱۲ میل جانب جنوب یہ جنگ ہوئی تھی۔

رائے قرار پائی کہ عبداللہ خاں محمد شاہ کو لے کر دہلی چلا جائے اور حسین علی خاں تنہا نظام الملک کے مقابلہ پر جائے۔ اس اضطراب کی حالت روز شاہی خیمہ و خرگاہ آگرہ کے باہر نکلتے اور روز واپس بلا لیے جاتے۔ پریشانی کی ایک اور وجہ محمد امین خاں کی ذات تھی، یہ شخص ظاہر میں سیدوں کا گہرا دوست بنا ہوا تھا اور نظام الملک کے خلاف ان کو مشورے دیتا تھا مگر دونوں سید جانتے تھے کہ وہ دل میں ان کا سخت دشمن ہے اور نظام الملک کا قرابی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے ہرگز اس کا روادار نہیں ہے کہ ہمیں نظام کے مقابلہ میں فتح حاصل ہو وہ اس کی جنگی طاقت اور سیاسی قابلیت اور بادشاہ پر اس کے اثرات سے بھی واقف تھے اس لیے وہ حیران تھے کہ اس کھلے دوست اور چھپے دشمن کا کیا علاج کریں۔ نہ اسے دکن لے جانا قرین مصلحت معلوم ہوتا تھا اور نہ بادشاہ کے پاس چھوڑ دینا مناسب تھا۔ آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ اسے قتل کر دیا جائے لیکن عقلمند مشیروں نے اس کی مخالفت کی اور انہوں نے کہا کہ محمد امین خاں طاقتور مغل جماعت کا سردار ہے اس بھڑوں کے چھتہ میں پتھر مارنا ٹھیک نہیں ہے۔ ان مشکلات کا جب کوئی حل نظر نہ آیا تو مجبوراً انہوں نے نظام الملک کو صلح سے راضی کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ کی طرف سے نظام الملک کو ایک فرمان لکھا گیا جس میں اس بات پر اظہار تعجب کیا گیا تھا کہ نواب نے مالوہ کو بلا اجازت کیسے چھوڑ دیا، "نواب کی کونسی خواہش آج تک رہ گئی ہے، اگر وہ دکن میں سرو شکار کیلئے جانا چاہتے تھے تو کیونکر تھا کہ انکی یہ درخواست رد کر دی جاتی بلکہ اگر وہ دکن کی حکومت طلب کرتے تو وہ انہیں دے دی جاتی"۔ اس قسم کی باتوں کے بعد لکھا تھا کہ "دکن سے فتنہ و فساد کی خبریں سن کر ہمارا پہلے ہی یہ ارادہ تھا کہ تمہیں اس ملک کی صوبہ داری پر مقرر کر دیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ مقصد خود بخود حاصل ہو گیا۔ اب تمہارے نام دکن کی صوبہ داری کا باقاعدہ فرمان بھیجا جا رہا ہے اس کے

مطابق تم جائزہ لینے کے بعد عالم علی خاں کو امیر الامرا حسین علی خاں کے اہل وعیال سمیت واپس بھیج دیا۔ اس فرمان کے ساتھ حسین علی خاں نے بڑے دوستانہ انداز میں ایک خط نظام الملک کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ دلاور علی خاں کو میں نے اپنے اہل و عیال کے لانے کے لیے بھیجا تھا مگر معلوم ہوا کہ وہ میرے منشا کے خلاف آپ سے جنگ آزما ہوا اور الحمدللہ کہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ کچھ مفسدہ پردازوں نے بعض معاملات میں آپ کو ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے ہمارے اور آپ کے درمیان نا اتفاقی پیدا ہو۔ خدا نہ کرے کہ پرانے دوستوں کے درمیان اس قسم کی نوبت آئے بعض لوگوں نے آپ کی نسبت جہاں پناہ سے ایسی باتیں بیان کی تھیں جن سے شاہی عتاب ہونے کا اندیشہ تھا مگر میں نے آپ کی وفاداری کا یقین دلا کر خاطر مبارک کو صاف کر دیا ہے اور اب جہاں پناہ نے آپ کو دکن کی صوبہ داری پر مقرر کیا ہے میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے اور میرے بیٹے عالم علی خاں اور اہل وعیال کو بحفاظت روانہ کر دیجئے۔"

عالم علی خاں کی شکست

یہ خط اور فرمان پہنچنے سے پہلے نظام الملک اور عالم علی خاں ایک دوسرے سے لڑنے کیلئے اپنی اپنی جگہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ رمضان کی ابتدا میں عالم علی کنل فردا پور[1] پر تھا کہ اسے دلاور علی خاں کے قتل کی اطلاع ملی بعض ہمراہیوں نے صلاح دی کہ اب آگے بڑھنا خلاف مصلحت ہے مناسب یہ ہے کہ اورنگ آباد یا احمد نگر چل کر

---

[1] اجنٹہ گھاٹ کے شمالی دامن میں پچھورا اسٹیشن سے ۲۰ میل جانب جنوب۔ قدیم زمانہ میں صوبہ اورنگ آباد سے خاندیس میں داخل ہونے کا یہی راستہ تھا اور یہ دونوں صوبوں کی سرحد پر تھا۔

حسین علی خاں کا انتظار کیا جائے اور مرہٹہ فوجوں کو جنگِ قزاقی[1] کے لیے چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ غارت گری کر کے نظام الملک کو پریشان کرتی رہیں لیکن جوشیلے نوجوانوں نے اس مشورہ کو رد کر دیا اور پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ بالاپور[2] پر نظام الملک کے مقابل جا پہنچا۔ یہاں نظام الملک کو حسین علی خاں کا خط اور شاہی فرمان ملا جس کا بڑی دھوم دھام کے ساتھ انہوں نے استقبال کیا۔ برسرِ عام اس کو پڑھا۔ پھر اس کی ایک نقل عالم علی خاں کو بھیجی اور اسے لکھا کہ "اب میں دکن کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا ہوں لہٰذا مجھ سے تمہارا لڑنا فضول ہے اپنی فوج واپس کر دو میں تمہیں اور امیر الامرا کے اہل و عیال کو بحفاظت آگرہ پہنچا دینے کا ذمہ لیتا ہوں۔" عالم علی خاں نے اس کا کوئی اثر نہ لیا لیکن نظام الملک کا مقصد اس سیاسی چال سے کچھ اور تھا اور وہ انہیں حاصل ہو گیا۔ عالم علی خاں کی فوج میں زیادہ تر دکن کے سردار اور فوجدار تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ نظام الملک انکے صوبہ دار مقرر ہو چکے ہیں تو انہیں خود اپنی فکر لاحق ہوئی۔ معزول نائب صوبہ دار کیساتھ مل کر نئے صوبہ دار کے خلاف جنگ کرنا ان کے حق میں موجب نقصان تھا اسلیئے وہ عالم علی خاں سے الگ ہونے لگے۔ اس طرح حسین علی خاں کے خط اور شاہی فرمان نے دونوں حریفوں کی حیثیت بالکل منقلب کر دی۔ پہلے نظام الملک کو ایک باغی امیر قرار دیا جا رہا تھا اور عالم علی خاں شاہی حکومت کی طرف سے برسرِ مدافعت تھا مگر اب عالم علیخاں باغی کی حیثیت میں ہو گیا اور نظام الملک کو شاہی حکومت کے نمائندے کی

---

[1] جنگ قزاقی کا لفظ اس زمانہ میں گوریلا جنگ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

[2] اکولہ سے ۱۶ میل جانب مغرب پورنا ندی سے سولہ سترہ میل جانب جنوب یہ مقام اورنگ آباد اور برہانپور سے مساوی فاصلہ پر ہے۔

حیثیت حاصل ہو گئی۔ عالم علیخاں نے یہ رنگ دیکھ کر لڑائی میں جلدی کی اور ۲ شوال ۱۱۳۲ھ ۱۰ اگست ۱۷۲۰ء کو فریقین میں جنگ ہوئی جسمیں نظام الملک نے نہایت خفیف نقصان کیساتھ عالم علیخاں کو شکست دے دی اور وہ میدان میں مارا گیا

حسین علی خاں خود مقابلہ کیلئے آتا ہے

اس واقعہ کی اطلاع شوال کے آخر میں آگرہ پہنچی تو دونوں سیدوں کے غم و اضطراب کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے جوش غضب میں آکر چاہا کہ فوراً محمد امین خاں کو قتل کر دیں۔ حسین علی خاں نے اس پر حملہ کرنے کے لیے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اور محمد امین خاں اپنے محل کے گرد خندق کھود کر مدافعت کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر دانشمند لوگوں نے دونوں بھائیوں کو اس حرکت کے نتائج سے آگاہ کر کے انہیں ٹھنڈا کر دیا اور عبداللہ خاں نے اپنے بھائی کو سمجھا بجھا کر محمد امین خاں سے صلح کر لی۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں یہ صلاح ہوئی کہ حسین علی خاں بادشاہ کے ساتھ اجمیر کے راستہ سے اجیت سنگھ کو لیتا ہوا دکن کی طرف جائے اور عبداللہ خاں دہلی جا کر ٹھہرے چنانچہ ۹ ذی قعدہ ۱۱۳۲ھ ۳ ستمبر ۱۷۲۰ء کو یہ لوگ ۵۰ ہزار فوج کے ساتھ آگرہ سے اجمیر کی طرف روانہ ہوئے اور ایک منزل تک ساتھ جانے کے بعد رتن چند کو بادشاہ کے ساتھ چھوڑ کر عبداللہ خاں دہلی کی طرف چلا گیا۔ محمد امین خاں نے اس جنگ کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ اس نے حسین علی خاں سے کہا کہ میں اپنے بیٹے قمر الدین خاں کو دکن بھیجتا ہوں۔ وہ بحفاظت تمام آپ کے اہل و عیال کو لے آئے گا مگر حسین علی خاں نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر محمد امین خاں نے کہا کہ لشکر میں اور خصوصاً میری فوج میں بہت سے مغل ہیں جو نظام الملک سے لڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لہٰذا مجھے اور اس مغل فوج کو پیچھے چھوڑ دیا جائے مگر حسین علیخاں کا خیال تھا کہ محمد امین خاں کو پیچھے چھوڑ دینا ساتھ رکھنے سے زیادہ

خطرناک ہے اس لیے وہ اسے چھوڑ دینے پر راضی نہ ہوا اور چچا جان، چچا جان کہہ کر اور روپیہ دے دے کر خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

حسین علی خاں کا قتل

محمد امین خاں کے معاملہ میں حسین علی خاں کا خیال آخر کار غلط نکلا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ اسے چھوڑ جاتا تو یہ چالاک مدبر ایسی تدبیر کرتا کہ پھر یہ دونوں بھائی کبھی نہ مل سکتے لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس کا ساتھ رکھنا اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ اس نے دوران سفر ہی میں خفیہ طور پر حسین علی خاں کے قتل کے لیے ایک زبردست سازش کی جس میں چند نہایت مخصوص آدمیوں کو شریک کیا اور کسی غیر شخص کو اس کا علم تک نہ ہونے دیا۔ یہ مخصوص لوگ باستثنا محمد امین خاں تعداد میں کل پانچ تھے۔ (۱) سید محمد امین سعادت خاں[1] (۲) حیدر قلی خاں سفرائینی (۳) میر حیدر کاشغری (۴) شاہ عبدالغفور اور میر جملہ۔ ان میں سے میر جملہ کی ذات تو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے البتہ بقیہ ارکان کا مختصر تعارف کرانا ضروری ہے۔

(۱) سعادت خاں میر محمد امین نیشاپور کے سادات میں سے تھا۔ فرخ سیر کی شاہزادگی کے زمانہ میں اس کے والاشاہیوں میں داخل ہوا اور ہزاری منصب پایا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد تقرب خاں محمد جعفر کے ماتحت نیابت کروڑ گیری پر مقرر ہوا پھر دونوں سیدوں نے اس کو ہنڈون اور بیانہ کی فوجداری پر ترقی دی اور ہزار و پانصدی منصب عطا کیا۔ گردھر بہادر کے خلاف جو مہم الہ آباد بھیجی گئی تھی اس کی سرداری کے لیے پہلے اسی کو نامزد کیا گیا تھا۔ لیکن اسی زمانہ میں اس نے میر جملہ کو صدالصدور کا عہدہ دینے کے لیے حسین علی خاں سے سفارش کی اور رتن چند نے مخالفت کر کے نہ صرف اس کی سفارش رد کرا دی بلکہ اس مہم کی سرداری بھی اس سے چھین کر حیدر قلی خاں کو دلوا دی۔ غالباً اس وقت سے یہ رتن چند اور

[1] بانی ریاست اودھ

دونوں سیدوں کا مخالف ہوگیا اور یہی مخالفت اس سازش میں اس کی شرکت کی وجہ ہوئی۔

(۲) حیدر قلی خاں محمد رضا فرخ سیر کے باپ عظیم الشان کی سرکار میں ملازم تھا۔ فرخ سیر کی تخت نشینی کے بعد میر جملہ کے توسل سے اسکو حیدر قلی خاں کا خطاب ملا اور نظام کی صوبہ دکن کے زمانہ میں دیوانی دکن کا عہدہ دیا گیا۔ دکن میں نظام الملک سے اسکی نہ بنی اور یہ وہاں سے صوبہ گجرات کی دیوانی اور سورت کی متصدی گری پر مقرر کردیا گیا وہاں اس کی سخت گیری سے تنگ آکر رعایا نے پیہم شکایات کیں اور سید عبداللہ خاں نے اسے الگ کردیا۔ دہلی واپس جاکر اس نے رتن چند کے توسل سے عبداللہ خاں کے ساتھ تعلقات پیدا کیے اور تھوڑی مدت میں دونوں کے درمیان گہری دوستی ہوگئی۔ نیکو سیر کے خلاف قلعہ آگرہ کے محاصرہ میں اس نے نمایاں خدمات انجام دیں جس سے حسین علی خاں اس پر مہربان ہوگیا اور بعد میں اسے گردھر بہادر کے خلاف الہ آباد کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ الہ آباد سے واپسی پر حسین علی خاں نے اس کو ۵۰ ہزار روپیہ انعام دلوایا پہلے سے بھی زیادہ اس پر مہربانیاں کیں اور آگرہ سے روانہ ہوتے وقت اسے میر آتش (توپخانہ کا افسر اعلیٰ) مقرر کیا۔ بہ ظاہر دونوں سیدوں کا بڑا خیر خواہ بنا ہوا تھا۔ حسین علی خاں بھی اس کی قابلیت اور بہادری کی بڑی تعریفیں کرتا تھا لیکن یہ شخص "فطرتاً" بے وفا اور خود غرض تھا۔ اس نے بیک وقت محمد امین خاں اور حسین علیخاں دونوں سے تعلقات رکھے محمد امین کے قتل کی سازش میں وہ حسین علیخاں کیساتھ تھا اور حسین علی کے قتل کی سازش میں محمد امین خاں کیساتھ دونوں کو اس نے ایک دوسرے کے راز کی خبر نہ دی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جو فریق بھی غالب ہوگا اسکی دوستی سے مجھے بہر حال فائدہ ہوگا۔

(۳) میر حیدر کاشغری مغل فوج کا ایک سردار تھا۔ اس کو محمد امین خان نے صرف اس کی بے دھڑک بہادری کی خاطر راز میں شریک کیا تھا اور حسین علیخاں کے قتل کا کام اسی سے لینا مقصود تھا۔

(۴) شاہ عبدالغفور سندھ کا ایک فقیر تھا۔ مشہور تھا کہ جن اور ارواح اس کے تابع ہیں اور اس کو غیب کی خبریں دیتے ہیں۔ اسی سبیل سے اس نے شاہی محل سرا کے خدام اور خواجہ سراؤں اور خدمتگار عورتوں پر اپنا اثر قائم کیا اور رفتہ رفتہ خود محمد شاہ کی ماں نواب قدسیہ اور صدر النساء کو بھی اپنی سازش میں شریک کیا تاکہ ان کے اثر سے محمد شاہ دونوں سیدوں کی مخالفت پر ثابت قدم رہے۔

ان پانچوں آدمیوں نے باہم بحث و پز کرنے کے بعد حسین علی کو جلدی سے جلدی قتل کر دینے کا عزم کر لیا اور میر حیدر اس کام کے لیے نامزد کیا گیا۔ ۶ ذوالحجہ ۱۱۳۲ھ ۸ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو جب کہ شاہی کیمپ فتح پور سیکری سے ۳۵ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ حسین علی خاں بادشاہ کے پاس سے اٹھ کر اپنے خیمہ کی طرف روانہ ہوا۔ میر حیدر کاشغری نے راستہ میں اس کی پالکی روک ایک درخواست پیش کی۔ حسین علی خاں اسے لے کر پڑھنے لگا اور میر حیدر نے دفعۃً اپنا پیش قبض نکال کر اس کے پیٹ میں بھونک دیا۔ مغل سپاہی ساتھ لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے نہایت تیز دستی کے ساتھ حسین علی خاں کا سر کاٹ کر حیدر قلی خاں کی راوٹی میں پہنچایا اور وہاں سے محمد امین خاں اور حیدر قلی خاں اسے لیکر بادشاہ کے پاس دوڑے۔ بادشاہ ڈر کر محلسرا میں چھپ گیا مگر سعادت خاں منہ پر کپڑا ڈال کر اندر گھسا اور بادشاہ کو گود میں اٹھا کر باہر لے آیا۔ یہاں قمر الدین خاں کا ہاتھی موجود تھا۔ محمد امین خاں بادشاہ کو لیکر اس پر سوار ہوا۔ عماری کے پیچھے ایک لمبے بانس پر حسین علیخاں کا سر بندھوا دیا اور لوگوں کی توجہ دوسری طرف پھیرنے کیلئے فوج میں اعلان عام کر دیا کہ حسین علیخاں کا مال و اسباب اور خزانہ لوٹ لیا جائے۔ دولت کے حریص سپاہی یہ سنتے ہی میر بخشی کے قتل کو بھول کر اس کی لوٹ پر ٹوٹ پڑے اور دوسری طرف حیدر قلی خاں نے اس کو لشکر پر گولہ باری شروع کر دی۔

سادات بارہہ میں سب سے پہلے یہ خبر حسین علی خاں کے بھانجے سید غیرت خاں کو پہنچی۔ وہ اسے سنتے ہی فوراً ہتھیار سنبھال کر اور چالیس پچاس آدمی جو بر وقت موجود تھے، ساتھ لے کر سخت

جوش کی حالت میں اس مقام کی طرف لپکے جہاں بادشاہ اور محمد امین خاں وغیرہ کھڑے تھے مگر یہاں اس کی تواضع بندوق سے کی گئی جس نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اسی طرح سیدوں کے حامیوں اور عزیزوں سے جو جو اس خبر کو سنتا گیا وہ بغیر کسی تیاری کے دوڑ کر آتا گیا اور بآسانی ہر ایک کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے باہم مل کر فوج کو جمع کرنے اور ایک منظم حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور نرے جوش بہادری میں جس کے اندر عقل و خرد کا شائبہ بھی نہ تھا، اپنی جانیں گنوا دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین علی خاں کی عظیم الشان فوج جس کے اندر کوئی لیڈر باقی نہ رہا تھا، چند گھنٹوں کے اندر منتشر ہو گئی۔ اس کا سازو سامان خیمہ و خرگاہ اور مال و زر جو بادشاہ سے ٹکر کھاتا تھا اس طرح لٹ گیا کہ اس کا نشان تک نہ رہا۔ عامۂ خلائق جن کے دلوں میں حسین علی خاں سے نفرت بیٹھی ہوئی تھی، اس اچانک زوال کو دیکھ کر قابو میں نہ رہے۔ انہوں نے اس کی لاش کی سخت بے حرمتی کی۔ اس کا جنازہ اٹھانے کے لیے آدمی تک نہ ملے۔ محمد امین خاں نے چند آدمیوں کو فراہم کر کے اسے اجمیر کی طرف روانہ کیا مگر وہ راستے میں اسے پھینک کر چلے اور کچھ عرصہ بعد علاقہ کے فوجدار نے اسے اٹھوا کر اجمیر بھجوایا۔ رتن چند اس سے بھی زیادہ لوگوں کی نفرت کا مرکز تھا۔ وہ جب گرفتار ہو کر محمد امین خاں کے پاس جا رہا تھا، لوگوں نے اسے پالکی میں سے کھینچ لیا اور مار مار کر اس کا برا حال کر دیا حتیٰ کہ جسم پر کپڑے کا ایک تار تک باقی نہ رہا۔

عبداللہ خاں کی سعی انتقام اور ناکامی

عبداللہ خاں ابھی راستہ میں تھا کہ اسے رتن چند کا دو حرفی پرچہ ملا جس میں حسین علی خاں کے قتل کی اطلاع دی گئی تھی۔ بعض جوشیلے سیدوں نے رائے دی کہ اسی وقت چل کر مقتول سید کا بدلہ لیا جائے مگر اس نے بے سرو سامانی کی حالت میں لڑنا مناسب نہ سمجھا

اور یہ رائے قائم کی کہ فوراً دہلی جاکر تیموری خاندان کے ایک دوسرے شاہزادے کو تخت پر بٹھایا جائے اور فوج فراہم کر کے محمد شاہ سے جنگ کیجائے۔ اس نے فوراً اپنے بھائی نجم الدین علی خاں صوبہ دار دہلی کو حکم بھیجا کہ کسی شاہزادے کو انتخاب کر کے تخت پر بٹھادو۔ اس حکم کے مطابق ۱۵ ذی الحجہ کو دہلی میں رفیع الشان ابن شاہ عالم بہادر شاہ کا سب سے بڑا بیٹا ابوالفتح ظہیر الدین محمد ابراہیم کے لقب سے تخت نشین کردیا گیا۔ اس کے دو دن بعد عبداللہ دہلی پہنچا اور اس نے فوج فراہم کرنے کے لیئے بے دریغ روپیہ بہانا شروع کردیا۔ چند روز میں ایک کروڑ روپیہ کے صرف سے ۹۰ ہزار فوج فراہم کی گئی جس میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو صرف روپیہ کمانے کے لیے بھرتی ہوگئے تھے۔ عبداللہ خاں نے ان لوگوں کو تین تین مہینے کی پیشگی تنخواہیں دے دیں جنہیں وصول کرنے کے بعد بہت سے رنگروٹ بھاگ گئے اور جو پرانے تجربہ کار سپاہی تھے وہ اس بنا پر دل شکستہ ہوئے کہ انہیں بھی نئے رنگروٹوں کے برابر تنخواہیں ملی تھیں۔ اس سے زیادہ غلطی اس نے یہ کی کہ توپخانہ فراہم کرنے کی کوشش نہ کی حالانکہ اس کا مقابلہ حیدر قلی خاں جیسے ماہر فن میر آتش سے تھا جس کے پاس ۱۶۰ سو چھوٹی بڑی توپیں تھیں۔ غرض اس غیر دانشمندانہ تیاری کیساتھ عبداللہ خاں محرم ۱۱۳۳ھ یکم نومبر ۱۷۲۰ء کو دہلی سے ابراہیم شاہ کو ساتھ لیکر محمد شاہ کے مقابلہ کیلئے روانہ ہوا مگر بھائی کی موت کے رنج اور اپنے اقتدار کے زوال سے اس کی دماغی حالت اس قدر بگڑی ہوئی تھی کہ کہنا کچھ چاہتا تھا اور زبان سے کچھ نکلتا تھا۔ قریب قریب یہی حالت سادات بارھہ کے اکثر سرداروں کی تھی ایسی حالت میں محمد امین خاں اور حیدر قلی خاں جیسے آزمودہ کار سپہ سالاروں سے جنگ کرنیکا انجام ظاہر تھا۔

ادھر سے محمد شاہ حسین علی خاں کا سر اور مبارکباد کا خط نظام الملک کو بھیج کر ۹ ذی الحجہ کو دہلی کی جانب روانہ ہوا اور ۱۲ محرم ۱۱۳۳ھ کو حسن پور کے قریب دہلی سے ۲۰ کوس کے فاصلہ پر

عبداللہ خاں کے سامنے جا پہنچا۔ محمد شاہ کی فوج عبداللہ خاں کے مقابلہ میں نصف سے کم
قریب تھی مگر ادھر بہادری کے ساتھ جوش دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور ادھر بہادری
کے ساتھ ٹھنڈے دماغ اور جنچے تلے فیصلے کام کر رہے تھے۔ ۱۳ اور ۱۴ محرم کو ان دونوں قوتوں
کا مقابلہ ہوا جس میں حیدر قلی خاں کے توپخانہ نے عبداللہ خاں کی فوج کو پارہ پارہ کر دیا اس
کے سپاہی جن میں سے اکثر نے پہلی مرتبہ میدان جنگ کی صورت دیکھی تھی اسے چھوڑ کر بھاگ
گئے۔ مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ وہ آخر وقت تک لڑتا رہا اور زخمی ہونے کے بعد گرفتار کر
لیا گیا[1]۔ اس طرح سادات بارھہ کی اس زبردست طاقت کا خاتمہ ہو گیا جس کے ہاتھ میں آٹھ
برس تک ہندوستان کا تخت بازیچہ بنا ہوا تھا۔ جب تک وہ برسر اقتدار رہے ہزاروں لاکھوں
گردنیں ان کے سامنے جھکتی رہیں اور جب ان کا ستارہ غروب ہو گیا تو وہ لوگ بھی جن پر
ان کے بڑے بڑے احسانات تھے انہیں "نمک حرام" کہنے لگے۔ اس فعل سے اگر کوئی مستثنیٰ
تھا تو وہ وہی نظام الملک تھا جسے انہوں نے تباہ کرنے کی کوشش میں اپنی جان دے دی۔
اس شخص نے محمد شاہ کے حکم سے بھی دونوں سیدوں کو "نمک حرام" کہنا اور ان پر لعنت کرنا
قبول نہ کیا۔

محمد شاہ کے نئے ارکانِ سلطنت

سیدوں کے استبداد سے آزاد ہوتے ہی محمد شاہ نے ان سب لوگوں کو بڑے عہدے

---

[1] عبداللہ خاں کی بقیہ زندگی قید میں گذری اور آخر کار محرم ۱۱۳۵ھ اکتوبر ۱۷۲۲ء میں اسے
زہر دے دیا گیا۔ نظام الملک اس زمانہ میں وزیر تھے۔ انہوں نے اس کی جان بچانے کی پوری کوشش کی
مگر مغلوں میں عام طور پر یہ خیال تھا کہ اگر عبداللہ خاں زندہ رہا تو پھر کوئی فتنہ ضرور اٹھے گا۔

خطابات اور مناصب عطا کیے جو انکے خلاف، سازش میں شریک تھے محمد امین خاں کو ہشت ہزاری منصب اور وزیر اعظم کا عہدہ دیا۔ اسکے بیٹے قمر الدین خاں کو ہفت ہزاری منصب اور بخشی دوم کا عہدہ عطا کیا خاں دوراں خواجہ عاصم کو حسین علیخان کی جگہ امیر الامرا کا خطاب اور میر بخشی کا عہدہ عطا کیا ظفر خاں کو روشن الدولہ کا خطاب اور بخشی سوم کا عہدہ دیا حیدر قلی خاں کو معز الدولہ ناصر جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب دیا اور میر آتش کیا نیز گجرات کی صوبہ داری پر بھی مقرر کر دیا۔ سعادت خاں کو ہفت ہزاری منصب اور برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا کیا اور صوبۂ آگرہ کی حکومت دی اسطرح وہ لوگ منظرِ عام پر آئے جو محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان کی بساطِ سیاست کے اصلی مہرے تھے۔

دکن میں مرہٹوں سے نظام کے معاملات

حسین علی خاں کے قتل کے بعد ہی نظام الملک کو دکن سے طلبی کا فرمان بھیج دیا گیا مگر انہوں نے کئی وجوہ سے عذر کر دیا۔ سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے محمد امین خاں کو وزارت کا عہدہ دیدیا تھا حالانکہ سیدوں کا مقابلہ کرنے سے پہلے نظام الملک سے اس کا حتمی وعدہ کیا گیا تھا یہ بدعہدی نظام الملک کے لیے سخت آزرگی کی موجب ہوئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ محمد امین خاں کی موجودگی میں وہ دہلی جانا پسند نہ کرتے تھے کیونکہ اب دونوں کی شخصیتیں برابر کی ٹکر ہو گئی تھیں۔ اور نظام الملک کو اندیشہ تھا کہ خاندانی تعلقات اور قدیم روابطِ محبت بھی اس رقابت کو راہ پانے سے نہ روک سکیں گے جو دو مساوی شخصیت و اقتدار رکھنے والے لوگوں کے یکجا موجود ہونے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ خود دکن کے حالات اسقدر خراب ہو چکے تھے کہ نظام الملک کو ان کی اصلاح کے لیے اپنی پوری قوت صرف کرنے کی ضرورت تھی۔ حسین علی کے معاہدہ نے دکن میں مرہٹوں کی ہمت و جرات کو حیاتِ تازہ بخش دی تھی۔ وہ شاہی فرمان کی بنا پر ہر علاقہ سے چوتھ اور سردیس مکھی وصول کرنے کا اپنے آپ کو مجاز سمجھنے لگے تھے اور جس علاقہ پر ایک

دفعہ ان کا ہاتھ دراز ہو جاتا تھا اس پر ہمیشہ کے لیے ان کا حق قائم ہو جاتا تھا۔ مختلف مرہٹہ سردار مختلف بادشاہی صوبوں میں چوتھ اور سردیس مکھی وصول کرنے کے لیے فوجیں لے لے کر پہنچ گئے تھے۔ بالاجی وشوا ناتھ نے خاندیس اور برار بالا گھاٹ کو سنبھال لیا۔ کنہوجی بھونسلے برار پائیں گھاٹ میں بھیجا گیا۔ اور اسے گونڈوانہ اور تمام مشرقی علاقوں سے "خراج" وصول کرنے کا اختیار دیا گیا۔ فتح سنگھ بھونسلے کرناٹک کی طرف مامور کیا گیا۔ پرتی ندھی حیدر آباد اور بیدر کے صوبوں میں مقرر کیا گیا۔ سر لشکر اورنگ آباد کے صوبہ میں متعین کیا گیا اور سیناپتی بگلانہ اور گجرات کی طرف بھیج دیا گیا۔ حسین علی خاں کے دکن سے واپس جانے کے بعد عالم علی خاں نائب صوبہ دار ہوا جو ایک بیس برس کا ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ وہ ان لوگوں کو قابو میں نہ رکھ سکا اور تھوڑی مدت کے اندر ہر صوبہ میں مرہٹہ راجہ کے نائب نے وہی حیثیت اختیار کر لی جو خود بادشاہ کے نائب یعنی صوبہ دار کی حیثیت تھی۔ بلکہ بادشاہ کا نائب اس کے سامنے عملاً بے اختیار ہو گیا اور اس کی حکومت آزاد بلگرامی کے بقول "نام کی حکومت سے زیادہ نہ رہی"۔ اس حالت کو خود نواب نظام الملک نے صمصام الدولہ خاں دوراں کے نام ایک خط میں اس طرح بیان کیا ہے :۔

"بحال داشتنِ وضعِ مصالحت کہ کور نمک با کفارِ دکن نمودہ باقتضائے مصلحتِ وقت و مفقود بودنِ سر انجامِ صیانتِ قلاع و حراستِ ملک و استیصال کفرہ، ناچار بعمل آمدہ۔ شکستنِ ایں طلسم پیش از امدادِ مبلغ معتدبہ از حضور و میسر شدنِ خزانہ و سپاہ فراواں و پذیرائی مطالب کہ مکرر بقلم آمدہ و تا حال اثرے ازاں پیدا نیست، خلاف عقل و دور از صلاح بود، لہٰذا مسلّم داشتہ شد۔ لیکن رو سامی ایں طائفۂ ضالہ تسلط و

ضبطے کہ باید بر توابع ندارند، ازیں جہت جمع از دائرہ سخن شنوی ایں ہا بدرجستہ باطراف منتشر می شوند و بدستورِ قدیم غبارِ فتنہ بلند می کنند۔ مکرر تاکیدات بروساے جنہم مادای ایں جماعہ بعمل آمدہ۔ لیکن نظر بر عدم ضبط بے اختیار اند۔ بہر حال بے اعانتِ نقد از حضور و پذیرا گشتن مطالب ضروری کہ بکرات نوشتہ شد غیر ازیں کہ علاج بلادارو ئے بایں گروہ کہ مثل خون فاسد دررگ و ریشۂ ایں صوبہ جا دادہ کردہ شود، چارہ و تدبیرے نیست "۔ درقعات موسوی خاں)

ان حالات میں جنگ بالا پور کے بعد نظام الملک اورنگ آباد پہنچے (شوال ۱۱۳۲ھ ۲۰ء۱۷) تو انہوں نے محسوس کیا کہ اگر مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے زور کو جلدی سے جلدی نہ روکا گیا تو دکن کا صوبہ بالکل ہی ہاتھ سے جائے گا۔ اتفاقاً اس کے تھوڑی ہی مدت بعد بالاجی وشوانا تھ مر گیا۔ (اکتوبر ۱۷۲۰ء اوائل ۱۱۳۳ھ) اور اس کے بیٹے باجی راؤ، نئے پیشوا کو مرہٹہ راج کے معاملات سنبھالنے میں دیر لگی۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر نظام الملک نے پھر کولہاپور کے راجہ سنبھاجی سے اپنے قدیم تعلقات تازہ کرنے شروع کیے دوسری طرف چندر سین جادو کو جسے حسین علی خاں نے دبا دیا تھا از سر نو قوت پہنچائی اور اس دوران میں ساہو کے وکیل کو جو نئے صوبہ دار سے سابق صوبہ دار کی عطا کردہ مراعات تسلیم کرانے آیا تھا دم دلاسے دے کر ٹالتے رہے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ ساہو سے براہِ راست جھگڑا کرنے کے بجائے خود مرہٹوں میں سے دو طاقتور حریفوں کو اس کے مقابلہ میں کھڑا کر دیں اور پھر اپنی قوت کو ایک ثالث کی حیثیت سے استعمال کریں۔ چنانچہ جب ان کا یہ منصوبہ مکمل ہو گیا تو انہوں نے سنبھاجی اور چندر سین کے دعاوی کی بنا پر راجہ ساہو کے اس فعل کو سختی کے ساتھ قابل اعتراض قرار دیا کہ وہ شاہی علاقوں میں اپنے

تحصیل دار مقرر کر کے تنہا خود ہی چوتھ اور سردیسکھی وصول کر رہا ہے۔ باجی راؤ نے اس کے جواب میں جنگ کی تیاری شروع کر دی اور صوبہ اورنگ آباد کی سرحد پر مرہٹہ افواج کا اجتماع ہونے لگا۔ یہ قضیہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا اور نظام الملک کسی زبردست جوابی کارروائی کی فکر میں تھے کہ دہلی سے ان کے نام شاہی فرمان آ گیا جس میں انہیں وزارت عظمیٰ کی خدمت کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ اپنے بعد انہیں کوئی شخص ایسا نظر نہ آتا تھا جو ان کی پالیسی کو کامیابی کے ساتھ چلا سکتا۔ اس لیے ناچار انہوں نے باجی راؤ کے مطالبات قبول کر لیے۔

نظام الملک کی وزارت

محمد امین خاں سابق وزیر اعظم عبداللہ خاں کی شکست کے بعد دو تین مہینہ سے زیادہ وزارت کا لطف نہ اٹھا سکا اور ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ جنوری ۱۷۲۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وزارت کے لیے اس کے بیٹے قمر الدین خاں اور خاں دوراں خواجہ عاصم کے درمیان کچھ عرصہ تک کش مکش رہی آخر کار اس بات پر تصفیہ ہوا کہ وزارت دونوں میں سے کسی کو نہ دی جائے بلکہ اس عہدہ کے لیے نظام الملک کو دکن سے بلایا جائے ادھر خود نظام الملک نے بھی محمد امین خاں ناظم بیوتات کو لکھا اور اس میں بادشاہ کی بد عہدی اور اپنی سابق حق تلفی کی شکایت کر کے وزارت کے لیے اپنا دعویٰ پیش کیا۔ اس خط کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"زمانِ صوبہ داریٔ مالوہ نوشتہ جاتِ حضور متواتر می رسید کہ خاطر اشرف خواہانِ استیصالِ معاندانِ فساد پیشہ است، و بارہا فرمودہ اند کہ درصورتِ التزامِ ایں امر وزارت را بوجود مفوض شناسند۔ چنانچہ دریں باب فرمانِ والا شان بخطِ خاص

شرفِ صدور یافت۔ الحمد للہ والمنہ کہ نظر بر مرضی مبارک پروای جان و مال و صرفہ عیال و اطفال نہ کردہ، دست از خان و مان کشیدہ ہنگامے کہ ہیچ کس در اقدام بایں امر خطیر رفاقت ما ہم قبول نمی کرد، متوکلاً علی اللہ المستعان کمر ہمت و عزم بستہ با عادی کہ بکثرت و انبوہ تمام با توپہای کلاں و توپ خانہ فراوان معرکہ آرای قتال شدند و داد جلادت و مردانگی دادند، محاربات عظیم رو داد بفضل الٰہی و اقبال پادشاہی فتوحات پے در پے نصیب شد۔ التزام شدائد کہ دریں مہم اہم بعمل آمدہ زیادہ از حوصلہ بشری است۔ بعد ازیں ہمہ ترددات و مجادلات، رعب و صولت آنہا کہ در دلہا جا کردہ بود بر طرف شدہ و فرد وقع آنہا یک قلم از نظر ہا رفتہ جمعیت مخالفان از ہم پاشید و تفرقہ کلی در آنہا راہ یافتہ بنات النعش شدند تا آنکہ بسعی اعتماد الدولہ مرحوم قتل حسین علی خاں صورت بست و قطب الملک بے دست و پا گشتہ مثل مرغ بے پر و بال بریسمانِ کشیدنی بدام آمد و عرصہ سلطنت صفائی اتم پذیرفت و منظور ازیں ہمہ جانبازیہا حصول ثمرات و ایفای عہد امر وزارت بود کہ از شا و وفاء للعہد حق ماست۔ نظر بر ایفائی عہد و میثاقِ مرقوم ضرور بود کہ اعتماد الدولہ مغفور اقدام بقبول وزارت نمی نمودند خوب باقتضای بشریت بے مروت و خلفت وعدہ کہ بنا بسبب از ایشاں بعمل آمد اگرچہ ایں تخلف دراں وقت ہم مکروہ طبع بود لیکن نظر بر قرابت گویا بما بود و ازیں سبب خاطر نیز فی الجملہ اطمینان داشت۔ الحال کہ ایشاں از میاں رفتہ اند، امر مرقوم کہ ارفع امور است اگر بدیگرے منتقل گردد بر طبیعت زیادہ از انچہ در حوصلہ تحریر گنجد گراں و ناگوار خواہد بود و اختیار نوکری ہم گوارا نخواہد شد۔ بالفعل برای تجدید نسق بر ہم خوردہ دکن بضرورت توقف رو دادہ و برای انتظام مہام صوبہ دار الظفر بیجاپور فوج فیروزی قریب بادونی رسیدہ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب فراغ حاصل نمودہ بحضور پر نور رسیدہ می شود تا آں وقت عنایت اللہ

خاں یا شخص دیگر کہ بخاطر اقدس رسد، نیابت ما سرانجام دہد" درقعات موسوی خاں)

اس خط نے وزارت کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ کر دیا۔ نظام الملک کے نام فوراً وزارت پر تقرر کا فرمان بھیجا گیا اور خود انہی کی تجویز کے مطابق ان کے آنے تک عنایت اللہ خاں کشمیری کو دجو فرخ سیر کے زمانہ میں دیوانِ خالصہ وتن تھا اور اب خانسامانی کا عہدہ رکھتا تھا) نائب وزیر کی حیثیت سے خدماتِ وزارت انجام دینے کے لیے مقرر کر دیا گیا۔

نظام الملک کو شاہی فرمان اس وقت ملا جبکہ وہ کرناٹک کے افغان سرداروں کو مطیع کرنے کے لیے ادھونی گئے ہوئے تھے، اسی وقت اورنگ آباد واپس ہوئے۔ اپنے پھوپھا عضد الدولہ قسورہ جنگ[1] کو نائب صوبہ دار کی حیثیت سے مامور کر کے ذوالحجہ ۱۱۳۳ھ اکتوبر ۱۷۲۱ء میں دہلی کی جانب روانہ ہوئے اور ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ فروری ۱۷۲۲ء میں دہلی پہنچ کر ۵۲ برس کی عمر میں خلعت وزارت پہنا۔

نظام الملک کا وزارت پر فائز ہونا سلطنتِ مغلیہ کے لیے ایک ایسا اچھا موقع تھا کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو یقیناً سلطنت میں از سرِ نو ایک جان پڑ جاتی اور اس کے مائل بہ انتشار اجزا میں پھر ایک پختہ اتصال پیدا ہو جاتا۔ ایک اعلیٰ درجہ کے قائد

---

[1] اصلی نام خواجہ کمال تھا۔ نظام الملک کی حقیقی پھوپھی اس سے منسوب تھیں، عالمگیر کے زمانہ میں توران سے ہندوستان آیا اور غازی الدین خاں فیروز جنگ کے توسط سے صوبہ حیدر آباد میں شاہی خدمات پر مقرر کیا گیا۔ عالمگیر نے اس کو عوض خاں کا خطاب دیا تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں اس کو برار کی صوبہ داری دی گئی جس پر وہ محمد شاہ کے زمانہ تک رہا۔ عالم علی خاں کو شکست دینے کے بعد جب نظام الملک اورنگ آباد پہنچے تو انہوں نے اسے پنج ہزاری منصب اور

مدبر اور منتظم ہونے کی حیثیت سے امرائے دولت میں صرف انہی کی ذات ایسی باقی رہ گئی تھی جو بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے اور مرکزی اقتدار کے روز افزوں انحطاط کو سنبھال لینے کی قوت رکھتی تھی۔ ملک میں ان کے حسن تدبیر اور زور شمشیر کی جیسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کی وزارت کا اعلان ہوتے ہی اجیت سنگھ راٹھور والی جودھ پور نے جو بادشاہ گر سیدوں کا زبردست حامی تھا اور جس نے سیّدوں کے زوال پر علی الاعلان بغاوت کر کے اجمیر اور گجرات کے صوبوں میں شاہی اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، محمد شاہ کی اطاعت قبول کر لی حالانکہ خاں دوراں، حیدر قلی خاں اور قمر الدین خاں، اعتماد الدولہ وغیرہ امرا اس کے مقابلہ سے عاجز ہو چکے تھے اور اس کی غارت گر فوجیں دہلی سے ۱۶ میل کے فاصلہ پر الہ ویردی خاں کی سرا تک چھاپے مارتی ہوئی پہنچ گئی تھیں۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام الملک کی وزارت میں سلطنت کی مرکزیت اور اس کی گرفت کو مضبوط کرنے کی زبردست قوت موجود تھی مگر محض قوت کا موجود ہونا مفید نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ اس کو کام کرنے کا موقع نہ دیا جاتا اور یہ بہت جلدی ثابت ہو گیا کہ محمد شاہ اور اس کے ارکان دولت نئے وزیر اعظم کی قابلیتوں کو سمجھنے کی نہ صلاحیت رکھتے تھے اور نہ ان کو عمل کرنے کا کوئی موقع دینا چاہتے تھے۔

بادشاہ اور وزیر میں اختلاف

محمد شاہ کا نیا وزیر اعظم ایک ایسا شخص تھا جس نے عالمگیر اعظم کے دامن تربیت میں آنکھیں

---

* عضد الدولہ قسورہ جنگ کا خطاب دلوایا۔ اورنگ آباد کی مسجد شاہ گنج اسی کی بنوائی ہوئی ہے اس مسجد کے آگے جو عظیم الشان حوض ہے اس کی تعمیر حسین علی خاں نے شروع کی تھی مگر توسیع و تکمیل عوض خاں نے کی۔ غالباً سرزمین ہند میں کسی مسجد کا حوض بھی اتنا بڑا نہیں ہے۔

کھولیں تھیں جس کی نگاہ میں سیاست وحکومت اور بادشاہی وفرمانروائی کا نمونہ عالمگیر کی ذات تھی۔ وہ ہندوستان کے تخت پر ایک ایسے شخص کو دیکھنا چاہتا تھا جو شاہانہ تجمل و وقار، بردباری وتحمل، حفظِ آداب و مراتب، تہذیبِ اخلاق وتادیبِ اتباع، ضبطِ اوقات وفصلِ معاملات میں عالمگیر کا صحیح جانشین ہو۔ اس کی خواہش تھی کہ بادشاہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ سلطنت کے کاموں پر صرف کرے۔ حکومت کے معاملہ میں شخصی رعایات سے کام نہ لے، قابل اور اہل لوگوں کو عہدوں پر مقرر کرے۔ امارت، خطابات اور مناصب ایسے لوگوں کو دے جو ان چیزوں کی اہلیت رکھتے ہوں اور اپنی اندرونی اور بیرونی معاشرت میں اس متانت وپاکیزگی کو اختیار کرے جو شاہانہ عزت وحرمت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے لیکن اس قسم کے خیالات رکھنے والے وزیر کو ایک ایسے نوعمر بادشاہ کے ساتھ واسطہ پڑا تھا جو رنگیلا[1]، عیش پرست، ہنسوڑا اور لہولعب کا دلدادہ تھا۔ وہ "خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است" کا قائل تھا۔ حکومت وسیاست کے خشک مسائل سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ اس کی نگاہ میں وہ شخص ہر عنایت اور ہر مرتبہ و عزت کا مستحق تھا جو اسے خوش کر سکے، ہنسا سکے اور اس کی دلچسپیوں کا سامان فراہم کر سکے۔ وہ قابلیت واہلیت کو پرکھنے کی کوئی کسوٹی اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کی لذت کے سوا نہ رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالمگیر کے زمانہ کا نظام الملک بہت دقیانوسی قدامت پسند اور فرسودہ خیالات کا آدمی تھا جس کی باتیں مضحکہ انگیز، جس کی تجویزیں حماقت آمیز

[1] اس لفظ سے محمد شاہ کی سیرت کو ایسی قریبی مناسبت تھی کہ دلی والوں میں آج تک وہ محمد شاہ رنگیلے کے نام سے مشہور ہے۔

اور جس کی رائیں نا قابل توجہ تھیں۔ نوجوان بادشاہ کے اس رنگِ طبیعت کو دیکھ کر اس کے گرد ایسے لوگ فراہم ہو گئے تھے جنہوں نے اپنی خوشامد، فریب کاری اور مصاحبت کے سبب سے اس کے مزاج میں دخل پا لیا تھا۔ یہ لوگ اس کی دل چسپیوں، اس کے مشاغل، اس کے کھیل کود میں شریک ہوتے، ہر ممکن طریقہ سے اس کو خوش کرتے اور اس کے تقرب سے فائدہ اٹھا کر رعایا کو لوٹتے، رشوتیں لیتے اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدے اور مناصب فروخت کرتے تھے۔ ان میں ایک شخص بھی اپنی سیرت، قابلیت اور ذہنیت کے لحاظ سے اس کا اہل نہ تھا کہ شاہی دربار میں جگہ پاتا۔ لیکن بادشاہ کی رنگین مزاجی، سفلہ نوازی، خوشامد پسندی اور سب سے زیادہ مردم ناشناسی کی بدولت انہیں مراتب اور مناصب ملے، شاہی تقرب حاصل ہوا اور مملکت ہند کا حل و عقد ان کے ہاتھوں میں آ گیا۔ ان لوگوں کی ذاتی اغراض کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ اور کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ نظام الملک جیسا شخص دربار میں رہے اور بادشاہ پر اس کا اثر قائم ہو۔ اس لیے انہوں نے نظام الملک کی مخالفت اور بادشاہ کو ان سے برگشتہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ایسی ایسی حرکات کیں جن سے خود نظام الملک دل برداشتہ ہو گئے۔

محمد شاہ کے دوستوں کی حالت

محمد شاہ کے ان مقربین بارگاہ کا بھی تھوڑا سا تعارف کرا دینا ضروری ہے۔ ان میں سب سے زیادہ با اثر رحیم النساء نامی ایک عورت جان محمد درویش کی لڑکی تھی، نہایت ہوشیار، چالاک، پڑھی لکھی اور محلات کے آداب سے واقف، امراء کے ہاں اپنے باپ کی غیب دانی کا چرچا کرتی پھرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا شہرہ قلعہ معلّیٰ تک بھی پہنچا اور محمد شاہ کی ماں سے جب کہ وہ اور محمد شاہ دونوں سلیم گڑھ میں نظر بند تھے،

اس کا تعارف ہو گیا۔ جان محمد کی چند پیش گوئیاں اس کے حق میں صحیح نکلیں جن سے وہ اس کی معتقد ہو گئی اور رحیم النسا کی چرب زبانی نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ خود محمد شاہ کو اس سے محبت ہو گئی اور ماں بیٹوں نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے مشہور کر دیا کہ وہ محمد شاہ کی دودھ شریک بہن ہے۔ اس وقت سے وہ کوکی جیو کہلانے لگی۔ سیدوں کے زوال کے بعد جب سلطنت کے اختیارات محمد شاہ کے ہاتھ میں آئے تو یہ اس پر اتنی حاوی ہو گئی کہ اس نے شاہی مہر اس کے حوالہ کر دی اور اسے اختیار دے دیا کہ سرکاری کاغذات پر بادشاہ کی نائب کی حیثیت سے مہر کر دیا کرے۔ بڑے بڑے امرا، فوجدار، دیوان اور صوبہ دار اس کے دروازے پر پہنچتے اور اس کو رشوتیں دے کر اپنے تقرر کے فرامین حاصل کرتے تھے جاگیر، منصب، ترقی، تقرر غرض ہر چیز کے فرامین اس کے ہاتھ سے نکلتے اور وہ ہر فرمان کی قیمت وصول کر لیتی۔ محمد خاں بنگش کا بیان ہے کہ مالوہ کی صوبہ داری کا فرمان حاصل کرنے کے لیے اسے کوکی جیو کو ایک لاکھ روپے دینے پڑے تھے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کاروبار اس کے ہاتھ میں کس قدر ترقی پر تھا۔ آخر میں صمصام الدولہ خاں دوراں کی سازش سے اس کو زوال نصیب ہوا۔

ایک دوسرا شخص شاہ عبدالغفور تھا جس کا ذکر حسین علی خاں کے قتل کی سازش کے سلسلہ میں ہو چکا ہے اس نے اور کوکی جیو نے باہم ایک دوسرے کی تائید کا عہد کر لیا تھا۔ کوکی حرم سرا میں اس کی ولایت و خدا رسیدگی کے چرچے کرتی اور یہ کوکی کے باپ کی غیب دانی پر شہادت دیتا۔ اس طریقہ سے محمد شاہ اور اس کی ماں پر اس کا گہرا اثر قائم ہو گیا اور ۱۲ سال تک یہ سلطنت کے معاملات پر ایسا حاوی رہا کہ اس کے سامنے وزیر کی بھی کوئی حقیقت نہ تھی بلکہ بادشاہ تک کے احکام اس کے مقابلہ میں

نہیں چل سکتے تھے۔ کوکی کے معاملات میں یہ اس کا ساتھی اور رشوتوں میں اس کا حصہ دار تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس طریقہ سے اس کو ۵ ہزار روپیہ روزانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ محمد شاہ نے اس کو ٹکسال کا داروغہ بھی بنا دیا تھا جس کا حساب کتاب پوچھنے کی کوئی جرأت نہ کر سکتا تھا اور یہ اس میں بے حساب غبن کرتا تھا آخر میں جب حسابات کی جانچ کی گئی تو اس کے ذمہ ۶۰ لاکھ روپیہ واجب نکلا۔ اس ولی اللہ کی للہیت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک ملازم کو طلب کیا۔ معلوم ہوا کہ نماز پڑھ رہا ہے اس پر اس نے حکم دیا کہ جس حال میں ہو پکڑ لاؤ چنانچہ وہ حالت نماز ہی میں گھسیٹ لایا گیا اور اس ظالم نے اس سے کہا کہ "تیرا آقا جو تجھے روزی دیتا ہے عبدالغفور ہے اور وہ یہاں بیٹھا ہے، پھر تو کس کی نماز پڑھ رہا تھا؟" اس کا ایک بیٹا عبدالرحیم نامی تھا جسے محمد شاہ نے شش ہزاری منصب عطا کیا تھا۔ اس کی بدمستی و سرکشی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کسی کی جان اور عزت اس کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ بدمعاشوں کی ایک ٹولی ہر وقت اس کے ساتھ مسلح رہتی۔ کبھی وہ زنانہ لباس اور زیور پہن کر سڑکوں پر نکلتا، کبھی زرہ بکتر پہن کر پورا سپاہی بنا ہوا نکلتا، کبھی پاؤں میں گھونگھرو باندھ کر سر بازار ناچتا اور ان تمام حالتوں میں اس کے بدمعاش ساتھی لوگوں کے راستے روک دیتے تھے اور جو کوئی مزاحمت کرتا اسے قتل کر ڈالتے تھے۔ شریف عورتوں کی ڈولیاں اس کے محلہ سے گذرنی مشکل تھیں۔ وہ جس کی ڈولی چاہتا روک لیتا اور جو عورت اسے پسند آ جاتی وہ اپنی عصمت اس سے نہ بچا سکتی تھی۔ یہ محمد شاہ کا شش ہزاری منصب دار تھا حالانکہ کسی زمانہ میں وزراء اور نامور سپہ سالار اور بڑے بڑے والیان ریاست اس منصب کی تمنا کیا کرتے تھے۔

ظفر روشن الدولہ محمد شاہ کا یار غار اور نفس ناطقہ بنا ہوا تھا۔ اس شخص میں کسی

قسم کی علمی یا انتظامی یا فوجی قابلیت نہ تھی صرف مصاحبت، خوشامد اور چرب زبانی سے اس نے بادشاہ کے مزاج پر قابو پالیا تھا اور کوکی جیو سے بھی اس کا گہرا ساز باز تھا۔ ان اثرات سے اس کو خوب آمدنی ہوتی تھی اور وہ اس دولت کو چراغاں کرنے، عمارات اور مساجد بنانے اور بخشش و خیرات کرنے میں بے دریغ خرچ کرتا تھا جس سے عوام میں بھی اس کو شہرت حاصل ہو گئی تھی۔

ان لوگوں کے علاوہ برہان الملک، سعادت خاں، صمصام الدولہ، خاں دوراں اور حیدر قلی خاں[1] بھی، جن کی سیرت سے ناظرین پہلے روشناس ہو چکے ہیں، بادشاہ پر بہت اثر رکھتے تھے اور یہ سب اپنے مفاد کے لیے نظام الملک کے وجود کو نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ان میں سے حیدر قلی خاں سب سے زیادہ دیوانی و ملکی معاملات میں مداخلت کرتا تھا اور اپنے آپ کو وزیر سے کم نہ سمجھتا تھا۔ نظام الملک نے بمشکل محمد شاہ کو اس پر راضی کیا کہ اسے گجرات کی طرف رخصت کر دے، جہاں کی صوبہ داری پر اس سے پہلے وہ مقرر کیا جا چکا تھا۔

---

[1] پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حیدر قلی میر جملہ کے توسل سے نظام الملک کی پہلی صوبہ داری کے زمانہ میں دکن کا دیوان مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے کروڑیوں اور متصدیوں پر زیادتی شروع کر دی اور نظام الملک کے پاس اس کی پیہم شکایات آئیں۔ اس پر نظام الملک نے اس کو سختی کے ساتھ ڈانٹا اور حکم دے دیا کہ جب تک وہ اپنے کردار کی اصلاح نہ کرے سلام کے لیے حاضر نہ ہو۔ آخر کار یہ دل برداشتہ ہو کر دکن سے واپس چلا گیا۔ اسی وقت سے اس کے اور نظام الملک کے درمیان مخالفت چلی آ رہی تھی۔

اس مختصر تشریح سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمد شاہ کے گرد کس قسم کے آدمی جمع تھے اور نظام الملک سے ان کی مخالفت کے کیا اسباب تھے۔ نظام الملک نے کوشش کی کہ بادشاہ ان لوگوں کے دام سے نکلے اور ان لوگوں نے کوشش کی کہ بادشاہ خود نظام الملک کو دفع کر دے۔ آخر کار سلطنت کا دوست نظام الملک اپنے مقصد میں ناکام ہوا اور سلطنت کے دشمن اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

اصلاحات کیلئے نظام الملک کی تجاویز

سلطنت کے حالات کو درست کرنے کے لیے نظام الملک نے بادشاہ کے سامنے پہلی تجاویز جو پیش کیں وہ یہ تھیں:۔

(۱) عہدوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ بند کیا جائے اور عہدہ داروں کے تقرر پر پیش کش یا نذرانہ کے طور پر جو رشوت لی جاتی ہے اس کو موقوف کر دیا جائے۔

(۲) محالاتِ خالصہ میں سے بار آور اور زرخیز اراضی کو شاہزادوں، شہزادیوں اور امرا کی جاگیروں میں دینے کا طریقہ موقوف کیا جائے۔ اس طریقہ سے وہ بہترین زمین جو سلطنت کی آمدنی کا اصلی ذریعہ ہیں اشخاص کے قبضہ میں چلی جاتی ہیں۔ سرکاری خزانہ میں اتنا روپیہ داخل نہیں ہوتا جو سلطنت کے مصارف اور ملازموں کی تنخواہوں کے لیے کافی ہو۔ ملازموں کی تنخواہیں مہینوں بقایا میں رہتی ہیں اور اس کی تلافی کے لیے وہ رشوتیں لیتے اور رعایا کو لوٹتے ہیں۔

(۳) نااہل لوگوں کو اعلیٰ مناصب دینے اور پرانے آزمودہ کار اور مستحق لوگوں کو محروم رکھنے سے احتراز کیا جائے۔ اس سے کارداں لوگ بیکار ہو گئے ہیں اور ناکارہ لوگوں کے ہاتھ میں آکر امورِ سلطنت خراب ہو رہے ہیں۔

(۴) انتظام مالگزاری کی ابتری دور کی جائے جس کی بدولت اجناس گراں ہوگئی ہیں اور رعایا پریشان ہو رہی ہے۔ ہر روز دفتر وزارت کے سامنے لوگ "فریاد، فریاد" کی صدا بلند کرتے ہوئے جمع ہو جاتے ہیں اور ان فریادیوں میں پرانے نامور امرا کی اولاد بھی ہوتی ہے جن میں سے کوئی پکارتا ہے کہ میں "مہابت خاں کے خاندان سے ہوں" اور کوئی کہتا ہے کہ میں "علی مردان خاں کا پوتا ہوں"۔

ان اصلاحات کے اجرا میں محمد شاہ کے درباریوں اور حواریوں کا نقصان تھا اس لیے انہوں نے مزاحمت کی اور بادشاہ کو کسی تجویز پر راضی نہ ہونے دیا۔ دربار میں اصلاح و تخریب کے درمیان یہ کشمکش جاری تھی کہ گجرات سے حیدر قلی خاں کی شورش کی خبریں آئیں اور نظام الملک کو اس کے انسداد کے لیے احمد آباد جانا پڑا۔

مالوہ اور گجرات کا انتظام

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ نظام الملک نے حیدر قلی خاں کو بمشکل دار السلطنت سے رفع کر کے گجرات بھجوایا تھا۔ گجرات پہنچ کر اس من چلے شخص نے ظلم و ستم سے روپیہ وصول کرنا شروع کیا۔ امرا اور شاہی عہدہ داروں کی جاگیروں پر قبضہ کر لیا۔ سورت کے تاجروں پر دست درازی کی اور ان کے اموال ضبط کر لیے۔ عبد الغفور نامی ایک مشہور بوہرہ تاجر کو جو سورت کا ملک التجار سمجھا جاتا تھا لوٹ لیا اور ان طریقوں سے اس نے بے شمار دولت فراہم کر کے عربوں، حبشیوں اور فرنگیوں کی ایک فوج بھرتی کی اور علی الاعلان ایسی حرکتیں کرنے لگا جن سے خود مختاری و بغاوت کی بو آتی تھی۔ نظام الملک کے بار بار عرض کرنے کے باوجود بادشاہ اپنے منظور نظر صوبہ دار کی تادیب پر راضی نہ ہوتا تھا۔ آخر کار جب یہ خبریں آئیں کہ حیدر قلی نے اپنے صوبہ میں وہ اختیارات استعمال

کرنے شروع کر دیے ہیں جو صرف بادشاہ کے لیے مخصوص ہیں تو مجبوراً بادشاہ اس پر آمادہ ہوا کہ نظام الملک خود گجرات جا کر اس کی سرکوبی کریں۔ چنانچہ صفر ۱۱۳۵ھ نومبر ۱۷۲۲ء میں گجرات اور اس سے متصل مالوہ کی صوبہ داری نظام الملک کو عطا کی گئی اور وہ احمد آباد کی طرف بھیجے گئے۔ جب وہ گجرات کی سرحد پر جھابوہ تک پہنچ گئے تو حیدر قلی خاں نے مدافعت کے لیے اپنے صوبہ کے امرا سے مدد مانگی مگر انھوں نے نئے صوبہ دار اور وزیر اعظم کے مقابلہ میں معزول و معتوب صوبہ دار کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ خود اس کے اکثر ساتھی جو تورانی تھے نظام الملک کو اپنا سردار سمجھتے تھے اور وہ اپنے سردار کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ حیدر قلی خاں نے جب اپنے آپ کو نظام الملک کے سامنے اس قدر بے بس پایا تو دیوانہ بن گیا اور اس کے ساتھی اس کو اودے پور کے راستے سے دہلی لے کر بھاگ گئے۔ نظام الملک بلا کسی مزاحمت کے گجرات میں داخل ہوئے، وہاں کے بگڑے ہوئے حالات کو درست کیا، دھولکا، بھروچ جمبوسر، مقبول آباد اور بلسار کے پرگنے اپنی ذاتی جاگیر میں شامل کیے اور اپنے چچا معز الدولہ حامد خاں بہادر صلابت جنگ[1] کو اپنا نائب مقرر کر کے مالوہ کی طرف واپس ہوئے۔

---

[1] یہ غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کا چھوٹا بھائی تھا۔ عالم گیر کے عہد میں منصب و خطاب سے سرفراز ہو چکا تھا۔ عالم گیر کے بعد شاہزادہ اعظم کے ساتھ مل کر بادشاہ سے جنگ کی پھر اعظم کی شکست کے بعد بہادر شاہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا اور ۳؁ بہادر شاہی میں بیجاپور کی صوبہ داری پر مقرر ہوا۔ پھر کچھ مدت بعد اس خدمت سے دہلی واپس بلا لیا گیا۔ محمد امین خاں سے اس کے تعلقات خراب تھے اس لیے حسن پور کی جنگ میں اس نے سید عبداللہ خاں کا ساتھ

بقیہ بر صفحہ ۱۷۶

مالوہ میں دوست محمد خاں والی بھوپال کو جس سے ان کی پرانی مخالفت تھی، اطاعت پر مجبور کیا اور اپنے پھوپھی زاد بھائی عظیم اللہ خاں کو نائب صوبہ دار مقرر کر کے شوال ۱۱۳۵ھ جولائی ۱۷۲۳ء میں دہلی پہنچے

نظام الملک کے خلاف سازشیں

اس آٹھ نو مہینہ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر اہل دربار نے نظام الملک کے لیے پہلے سے بھی زیادہ مشکلات کا سامان فراہم کر رکھا تھا۔ وہ دارالسلطنت واپس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہر شخص وزیر اعظم بنا ہوا ہے اور در اصل وزیر اعظم کوئی بھی نہیں ہے بادشاہ کے اہالی موالی حتیٰ کہ خواجہ سراؤں کی بھی تجویزیں سنی جاتیں اور سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں ان کو مداخلت کا موقع دیا جاتا تھا مگر وزیر جو انتظام سلطنت کا اصلی ذمہ دار تھا اس کے مشورے ان سنے کر دیئے جاتے تھے۔ حرم سرا سے لے کر دیوان عام تک جتنے لوگ بادشاہ کے گرد و پیش تھے سب نے باہم یہ سازش کر لی تھی کہ نظام الملک کی کوئی بات نہ چلنے دی جائے۔ اس سازش کا سرغنہ صمصام الدولہ خاں دوراں تھا جس نے دربار میں مغلوں کے خلاف ایک ہندوستانی پارٹی بنا رکھی تھی اور ہندوستان زاد مسلمانوں اور ہندو راجاؤں کے ساتھ متحد ہو کر اس نے یہ آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی کہ ہر مغل (یعنی جو ترکستان، ماوراء النہر یا ایران سے آیا ہوا ہو) خواہ اس کو ہندوستان میں رہتے بستے سو دو سو برس ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں، بہر حال غیر ملکی ہے۔ لہذا ہمارے ملک کے انتظام

بقیہ صفحہ ۱۷۵ دیا تھا۔ مگر بعد میں نظام الملک کی خاطر اس کو معاف کر دیا گیا اور معز الدولہ صلابت جنگ کا خطاب دیکر گجرات کی نیابت صوبہ داری پر مقرر کیا گیا۔ یہ اپنی عادات و خصائل کی بنا پر "جنگی شہزادہ" کہلاتا تھا۔

میں اس کا کوئی حصّہ نہ ہونا چاہیئے۔ ان لوگوں نے آخر میں یہ کوشش کی کہ اپنی خفیہ چالوں سے بادشاہ اور نظام الملک میں عداوت پیدا کردیں۔ چنانچہ یہ جب نظام الملک کے پاس آتے تو ان سے کہتے کہ محمد شاہ بالکل ناکارہ آدمی ہے اسے معزول کر کے محمد ابراہیم کو تخت پر بٹھانا چاہیئے اور دوسری طرف بادشاہ سے جا کر کہتے کہ نظام الملک آپ کو معزول کر کے محمد ابراہیم کو تخت نشین کرنے کی فکر میں ہیں اور وہی اقتدار بہم پہنچانا چاہتے ہیں جو بادشاہ گر سیدوں نے حاصل کیا تھا۔ وہ محمد شاہ سے کہتے تھے کہ یہ چالاک بڈھا رفتہ رفتہ تمام ملک پر قبضہ جمار ہا ہے۔ دکن کا عظیم الشان صوبہ جو پچھلے زمانہ میں کئی سلطنتوں کا شہ نشین تھا آپ کی عطا کے بغیر اس نے از خود سیدوں سے چھین لیا۔ گجرات اور مالوہ کے بڑے بڑے صوبے بھی اس نے بطائف الحیل آپ سے لے لیے اور اب جو ملک باقی ہے اس پر وہ وزارت کے نام سے حادی ہو گیا ہے۔ ان باتوں نے بادشاہ کو نظام الملک سے سخت بدگمان کر دیا یہاں تک کہ نظام الملک کو اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ۱۱۳۶ھ ۱۷۲۳ء کی ابتدا میں انہوں نے دربار کی آمد و رفت بند کر دی۔ وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور دکن واپس جانے کا ارادہ کر لیا مگر اہلِ دربار ان کی طاقت سے واقف تھے اور کھلم کھلا ان سے مخالفت مول لینے کی جرأت نہ رکھتے تھے اس لیے انہوں نے بادشاہ اور وزیر میں مصالحت کرادی اور بادشاہ کے کہنے سننے سے انہوں نے پھر دربار میں آنا جانا شروع کر دیا۔

سلطنت کی مایوس کن حالت

یہ زمانہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں سلطنت مغلیہ کا بدترین زمانہ تھا۔ حکومت کے معاملات کی ابتری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ سیاسی، دیوانی، انتظامی، عدالتی، فوجی غرض حکومت کے تمام محکمے بلا استثنا بدنظمی کی عام وبا کے شکار ہو چکے تھے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک

تمام عہدہ داروں، اہلکاروں اور منصب داروں سے فرض کا احساس رخصت ہو چکا تھا لوگوں نے اپنی ذاتی اغراض کے لحاظ سے مختلف جتھے بنا رکھے تھے اور ہر جتھے کے افراد کی دلچسپیوں کا مرکز تمام تر اپنے جتھے کا مفاد اور دوسرے جتھوں کا عناد بنا ہوا تھا ہر شخص جو کچھ سوچتا تھا ایک خاص جتھے کے فرد کی حیثیت سے سوچتا تھا اور مجموعی طور پر ملک یا قوم یا سلطنت کے فرد کی حیثیت سے سوچنے کی صلاحیت اس میں نہ تھی۔ ان جتھوں کے درمیان جوڑ توڑ، سازشوں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا اور اس میں کسی کو ملک اور سلطنت کے عمومی فائدے یا نقصان کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ امرا کی شخصی پارٹیوں کے علاوہ نسلی جغرافی، علاقائی عصبیتوں کی بنا پر بھی مختلف پارٹیاں بن گئی تھیں۔ گو اس قسم کی پارٹیاں ملک میں پہلے سے بھی موجود تھیں، مگر جیسا کہ قاعدہ ہے قومی انحطاط کے زمانہ میں ہمیشہ ایسے تعصبات ابھر آتے ہیں جن کا میلان جمع و تالیف کے بجائے تفریق و تقسیم کی طرف ہوتا ہے۔ وہی ایرانی، تورانی، ترک مغل، افغان اور ہندوستانی جو پہلے ایک شیرازے اور ایک نظام سلطنت میں منسلک ہو کر سارے ملک کی خدمت کرتے تھے اب ان میں ایک دوسرے کے خلاف شدید تعصب پیدا ہو گیا۔ اور سب سے زیادہ خطرناک تعصب یعنی ملکی اور غیر ملکی کے تعصب نے ان کے درمیان اتنی عداوتیں پیدا کر دیں کہ ان کے لیے مل جل کر کام کرنا محال ہو گیا پہلے ان کی آپس کی رقابت کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر گروہ ملک اور سلطنت کی خدمت میں دوسرے سے زیادہ بڑھ جانے اور زیادہ مراتب و مناصب حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر اب ان رقابتوں نے یہ شکل اختیار کر لی کہ ہر گروہ کی قوتیں صرف اس ایک مقصد کے لیے وقف تھیں کہ دوسرے گروہ کو نیچا دکھائیں۔ اس کام میں ملک اور سلطنت کے مفاد کو

عمداً قربان کر دینے میں بھی تامل نہ کیا جاتا تھا۔ دربار شاہی سے لے کر ادنیٰ دفتروں تک یہ اختلافات ایک طوفان کی طرح پھیل گئے تھے اور ہر شخص اپنے سرکاری فرائض کو چھوڑ کر اس دھڑے بندی اور اختلافی سیاست سے دل چسپی لینے لگا تھا۔ نظام الملک ایک طرف ان حالات کو دیکھ کر اور دوسری طرف بادشاہ کا رنگ دیکھ کر بالکل مایوس ہو گئے اور انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ جو سلطنت انتشار، پراگندگی اور زوال و انحطاط کے اس حد کو پہنچ چکی ہو اس کو دنیا کی کوئی قوت مٹنے سے نہیں بچا سکتی۔ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنا اپنی محنتوں کو ضائع کرنا بلکہ قدرت سے جنگ کرنا ہے۔

نظام الملک پھر دکن میں

اس فیصلہ پر پہنچنے کے بعد ان کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ وہ دکن واپس چلے جائیں اور اس صوبے کو جو تیزی کے ساتھ مرہٹوں کے قبضہ میں جا رہا تھا سنبھال کر بیٹھ جائیں مگر یہ ارادہ ظاہر کر کے علی الاعلان دکن جانا مشکل تھا، انہوں نے علالت مزاج اور ناموافقت آب و ہوا کا بہانہ کر کے ربیع الاول ۱۱۳۶ھ دسمبر ۲۳ء، میں سنبھل (مراد آباد)، کی طرف اپنی جاگیر پر جانے کی اجازت حاصل کر لی اور اپنے بیٹے غازی الدین کو نائب وزیر کی حیثیت سے دار السلطنت میں چھوڑ دیا۔ ابھی وہ جمنا پار کر کے شاہدرہ پر پہنچے تھے کہ راجہ گوجرمل دیوان خالصہ اور ایک با اثر خواجہ مونس نے بادشاہ کو ایسے باتدبیر شخص کی ناراضی کے نتائج سے آگاہ کیا اور ان کی طرف سے مطالبات کی ایک فہرست اس کے سامنے پیش کی جن کے منظور کرنے پر وہ پھر فرائض وزارت انجام دینا قبول کر سکتے تھے۔ ان مطالبات میں سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ محاصل کو اجارہ پر دینے کا طریقہ جو رتن چند بقال نے جاری کیا تھا، موقوف کر دیا جائے۔ مگر جس وقت

گوجرمل یہ بیان پڑھ رہا تھا۔ وہ دفعتہً غش کھا کر گرا اور گھر پہنچتے پہنچتے مر گیا۔ نظام الملک نے یہ خبر سنی تو تصفیہ کی امید کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ راستہ میں صمصام الدولہ خاں دوراں، اعتماد الدولہ قمر الدین، اور روشن الدولہ ظفر خاں کے متعدد خطوط ان کو ملے جن میں لکھا تھا کہ اگر آپ کو کچھ ملال خاطر بہم پہنچا ہے تو بادشاہ آپ کو منانے کے لیے خود اپنی والدہ ماجدہ کو بھیجنے کے لیے تیار ہیں لیکن نظام الملک ان پر فریب باتوں کے اصلی مقصد کو خوب سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے سفر کو جاری رکھا۔ مراد آباد سے چکر کاٹتے ہوئے وہ آگرہ گئے۔ وہاں سے بادشاہ کو عرضی بھیجی کہ مرہٹوں کے غارت گر دستے مالوہ اور گجرات کے صوبوں میں گھس آئے ہیں جن کا انتظام مجھ سے متعلق ہے۔ اس لیے میں مالوہ کی طرف جاتا ہوں۔ چنانچہ آگرہ سے اُجیّن پہنچے اور پھر سیہور[1] جاکر سیدھا دکن کا راستہ لیا۔ سیہور پر پہلی مرتبہ ان کے ہمراہیوں کو معلوم ہوا کہ منزلِ مقصود مالوہ نہیں بلکہ دکن ہے۔

مُبارِز خاں کو نظام کے مقابلہ پر اکسایا جاتا ہے

نظام الملک کے مخالفین اس معاملہ کو اسی وقت سمجھ گئے تھے جب وہ دہلی سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے اس چال کا بہترین جواب یہ سوچا کہ انہیں دکن کی صوبہ داری سے معزول کر کے کسی دوسرے طاقتور شخص کو خفیہ طور پر صوبہ دار بنا دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد نظام الملک کے لیے دو صورتیں باقی رہ جائیں گی یا تو وہ دکن جا کر نئے صوبہ دار سے لڑیں گے اور اس صورت میں یقیناً انہیں شکست ہو گی

---

[1] ریاست بھوپال کے علاقہ میں ہے۔

کیونکہ دکن کا کوئی سردار اپنے صوبہ دار کے مقابلہ میں معزول شدہ صوبہ دار کا ساتھ نہ دیگا۔ دے گا یا پھر وہ دارالسلطنت واپس ہو جائیں گے اور ایک بے زور اور بے ٹھکانا شخص کی طرح انہیں گمنامی میں زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ اب ایک ایسے شخص کی ضرورت پیش آئی جسے اس تیر بہدف چال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دکن کا صوبہ دار بنایا جائے دربار میں عنایت اللہ خاں کشمیری موجود تھا جو خانِ ساماں کا عہدہ رکھتا تھا اور نظام الملک کی آمد سے قبل نائب وزیر رہ چکا تھا۔ اس نے اپنے داماد مبارز خاں عماد الملک کا نام پیش کیا جو بارہ سال سے حیدر آباد کا صوبہ دار تھا اور مغلوں میں ایک نامور سپہ سالار سمجھا جاتا تھا۔ صمصام الدولہ کی ہندوستانی پارٹی نے اس نام کو دو وجوہ سے پسند کیا ایک یہ کہ مبارز خاں کی جلادت و بہادری سے ان کو امید تھی کہ وہ نظام الملک کو تباہ کر دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ بھی مغل تھا اور مغل سے مغل کو لڑانا اور ایک کے ہاتھوں دوسرے کا خاتمہ کرا دینا ہندوستانی پارٹی کے لیے ایک نہایت مبارک فعل تھا اس بنا پر بادشاہ سے مبارز خاں کے نام صوبہ داری کا فرمان حاصل کر کے خفیہ طریقہ سے حیدر آباد بھیج دیا گیا۔ اس کے علاوہ بہادر خاں[1] پنّی فوجدار کرنُول، عبدالنبی خاں فوجدار کڑپہ، عبدالغفار فوجدار ساوانُور، سعادت اللہ خاں فوجدار کرناٹک، راجہ چندر سین راؤ رنبھا، راجہ ساہو، عضد الدولہ عوض خاں اور امین خاں دکنی کو بھی بصیغہ راز احکام بھیجے گئے کہ وہ نظام الملک کے مقابلے میں مبارز خاں کا ساتھ دیں۔ اسکے تھوڑے عرصے بعد نظام الملک کے بیٹے غازی الدین خاں کو نیابت وزارت سے الگ

---

[1] اصلی نام ابراہیم خاں پنّی تھا اور یہ اس داؤد خاں پنّی کا بھائی تھا جو ذوالفقار خاں کے تحت صوبہ دکن کا نائب صوبہ دار رہ چکا تھا۔

کر دیا گیا تاکہ اندرونی کارروائیوں کا انہیں کوئی علم نہ ہونے پائے۔

یہ مبارز خاں اصلاً بلخ کا باشندہ تھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہندوستان آیا اور ابتداً ادنیٰ درجہ کی خدمتوں پر مقرر ہوتا رہا۔ پھر عنایت اللہ خاں کشمیری کی لڑکی سے شادی ہوتے ہی اس کی قسمت نے یکایک پلٹا کھایا اور اپنے خسر کے توسل سے اس کو اعلیٰ مناصب ملنے شروع ہو گئے۔ عالمگیر کے آخر عہد میں اسے امانت خاں کا خطاب اور سنگمنیر کی فوجداری کا عہدہ ملا اور بعد میں بیضاپور کی فوجداری بھی اس کے ساتھ ضمیمہ ہو گئی۔ بہادر شاہ کا وزیر اعظم منعم خاں اس کی اعلیٰ قابلیت کا بہت معترف تھا۔ اس نے غازی الدین خاں فیروز جنگ کی وفات کے بعد اسے گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا۔ جہاندار شاہ کے عہد میں اسے مالوہ کی صوبہ داری پر منتقل کیا گیا اور شہامت خاں کا خطاب عطا ہوا۔ فرخ سیر کے آغازِ حکومت میں اسے مبارز خاں کا خطاب دیکر مالوہ سے گجرات اور پھر گجرات سے حیدر آباد کی صوبہ داری پر بھیجا گیا اور ۱۲ سال تک بڑے دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ اس خدمت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ہمعصر مورخین اس کی جرأت، حسن انتظام، عدل و انصاف اور ہیبت و صولت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس نے صوبہ حیدر آباد کا انتظام پورے ضبط کیساتھ کیا تھا۔ تمام صوبہ میں اس کے احکام کی اطاعت کی جاتی تھی۔ شریروں کو اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور مرہٹے اس کے علاقہ سے چوتھ اور سر دیسمکھی وصول نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی ظاہری وجاہت، بارعب شخصیت اور اعلیٰ قابلیت کا ہر شخص پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ حسین علی خاں نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں تمام پرانے عہدہ داروں کو الگ کر کے اپنے آدمی مقرر کیے مگر اسے صوبہ حیدر آباد

پر بدستور رہنے دیا پھر جب نظام الملک عالم علی خاں کو شکست دے کر اورنگ آباد پہنچے تو یہ ان سے ملنے آیا اور انہوں نے اسے ہفت ہزاری منصب اور عمادالملک ہزبر جنگ کا خطاب دلوایا لیکن اس کے بعد جب نظام الملک کرناٹک کے افغان فوجداروں (یعنی کڑپہ کرنول اور ساوانور وغیرہ کے فوجداروں) کو مطیع کرنے اور ان سے پیش کش وصول کرنے کے لیے ادونی کی طرف گئے تو مبارز خاں نے ان کو پیش کش کی تحصیل میں کوئی مدد نہیں دی اور یہ معلوم ہوا کہ اس نے اور افغان فوجداروں نے ملی بھگت کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے سیکاکول کے علاقہ میں بعض محالات خالصہ کو اپنی ذاتی جاگیر بنا لیا ہے۔ بظاہر اس پر نظام الملک نے کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا مگر دل میں انہوں نے سمجھ لیا کہ صوبہ دار لاکھ قابل سہی تاہم ایک شخص کو ایک صوبہ میں طویل مدت تک رکھنے کی پالیسی درست نہیں ہے چنانچہ جب وزیر اعظم ہو کر دہلی گئے تو انہوں نے مبارز خاں کے وکیل سے ان محالات خالصہ کی آمدنی کا مطالبہ کیا جو ذاتی جاگیر میں شامل کر لی گئی تھیں اور اس کے بعد بادشاہ کو مشورہ دیا کہ مبارز خاں کو حیدرآباد سے کابل کے صوبہ پر منتقل کر دے جیسا کہ ہم اوپر بہ تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنت کے مصالح لوگوں کی نگاہوں میں کوئی چیز نہیں رہے تھے اور ہر معاملہ میں صرف شخصی اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ مبارز خاں کے خسر عنایت اللہ خاں کشمیری نے نظام الملک کی اس تجویز کو ذاتی عناد پر محمول کیا اور ان کے علی الرغم ہندوستانی پارٹی کی سازش سے مبارز خاں کے لیے پورے دکن کی صوبہ داری کا فرمان حاصل کر لیا۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ نظام الملک کو دہلی ہی میں مبارز خاں کے صوبہ دار

بنائے جانے کا حال معلوم ہو گیا تھا اور یہی ان کے دکن جانے کا باعث ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا علم انہیں راستہ میں ہوا لیکن دونوں صورتوں میں یہ امر متحقق ہے کہ مبارز خاں کے تقرر کا معاملہ بالکل پوشیدہ رکھا گیا تھا اور نظام الملک کو سرکاری طور پر اس امر کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی کہ وہ صوبہ دکن سے معزول کر دیئے گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس وقت دکن کے دو صوبہ دار تھے ایک خفیہ اور ایک علانیہ۔ دونوں اپنے آپ کو صوبہ کا جائز حاکم سمجھتے تھے اور دونوں کو ایک ایک قانونی بنیاد پر یہ حق حاصل تھا کہ اپنے حریف سے لڑ کر اس کو صوبہ داری سے بے دخل کر دے اس لیے دونوں میں سے ایک کو بھی بادشاہ کی نافرمانی کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اس دورخی سیاست کے نتائج تھے کہ سلطنت کے دو نہایت قابل اور نامور ارکان حدود سلطنت کے اندر لڑ رہے تھے اور دونوں کو خود وہی سلطنت لڑا رہی تھی جس کے دونوں تابع فرمان تھے۔

نظام الملک پھر صوبہ دار دکن بنائے جاتے ہیں

مبارز خاں کو شاہی فرمان اس وقت پہنچا جب وہ مچھلی بندر کے قریب بھونگیری پر ایک زمیندار دآپا راؤ سے لڑ رہا تھا۔ دانشمندی کا اقتضا تھا کہ وہ بڑی مہم کی خاطر اس مہم کو کسی مناسب وقت کے لیے ملتوی کر کے فوراً اورنگ آباد پہنچ جاتا۔ اورنگ آباد اس وقت خالی تھا اور نظام الملک کے نائب عوض خاں کے پاس اس وقت دو ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی۔ لیکن مبارز خاں نے آپا راؤ کی جنگ میں کئی مہینہ ضائع کر دیئے۔ پھر وہ حیدر آباد اس وقت واپس ہوا جب بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا اور بہت سے علاقوں کے فوجدار اپنی فوجیں لے کر حسبِ معمول

جا چکے تھے۔ اس حالت میں اسے توقف کرنا چاہیئے تھا مگر اب اس نے جلد بازی سے
کام لیا اور عین بارش کے زمانہ میں حیدر آباد سے اورنگ آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔
بہادر خاں پنّی فوجدارِ کرنول، ابوالفتح خاں (عبدالنبی خاں فوجدار کڑپہ کا بیٹا) عبدالمجید خاں
میانہ (عبدالغفار خاں فوجدار ساوانور کا بیٹا)، غالب خاں (ابو طالب بدخشی کا بیٹا اور
سعادت اللہ خاں فوجدار کاٹ کا نائب)، اور دلاور خاں فوجدار رائچور اس کے ساتھ
تھے اور مجموعی طور پر اس کی فوج کی تعداد ۱۵ ہزار سوار اور ۳۰-۴۰ ہزار پیادہ سپاہ پر
مشتمل تھی لیکن ابھی وہ ناندیڑ کے قریب گوداوری کو عبور کرکے باسم کے علاقہ میں داخل
ہوا تھا کہ نظام الملک رمضان ۱۱۳۶ھ میں اورنگ آباد پہنچ گئے اور اس واقعہ نے سیاست
کا نقشہ ہی دگرگوں کر دیا۔ دکن میں نظام الملک کو جو اثر حاصل تھا اس کو دیکھتے ہوئے
محمد شاہ کو یہ امید نہیں تھی کہ ان کے اورنگ آباد پہنچ جانے اور پھر وہاں انہیں تیاری
کے لیے کافی مہلت بھی مل جانے کے بعد مبارز خاں ان کے مقابلہ میں کامیاب ہو سکے
گا اس لیے اس نے اپنی بازی ہری ہوئی دیکھ کر چال بدل دی۔ اس نے نظام الملک
کو لکھا کہ "دکن کے صوبے ہم نے اس بنا پر مبارز خاں کے سپرد کر دیئے تھے کہ تم کو
ان کی ویرانی اور قلت محاصل کی شکایت تھی ورنہ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ تمہیں دکن
میں رہنے کی اس قدر خواہش ہے تو ہم کسی دوسرے کو اس پر نامزد نہ کرتے۔ اسی طرح
غازی الدین خاں فیروز جنگ کے نیابتِ وزارت سے ہٹنے کی وجہ بھی یہ ہوئی کہ
تمہارے اورنگ آباد جانے کی وجہ سے وہ پریشان ہو گئے اور انہوں نے اپنے عہدہ
کا کام چھوڑ دیا اس لیے اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کو نائب وزیر مقرر کر دیا گیا خدانخواستہ
اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ تم اپنے عہدوں سے معزول یا شاہی لطف و

عنایت سے محروم کر دیئے گئے ہو۔ وزارت اور صوبہ داری دونوں پر تم بحال ہو جب تک چاہو اپنے صوبہ میں ٹھہرو اور جب چاہو حضور میں آجاؤ۔ مبارز خاں کو پٹنہ کی صوبہ داری پر متقرر کر دیا گیا اس کو وہاں بلا مزاحمت چلا جانے دو۔"

دوسری طرف مبارز خاں کو لکھا گیا کہ "دکن کا صوبہ تم کو اس بنا پر دیا گیا کہ تم نے اپنے افغان حامیوں کی امداد سے اس کو سنبھال لینے کا اقرار کیا تھا۔ تم کو احکام اس وقت بھیج دیئے گئے تھے، جب عوض خاں دیوگڑھ میں اور نظام الملک مراد آباد میں تھے، اور دکن کا دار الحکومت اورنگ آباد خالی پڑا ہوا تھا مگر تم نے ایک چھوٹے سے زمیندار کے مقابلہ میں اتنا وقت ضائع کر دیا کہ نظام الملک اور عوض خاں دونوں اورنگ آباد پر مل گئے۔ اب تم نے دوسری غلطی یہ کی کہ اورنگ آباد سے ۶۰ کوس کے فاصلہ پر پڑے ہوئے ہو اور بارش کا عذر کر رہے ہو۔ تمہارے حامی بہادر خاں وغیرہ بھی نہیں آئے۔ ایسی حالت میں نظام الملک کو صوبہ داری پر بحال کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ تم کو اس کے بدلے پٹنہ کی صوبہ داری دی جاتی ہے۔ برہانپور یا سیکاکول میں سے جس راستے سے چاہو وہاں چلے جاؤ۔ نظام الملک کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ تم سے تعرض نہ کریں۔"

لیکن یہ دونوں فرمان اس وقت پہنچے جب دونوں حریف صوبہ دار اپنا قضیہ قاضی شمشیر کے حوالہ کر چکے تھے۔

مبارز خاں کی شکست

نظام الملک نے جس طرح اس سے پہلے عالم علی خاں اور دلاور علی خاں کو جنگ سے قبل صلح کی دعوت دی تھی، اسی طرح مبارز خاں کو بھی مصالحت اور دوستی کے انداز میں مسلمانوں کی باہمی جنگ کے وبال سے ڈرایا، قدیم روابط محبت اور ہم وطنی

کے تعلقات یاد دلائے۔ دربار میں بادشاہ اور اس کے مشیر وصلاح کار جو طفلانہ حرکات کر رہے تھے ان کی کیفیت لکھ کر سمجھایا کہ ہم کو ان سازشوں کا آلۂ کار نہیں بننا چاہیئے اور یہ بھی لکھا کہ میں صرف اس وقت تک یہاں ہوں جب تک میری اس صوبہ سے علیحدگی اور کسی دوسرے صوبہ پر تقرر کا فرمان نہیں آتا جب باقاعدہ فرمان آجائے گا میں چلا جاؤں گا۔ اتنی دیر تم توقف کرو، بیان کیا جاتا ہے کہ مبارز خاں اس مصالحانہ پیغام کو قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر اس کے پٹھان حلیفوں نے اسے وطنی عصبیت کا طعنہ دیا اور اس سے کہا کہ تم اپنے بادشاہ کے فرمان کو پس پشت ڈال کر اپنے مغل بھائی کی جانب داری کر رہے ہو۔ اس پر مجبوراً اس نے نظام الملک کے پیغام صلح کو رد کر دیا اور ان کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ ادھر نظام الملک اورنگ آباد سے ۶ ہزار سوار لے کر چلے۔ راستہ میں جب دونوں فوجوں کے درمیان ۱۲ کوس کا فاصلہ رہ گیا تو مبارز خاں نے چاہا کہ کاوا کاٹ کر نظام الملک کی بے خبری میں سیدھا اورنگ آباد پہنچ جائے کیونکہ اس کو معلوم ہوا تھا کہ اورنگ آباد کی محافظت کا کوئی انتظام نہیں ہے اور اسے یہ بھی امید دلائی گئی تھی کہ دولت آباد کا قلعہ دار قلعہ اس کے سپرد کر دے گا اس خیال کے مطابق مبارز خاں نے اپنا کیمپ پونا کے قریب چھوڑ دیا اور دوسرے راستہ سے تیزی کے ساتھ اورنگ آباد کی طرف چلا۔ مگر اس کی اس چال سے اس کے اہل فوج واقف نہ تھے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ وہ نظام الملک کے مقابلہ سے جی چراتا ہے۔ اس سے ان کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ دوسری طرف نظام الملک کی فوج کو اس کا علم ہوا تو جو لوگ اپنی قلتِ تعداد سے خوف زدہ ہو رہے تھے۔ ان کے دل بڑھ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ مبارز خاں ان سے ڈر گیا ہے۔ چنانچہ اسی وقت لوگوں نے

نظام الملک کو مبارکباد کی نذریں پیش کیں اور ایک شاعر نے اس واقعہ کی تاریخ نکالی "ڈر گیا مبارز خاں"۔

مبارز خاں کی چال کو بھی نظام الملک بروقت سمجھ گئے اور انہوں نے اپنی فوج کے مرہٹہ دستوں کو اس کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے اس کی فوج پر پیہم چھاپے مار مار کر اس کو اتنا دق کیا کہ وہ جس تیزی رفتاری کے ساتھ اورنگ آباد جانا چاہتا تھا اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس طرح اپنے حریف کی یلغار کو روک کر نظام الملک اپنے توپ خانہ سمیت اس کے تعاقب میں چلے اور شکر کھیڑہ[1] کے مقام پر اس کو جا لیا۔ ۲۳ محرم ۱۱۳۷ھ / ۱۱ اکتوبر ۱۷۲۴ء کو جنگ ہوئی جس میں مبارز خاں اور اس کے ساتھ بہادر خاں پنی، غالب خاں، ابوالفتح خاں میانہ وغیرہ تیس چالیس بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ اس کی فوج کے ساڑھے تین ہزار آدمی کام آئے اور مبارز خاں کے دو بیٹے خواجہ محمود خاں اور حامد اللہ خاں گرفتار ہوئے۔ ان نقصانات کے مقابلہ مقابلہ نظام الملک نے صرف تین سردار اور نسبتہً بہت کم سپاہی کھو کر فیصلہ کن فتح حاصل کر لی۔ یہ فتح بھی اس کا نتیجہ تھی کہ نظام الملک نے اپنے توپ خانہ کو بہترین تدبیر سے استعمال کیا۔ اس کے بعد ربیع الثانی ۱۱۳۷ھ / جنوری ۱۷۲۵ء میں وہ حیدر آباد پہنچے۔ مبارز خاں کے بیٹے جلال الدین محمود خاں نے شہر ان کے سپرد کر دیا۔ اب صرف ایک قلعہ گولکنڈہ باقی رہ گیا تھا جہاں مبارز خاں کا بیٹا خواجہ احمد خاں ایک سال تک مدافعت کرتا رہا۔ آخر کار ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۶ء میں اس نے بھی اطاعت قبول کر لی۔

---

[1] اورنگ آباد سے ۸۰ میل پر برار کے ضلع بلڈوانہ میں واقع ہے۔ بعد میں اس کا نام فتح کھیڑہ رکھ دیا گیا۔

اس طرح صوبہ حیدرآباد کلیتہً ان کے قبضہ میں آگیا۔ اس موقع پر نظام الملک نے مبارز خاں کے خاندان سے جس مہربانی اور فیاضی کا برتاؤ کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر فراخ حوصلہ شخص تھے اور کس طرح دشمنوں کو دوست بنا لیتے تھے۔ انہوں نے خواجہ احمد خاں کو ششش ہزاری منصب اور شہامت خاں کا خطاب دیا۔ خواجہ محمود خاں کو پنج ہزاری منصب اور مبارز خاں کا خطاب عطا کیا اور حامد اللہ خاں کو دوہزاری منصب دے کر اس سے اپنی بہن کی شادی کر دی۔ صلابت جنگ کے زمانہ میں خواجہ محمود خاں کو مبارز الملک غالب جنگ کا خطاب اور نظامت حیدرآباد کا عہدہ دیا گیا اور اس کی وفات کے بعد حامد اللہ خاں کو مبارز الملک کا خطاب اور دیوان سرکار کا عہدہ عطا ہوا۔

بادشاہ کے نام نظام الملک کی عرضی

فتح سے فارغ ہو کر نظام الملک نے بادشاہ کو ایک طویل عرضی بھیجی جس میں انہوں نے اپنے طرز عمل کی صفائی پیش کی۔ انہوں نے تیمور کے زمانہ سے محمد شاہ کے عہد تک مغل فوج اور مغل امرا کی وفاداری کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خاندان کی اور خود اپنی خدمات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جن کی تازہ مثال گجرات میں حیدر قلی خاں اور مالوہ میں دوست محمد خاں کی سرکشی کا فرو کرنا تھا۔ پھر بتایا کہ میں نے اپنے ذاتی اقتدار کے لیے کبھی حرص وطمع سے کام نہیں لیا ورنہ محمد امین خاں میرے مقابلہ میں وزیر نہ ہوتے اور نہ میں بار بار شاہی طلب پر دہلی حاضر ہوتا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ان کوششوں کا ذکر کیا جو وزارت کے زمانہ میں سلطنت کے انتظام کو درست کرنے کے لیے انہوں نے کی تھیں اور ان اندرونی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور

پر فریب چالوں کی شکایت کی جن سے بادشاہ کے ہمدم وہمراز لوگوں نے ان کونا کام کرنے کی کوشش کی۔آگے چل کر انہوں نے بیان کیا کہ کس طرح خفیہ طور پر مبارز خاں کو ان کے مقابلہ میں ابھارا گیا اور وہ اصل خطوط اور مراسلات جو مبارز خاں کے نام بھیجے گئے تھے، پیش کر کے سوال کیا کہ کیا میں اپنی اور اپنے خاندان کی سابق خدمات پر اسی صلہ کا مستحق تھا؟ پھر بیجاپور اور حیدرآباد کی تاریخ سے مثالیں پیش کر انہوں نے محمد شاہ کو بتایا کہ ایک فرمانروا کے لیے سب سے بڑی مصیبت اس کے برے مشیر ہوتے ہیں۔ ایسے مشیروں کی بدولت عادل شاہ اور قطب شاہ کی سلطنتیں تباہ ہوئیں۔ اور انہی کی بدولت ایران پر افغانوں کا تسلط ہوا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے محمد شاہ کو نصیحت کی کہ وہ اپنی عادات وخصائل کی اصلاح کرے اور اسے ان فرائض کی طرف توجہ دلائی جو ایک بادشاہ کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ آخر میں مبارز خاں کے ساتھ اپنی جنگ کا تذکرہ کیا اور اپنی فتح یابی کی مفصل کیفیت بیان کی۔

نظام الملک کا مالوہ اور گجرات سے معزول اور دکن پر بحال ہونا

محمد شاہ نے بظاہر اس خط کا تو کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن امرائے دربار کی ایک متفقہ عرض داشت کی بنا پر نظام الملک کی عفو تقصیر کر کے انہیں شش صوبہ دکن کی صوبہ داری پر منتقل کر دیا۔ ان کی جاگیریں جو وزارت سے قبل ان کو حاصل تھیں۔ بحال کیں اور انہیں آصف جاہ کا خطاب اور منصب ہفت ہزاری ذات وسوار عطا کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وزارت پر اعتمادالدولہ قمرالدین خاں کو منتقل کیا، مالوہ کی صوبہ داری سے آصف جاہ کو معزول کر کے گردھر بہادر ناگر کو مقرر کیا، اور گجرات کی صوبہ داری بھی ان سے لے کر سربلند خاں کو عطا کی۔

دولت آصفیہ کی خود مختاری

اس زمانہ سے دکن میں دولت آصفیہ کی خود مختارانہ حکومت شروع ہوتی ہے۔ گو نواب صاحب نے قدیم خاندانی ملازمت کا لحاظ کرتے ہوئے بادشاہ کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا۔ جہاں تک شاہی اقتدار کی ظاہری صورتوں کا تعلق ہے انکے اختیار کرنے سے پرہیز کرتے رہے، بادشاہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔ تخت پر نہیں بیٹھے، شاہی چتر نہیں لگایا، سکہ اور خطبہ اپنے نام کا جاری نہیں کیا اور حد یہ ہے کہ اس واقعہ کے چند سال بعد بادشاہ کی طلب پر دہلی جانے اور جنگی و سیاسی خدمات انجام دینے میں بھی تامل نہیں کیا لیکن شش صوبہ دکن میں حکومت و سیاست کی تمام عملی اغراض کے لیے اب وہ شاہی اقتدار سے بالکل آزاد ہو گئے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام عہدوں کا عزل و نصب، خطابات، مناصب اور جاگیروں کی بخشش، جنگ و صلح اور معاہدات، باجگذار ریاستوں سے خراج کی تحصیل، ہمسایہ طاقتوں سے سیاسی معاملات اور دوسرے تمام امور بالاستقلال انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے اور انہیں اسی طرح انجام دیا جس طرح ایک خود مختار فرمانروا انجام دیتا ہے۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں نے بھی ایک صدی سے زیادہ مدت تک شاہی حکومت کا احترام اسی طرح برقرار رکھا۔ جب تک تیموری نسل کا بادشاہ دہلی کے تخت پر موجود رہا اس وقت تک دکن میں اس کا سکہ و خطبہ جاری رہا۔ مسند نشینی کے لیے اس سے فرمان حاصل کیے جاتے رہے۔ دگویہ فرمان محض رسمی تھے اور مسند نشینی کا انحصار ان فرامین پر نہ تھا، اسکے فرامین کا استقبال اسی احترام کیساتھ کیا جاتا رہا جسطرح قدیم زمانہ میں کیا جاتا تھا لیکن ان ظاہری رسوم کے سوا دولت آصفیہ پر دہلی کے بادشاہ کو کسی قسم کا عملی اقتدار باقی نہیں رہا۔

انقراض سلطنت اور دکن کی علیٰحدگی کے اسباب

یہ واقعہ جن اسباب و وجوہ کا نتیجہ تھا۔ ان کا ایک اجمالی تصور گذشتہ مباحث کے مطالعہ سے ناظرین کے ذہن میں قائم ہو گیا ہو گا۔ لیکن ایک مکمل اور صحیح تصور قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بیان کردہ واقعات کی روشنی میں ملک اور سلطنت کی سیاسی حالت، اسباب انحطاط، اور ان اسباب کے پیدا کردہ نتائج پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے۔

عالمگیر کی سیرت، اس کے طرز حکمرانی اور اس کی سیاسی حکمت عملی پر بہت کچھ نکتہ چینی کی گئی ہے اور تاریخی ناقدین کے ایک بڑے گروہ نے اس کو زوال سلطنت کا باعث قرار دینے میں تامل نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق موافق یا مخالف کسی قسم کی رائے ظاہر کرنے سے پہلے ایک صحیح الفکر مبصر کو تحقیق کرنا چاہیئے کہ عالمگیر کے عہد میں ملک اور اہل ملک کی حالت کیا تھی؟ اخلاقی، ذہنی، مادّی اور علمی و عملی حیثیت سے انکی اجتماعی اور انفرادی قوت و قابلیت کا کیا معیار تھا؟ اور اس کا لحاظ کرتے ہوئے وہ شخص جس کے ہاتھ میں ان کی سیاست و قیادت کی باگیں تھیں کہاں تک ان کے زوال کا ذمہ دار یا اس کے برعکس ان کے کچھ زیادہ مدت تک بقا کا موجب تھا؟ اس نقطہ نظر سے جب کبھی اس عہد کے حالات کا تفحّص کیا جائے گا، یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ گیارہویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) کا زمانہ ہندوستان میں ایک ایسا زمانہ تھا جس میں اس ملک کے باشندے نصف النہار پر پہنچ کر زوال کی طرف سرعت کے ساتھ مائل ہو چکے تھے۔ امن و امان، خوشحالی، لوازم تمدن کی فراوانی، اسباب عیش

کی افراط اور اندرونی و بیرونی خطرات سے بے خوفی شاہجہاں کے عہد میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور اس نے ان کے قوائے فکر و عمل کو سرد کرنا اور ان کی اخلاقی و معنوی حالت کو بگاڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ انسانی قوتیں جو صرف جد و جہد، کشمکش، مزاحمت، اور مقابلہ سے ابھرتی ہیں، خوش باشی، بے خوفی اور مرفہ الحالی کی بدولت معطل ہونے لگی تھیں اور ان کی جگہ لوگوں میں وہ جذبات و داعیات ترقی کرنے لگے تھے جن کے اثر سے وہ اپنی معاشرت اور اپنے تمدن میں تکلف و تصنع، آرام و آسائش، زینت و آرائش، شان و شوکت، پاکیزگی و لطافت اور حسن و نزاکت کے دلدادہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں شاندار لباس، عالیشان عمارات، نفیس سواریاں، پاکیزہ ساز و سامان اور دوسرے تمام لوازم تمدن بڑھ رہے تھے مگر بہادر سپاہی، لائق سپہ سالار، بیدار مغز مدبر، قابل منتظم، اچھے کار فرما اور ماہر کار پرداز گھٹتے چلے جا رہے تھے۔ ایک طرف قدیم امرا کے خاندان جنہوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ میں بڑے بڑے قابل جوہر پیدا کیے تھے ایسے بانجھ ہو گئے کہ ان میں پھر وہ جوہر پیدا نہ ہوئے، دوسری طرف ملک کی عام زندگی بھی تمدن و تہذیب کی ترقی سے اتنی مسموم ہو گئی کہ امرا و وزرا کے طبقہ میں اہل ملک سے نئے آدمیوں کی بھرتی روز بروز کم ہوتی چلی گئی۔ یہ قحط الرجال ہندوستان میں اس قدر نمایاں ہو گیا تھا کہ عالمگیر اکثر اس کی شکایت کرتا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ اپنے رقعات میں لکھتا ہے کہ "از نایابی مردم کار آہ آہ"

سلطنت مغلیہ کو ہندوستان کے علاوہ ایران و توران سے بھی قابل آدمیوں کی رسد پہنچتی تھی جو تازہ خون، شاداب دماغ اور مستعد ہاتھ پاؤں لے کر آتے اور یہاں کی رزم و بزم میں ایک نئی جان ڈال دیتے تھے۔ مگر انحطاط کی جو وبا ہندوستان میں

چلی تھی وہی اس زمانہ میں ایران، توران، خراسان، عراق، روم وشام سب پر پھیلی ہوئی تھی ۱۶۲۶ء / ۱۶۲۷ء میں شاہ عباس صفوی کے انتقال کے بعد سے ایران میں بھی انحطاط شروع ہو گیا تھا جو صدی کے خاتمہ تک انتہا کو پہنچ گیا۔ جس سال ہندوستان میں افغانوں کی شورش شروع ہوئی اور جب ہندوستان میں محمد شاہ تخت پہ بیٹھا اس کے تین سال بعد ایران میں صفوی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا مگر افغان قوم بھی حکمرانی کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔ وہ تین سال سے زیادہ پوری سلطنت کے نظام کو نہ سنبھال سکی اور قریب اسی سال ایران کی نئی افغانی سلطنت کا خاتمہ ہوا جس سال نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کی انتہائی بدنظمی سے مایوس ہو کر دکن کی راہ لی۔ ترکستان اور ماوراء النہر کی حالت ایران و افغانستان سے بھی بدتر تھی۔ وہاں وہ طوائف الملوکی شروع ہو چکی تھی جو گھن کی طرح ساری ترکی قوم کی قوت کو کھا گئی اور جس کی بدولت ... صدی ڈیڑھ صدی بعد زار روس کی سلطنت نے پورے ترکستان کو ہضم کر لیا۔

اس طرح ہندوستان میں کام کے ... کی پیداوار کم اور بیرونی ہند سے ان کی رسد کم تر ہو جانے کے سبب سے سلطنت مغلیہ میں اتنے بڑے ملک کے عظیم الشان نظام حکومت کو سنبھالنے اور قوت کے ساتھ چلانے کی صلاحیت کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن اس کمزوری کے اثرات کو نمایاں اور غالب ہونے سے جس چیز نے روک رکھا تھا وہ عالمگیر جیسے زبردست حکمران کی ذات تھی۔ اس کے سخت سے سخت مخالف بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ سادگی، جفاکشی، سپاہیانہ مستعدی، انتھک محنت، امورِ مملکت کی شخصی نگرانی، حالات کو سمجھنے کی صلاحیت، اور آدمیوں کو پرکھنے اور ان سے کام لینے کی قابلیت میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی گہری نگاہوں سے دیکھ لیا

کہ اس کا ملک قحط الرجال میں مبتلا ہو چکا ہے۔ تمدن و تہذیب نے اہل ملک کو آرام طلب اور عیش پسند بنا دیا ہے۔ امن و امان نے ان کی جنگی روح کو سرد کر دیا ہے خوشحالی و فارغ البالی نے ان کو سعی و کوشش سے مستعفی کر دیا ہے اور ان میں کام کرنے کی قوتیں کم اور لطف اٹھانے کی قوتیں زیادہ ہو رہی ہیں۔ اس حالت میں اس نے ہندوستان کے اندر اور باہر سے جو بہترین آدمی مل سکتے تھے ان کو چھانٹ چھانٹ کر فراہم کیا ان کے جوہر اور ان کی قابلیت کے مطابق ان کی تربیت کی۔ ان سے اعلیٰ ذمہ داری کے کام لیے۔ ہر شخص کو اس کام پر لگایا جس کا وہ اہل تھا اور کسی کو اس منصب اور مرتبے تک نہ بڑھنے دیا جس کے تحمل کی اس میں صلاحیت نہ تھی۔ اسد خاں، ذوالفقار خاں، غازی الدین خاں فیروز جنگ، محمد امین خاں، چین قلیج خاں، حمید الدین خاں، روح اللہ خاں بخشی، فتح اللہ خاں، عضد الدولہ عوض خاں، تربیت خاں میر آتش، حسن علی خاں، شیخ نظام حیدر آبادی، عنایت اللہ کشمیری اور ایسے بہت سے آدمیوں کو جو اپنے عہد کے بہترین قائد، مدبر اور منتظم تھے، اس نے خود اپنی تربیت سے بنایا۔ ان سے کام لیا اور انہیں موزوں مقام پر رکھا۔ پھر اس نے اپنے نظامِ حکومت کو جڑ سے لے کر چوٹی تک اپنی شدید نگرانی میں رکھا۔ صوبہ داروں اور سپہ سالاروں سے لیکر فوجداروں، دیوانوں اور متصدیوں تک حکومت کا کوئی عامل بادشاہ کی شخصی نگرانی سے آزاد نہ تھا اور اس کے خوف سے اپنے کارِ مفوّضہ میں غفلت نہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح فوج اور امرائے فوج کو بھی اس نے مسلسل چالیس برس تک لڑائیوں میں مشغول رکھا اور ان سے ایسی تھکا دینے والی محنت لی کہ عیش پسندی کا نشہ ہرن ہو گیا۔

مگر یہ سب کچھ شخص واحد کی کوشش اور رہنمائی کا نتیجہ تھا اور اسی

شخصی اغراض پر قربان کیا جانے لگا۔ امراء اور صوبہ دار ایک دوسرے کے خلاف لڑائے گئے۔ سلطنت کے ذمہ دار عہدہ داروں کے مقابلہ میں مخالفوں اور دشمنوں تک کی ہمت افزائی کی گئی۔ قانون و آئین کا احترام اٹھ گیا۔ حکومت کا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ اطراف ملک میں عام ابتری و طوائف الملوکی پھیل گئی اور وہ حبلِ متین جس نے سلطنت کے اجزاء کو ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ رکھا تھا پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ عالمگیر کی وفات سے محمد شاہ کی تخت نشینی تک ۱۳ سال کی مختصر مدت میں سات خونریز معرکے محض حصول سلطنت کے لیے پیش آئے جنھوں نے سلطنت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ درباری سازشوں کی بدولت متعدد امرا اور صوبہ دار ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے اور وہ قوت جو سلطنت کی خدمت میں صرف ہونی چاہیئے تھی اس طرح برباد ہوئی۔ خانہ جنگیوں کے بعد کامیاب فریق نے مخالف فریق کے حامیوں کو کچل ڈالا۔ اور ان میں بہت سے قابل اور کار آمد آدمی تباہ ہو گئے۔ مختلف سیاسی پارٹیوں میں توازن قائم رکھنے والی کوئی قوت نہ تھی اس لیے جو پارٹی برسر اقتدار آئی اس نے مقابل کی پارٹی کو برباد کرنے کی کوشش کی اور اس طریقہ سے بھی قوت کا ایک بڑا حصہ ضائع کر دیا گیا۔ مرکزی سلطنت کی کمزوری اور غلط پالیسی کی بدولت ملک کے مختلف حصوں میں سلطنت کے خلاف جنگجو قوموں نے خروج کیا۔ سکھ، جاٹ، مرہٹے، بندیلے اور راٹھور طوفان کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک جماعت نے سیاسی اغراض کے لیے ہندوؤں میں مغل سلطنت کے خلاف مذہبی جوش پیدا کیا اور یہ یورشیں بھی سلطنت کی تباہی کا ایک ذریعہ بن گئیں۔ حکومت کے اس طرح ابتری و بدنظمی کی حالت میں مبتلا ہو جانے سے مالگذاری اور خراج کی تحصیل میں کمی واقع ہونے

لگی۔ تجارت اور صنعت وحرفت کا بازار سرد پڑنے لگا جس سے جملہ اقسام کے محاصل پر برا اثر پڑا اور روز بروز حکومت کے ذرائع آمدنی مسدود ہوتے چلے گئے مگر اس کے باوجود جو تھوڑے بہت اموال خزانۂ سلطنت میں داخل ہوتے بھی تھے، ان کو صحیح مصارف میں صرف کرنے کے بجائے ایسے غلط مصارف میں صرف کیا جاتا تھا جو بجائے مفید ہونے کے الٹے مضر ہوتے تھے۔ مصاحبوں مسخروں، ڈوم ڈھاڑیوں اور سامان عیش و نشاط پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جاتا تھا اور اہل فضل وکمال بھوکے مرتے تھے۔ فوج تنخواہوں کے لیے ترستی تھی۔ جنگی ضرورت کے مواقع پر سامان جنگ کے لیے شاہی توشہ خانے کے برتن تک بیچنے کی نوبت آجاتی تھی۔

ان حالات میں ملک کے قابل لوگوں نے دیکھا کہ مرکزی سلطنت میں ترقی کا مدار قابلیت اور حسن خدمت پر نہیں ہے۔ شاہی اقتدار خواجہ سراؤں خوشامدی مصاحبوں اور سازشی درباریوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان لوگوں کی موجودگی میں ملک اور سلطنت کی کوئی خدمت کرنا محال اور اس خدمت کے صلہ میں ترقی حاصل کرنا غیر ممکن بلکہ اپنی رہی سہی عزت وآبرو بچانی بھی مشکل ہے۔ لامحالہ ان کو اپنی بھلائی اس میں نظر آئی کہ مرکز سے الگ ہو کر جس علاقہ پر قابو پائیں اس میں اپنی جداگانہ ریاست قائم کرلیں۔ جو لوگ اتنے طاقتور نہ تھے کہ خود کوئی ریاست قائم کر سکتے انہوں نے کسی طاقتور امیر کا دامن تھام لیا اور اس کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ رعایا بھی آئے دن کی طوائف الملوکی سے بیزار تھی۔ مرکزی سلطنت کے ہر نئے انقلاب پہ ایک نیا صوبہ دار بھیجا جاتا

تھا۔وہ آئندہ کسی دوسرے انقلاب کے اندیشہ سے رعایا کو لوٹ لوٹ کر جلدی سے جلدی اپنی جیبیں پُر کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جب کوئی دوسرا صوبہ دار آتا تو پہلا صوبہ دار اس کی مزاحمت کرتا اور رعایا اس پیچیدگی میں پھنس جاتی کہ کس کا ساتھ دے۔ان مشکلات سے عاجز آکر صوبوں کے باشندے بھی اس کو ترجیح دیتے تھے کہ کوئی طاقتور شخص ان کے صوبہ میں اپنی مستقل ریاست قائم کرلے اور ایک باضابطہ اور پائیدار حکومت کے سایہ میں آکر وہ اس روز کی مصیبت سے نجات پائیں۔انہی اسباب سے بنگال، اودھ، روھیلکھنڈ، مالوہ، گجرات، سندھ اور دوسرے اقطاع میں چھوٹی بڑی ریاستیں قائم ہونی شروع ہوئیں۔

اسی سلسلہ کا واقعہ دکن میں نظام الملک کی مستقل ریاست کا قیام بھی تھا۔ نظام الملک اور ان کے خاندان نے دکن میں ستر اسی سال تک سلطنت کی اعلیٰ خدمات انجام دی تھیں۔ان کے دادا، ان کے والد، ان کے چچا، ان کے پھوپھا اور وہ خود اس خطۂ ملک میں سپہ سالاری، صوبہ داری اور فوجداری کی خدمات پر رہ چکے تھے۔بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح میں ان کے دادا کا خون اور ان کے والد کا ہاتھ شامل تھا۔دکن کی رعایا، زمیندار، جاگیردار اور شاہی عمال سب پر ان کے ذاتی اور خاندانی اثرات تھے۔اس کے علاوہ ان کے ساتھ تورانی امرا کی بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی جن میں سے اکثر دکن کے کسی نہ کسی حصہ میں جنگی اور انتظامی عہدوں پر رہ چکے تھے۔اس وجہ سے کسی دوسرے صوبہ کی بہ نسبت ان کے لیے دکن میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے زیادہ مواقع تھے۔یہی سبب ہے کہ انہوں نے مالوہ اور گجرات کے صوبوں کو چھوڑ کر دکن کو ترجیح دی حالانکہ جب انہوں نے اپنی مستقل ریاست قائم کرنے کا خیال کیا

تھا، اس وقت ان دونوں صوبوں پر بھی ان کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ مالوہ اور گجرات کو ترجیح نہ دینے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ دونوں صوبے دارالسلطنت سے نسبتاً قریب تھے۔ اور ان میں رہنے سے اندیشہ تھا کہ شاہی حکومت سے کسی وقت براہ راست تصادم کی نوبت آئے گی جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔

ماخذ:-

منتخب اللباب جلد دوم۔

فتوحات آصفی۔

مآثر الامراء۔

مآثر نظامی۔

سروِ آزاد
خزانۂ عامرہ } تالیف غلام علی آزاد بلگرامی۔

سیر المتاخرین۔ تالیف سید غلام حسین خاں طباطبائی۔
طبع کلکتہ سنہ ۱۲۴۸ھ

حدیقۃ العالم۔

گلزارِ آصفیہ۔

تزکِ آصفیہ۔ تالیف تجلی علی شاہ۔

تاریخ ظفرہ۔ تالیف منشی گردہاری لال احقر طبع گورکھپور سنہ ۱۹۲۷ء۔

رقعاتِ موسوی خاں جرأت میر منشی نواب آصف جاہ اول۔
(قلمی نسخہ۔ دفتر دیوانی حیدرآباد دکن)

بساط الغنائم۔ تالیف لچھمی نرائن شفیق۔ طبع حیدرآباد سنہ ۱۳۲۲ھ

سیر الہند و گل گشت دکن۔

خزانۂ رسول خانی۔

حقیقتہائے ہندوستان (قلمی) تالیف لچھمی نارائن شفیق (کتب خانہ آصفیہ
حیدرآباد دکن)

Later Mughals by Irvine.

A History of the Mahrattas Grant Duff. Calcutta 1918.

History of the Deccan, J. D. B. Gribble.
London 1896 & 1924

A History of the Mahrattas, Waring.

Rise of the Peshwas, H. N. Sinha. The Indian
Press Allahabad 1931.

The Nizam, Briggs.

History of India Elphinston. 5th Edition, 1866.

Historical and Descriptive Skectch of his Highness
the Nizam's Dominions, S. Husain Bilgrami and
C. Willmott.

باب سوم

نظام الملک آصف جاہ

دولت آصفیہ اور سلطنت مغلیہ کے تعلقات کی نوعیت

ہندوستان اور دوسرے تمام مشرقی ممالک میں جن اخلاقی نظریات نے سیاسیات پر غلبہ حاصل کر رکھا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک سلطنت کے ملازموں میں سے اگر کوئی شخص اس سلطنت کے خلاف بغاوت کر کے اپنی الگ ریاست کی بنا ڈالتا ہے یا خود تخت شاہی پر قبضہ کر لیتا ہے تو لوگ اسے غدار اور نمک حرام سمجھتے ہیں۔ اس کی اطاعت کو بدترین اخلاقی جرم خیال کرتے ہیں اور ملک کے عوام و خواص کے دلوں میں مدتوں تک اس کے خلاف بغض و عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے جس کو دبانے اور بجھانے میں اس کو بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ باستثنا ان چند صورتوں کے جن میں شاہی خاندان اپنے مظالم اور بُرے اعمال کے سبب سے سخت نامقبول ہو چکا ہو اور لوگ اس کے خلاف بغاوت کرنے والے کو اپنا ناجی سمجھنے پر مجبور ہوں۔ یہ قاعدہ کلیہ اور تمام صورتوں پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق میں جب کوئی سلطنت طویل مدت تک قائم رہ جاتی ہے اور باشندے اس کے شاہی خاندان سے مانوس ہو جاتے ہیں تو پھر اسکی انتہائی کمزوری، نالائقی اور بدنظمی کے باوجود ایک زمانہ دراز تک کوئی شخص اسکے خلاف علانیہ بغاوت کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اسکے صوبہ دار عملاً خود مختار فرمانروا بن جاتے ہیں مگر ظاہر میں اس کی وفاداری و اطاعت کا دم بھرنے پر اپنے آپکو مجبور پاتے ہیں اور جو کوئی اسکے مقابلہ میں شاہی کا دعویٰ کرتا ہے اسے رائے عام کی ایسی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اسکی نئی بادشاہی کی جڑ بنیاد ہل جاتی

ہے اور لیسا اوقات خود اس کی اپنی رعایا اس کے خلاف شورش برپا کر کے اسکا خاتمہ کر دیتی ہے سلطنت مغلیہ کو جس چیز نے انتہائی ضعف انتشار کے باوجود سو ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان کی سیادت پر برقرار رکھا وہ یہی خیالی قوت تھی اسنے ذوالفقار خاں کو قوت و اقتدار کے منتہا پر پہنچ جانے کے باوجود بادشاہی کا دعویٰ کرنے سے باز رکھا اس نے سادات بارھہ کو بادشاہ گر بن جانیکے باوجود بادشاہ بن جانے سے روکا اور اسی نے نظام الملک کو دکن کی بادشاہی کا اعلان کرنے سے محترز رکھا حالانکہ جملہ انتظامی اور سیاسی حیثیات سے اب دکن ان کا تھا اور مغل بادشاہ کو اس پر برائے نام سیادت سے زیادہ کوئی اقتدار حاصل نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس عام قاعدہ کی پابندی کر کے نظام الملک نے اپنے آپ کو اس اعلیٰ سیاسی و آئینی مرتبہ سے محروم کر لیا جو بادشاہی کے محض ایک اعلان سے ان کو حاصل ہو سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو دو زبردست فوائد بھی حاصل ہوئے جو اعلان شاہی کی صورت میں ہرگز حاصل نہ ہوتے۔

پہلا فائدہ جو اس زمانہ میں صرف اخلاقی تھا مگر بعد میں اسنے سیاسی اہمیت بھی حاصل کر لی یہ تھا کہ وہ نہ صرف رائے عام کی ملامت اور ناراضی سے محفوظ رہے بلکہ جس طرح انہوں نے اور انکی اولاد نے انحراف کی پوری قدرت رکھنے کے باوجود بادشاہ کی اطاعت کی اور مقام شاہی کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا اس کی بنا پر عام اہل ہند اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے اور یہ چیز اس زمانہ میں دولت آصفیہ کیلئے بہت بڑی قوت بن گئی جب سیاسی خطرات نے ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح اس ریاست کو بھی ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ انہیں وہ مشکلات پیش نہ آئیں جو ایسے حالات میں شاہی حکومت سے الگ ہونے اور اپنی علیحدہ سلطنت قائم کرنے سے لازماً پیش آتیں۔ اگر وہ اس وقت بادشاہی کا اعلان کر دیتے تو یقیناً ان کو مخالفت کے ایک بہت بڑے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ جنوبی ہند کے طاقتور فوجدار جن پر ابھی تک ان کی گرفت مضبوط نہ ہوئی تھی، دفعتہً ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے۔ کرناٹک کے بڑے اور چھوٹے پالیگر، نائک اور زمیندار جنہیں صرف شاہی حکومت کی ہیبت و قوت نے باجگذار بنا رکھا تھا، یکبارگی ان کے دائرۂ اطاعت سے نکل جاتے۔ شمال کے بہت سے سردار جو نظام الملک سے حسد رکھتے تھے ان کے مقابلہ میں شاہی حکومت کی حمایت کے لیے کھڑے ہو جاتے اور سب سے زیادہ یہ کہ مرہٹے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں ذرہ برابر تامل نہ کرتے۔ محمد شاہ اور اس کے نادان مشیروں کی غلط سیاست سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ محض نظام الملک کو نیچا دکھانے کے لیے باجی راؤ کو دکن کے دو تین صوبوں کا پروانہ عطا کر دیتے اور آن واحد میں مہاراشٹر کے برگی[1] تمام اقطاع دکن پر پھیل کر حکومت کا سارا شیرازہ درہم برہم کر ڈالتے۔ ان زبردست مخالفتوں سے مقابلہ کرنے میں نظام الملک جن ہتھیاروں سے کام لیتے وہ خود بھی پوری طرح قابلِ اعتماد نہ ہوتے۔ کیونکہ خود ان کی رعایا، ان کے ملازم ان کے سپاہی اور ان کے بہت سے سرداران فوج بھی دلوں میں ان کے مخالف ہوتے اور نازک مواقع پر ان کا ساتھ چھوڑ کر مخالفوں سے مل جاتے۔ ایسے

---

[1] مرہٹہ گوریلوں کے لیے یہ لفظ مستعمل تھا۔

حالات میں اول تو دولت آصفیہ کا قیام ہی محال تھا اور اگر بفرضِ محال نظام الملک اپنی اعلیٰ قابلیت سے اس میں کسی حد تک کامیاب ہو بھی جاتے تو ان کی اولاد میں کوئی اس قابل نہ تھا جو ان کے بعد اس امرِ خطیر کو سنبھال سکتا۔

ان مختلف پہلوؤں پر نظر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظام الملک کا شاہی حکومت سے علانیہ انحراف نہ کرنا اور مرتبۂ شاہی حاصل کرنے کی طمع سے جو ایسی زبردست طمع ہے کہ قدرت و استطاعت حاصل ہونے کے بعد بڑے بڑے ضابطہ انسانوں کے لیے بھی اس کا روکنا مشکل ہو جاتا ہے، احتراز کرنا محض مشرقی تخیل کی بنا پر ایک شریفانہ اور وفا شعارانہ فعل ہی نہ تھا بلکہ ایک ایسا فعل بھی تھا جو غایت درجہ تدبر اور معاملہ فہمی کا ثبوت پیش کرتا ہے اور اس پر صرف وہی لوگ قادر ہو سکتے ہیں جنکی عقل کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتی۔

یہ سوال ایک حد تک پیچیدہ ہے کہ اس ظاہری اطاعت اور باطنی خود مختاری کی حالت میں دولت آصفیہ اور سلطنتِ مغلیہ کے تعلقات کی سیاسی اور آئینی نوعیت کیا تھی۔ لیکن سادہ طریقہ سے اسکو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ عملاً خود مختار ہو جانے کے باوجود جس چیز نے نظام الملک اور ان کے جانشینوں کو مغل بادشاہ کی اطاعت کا دم بھرنے پر آمادہ کیا تھا، وہ کوئی سیاسی، و مادی قوت نہ تھی بلکہ محض ایک اخلاقی قوت تھی اس لیے دولت آصفیہ پر سلطنت مغلیہ کا شاہی اقتدار بھی محض ظاہری اور نمائشی تھا۔ نظام الملک اور ان کے جانشین لبظاہر مغل سلطنت کے صوبہ دار تھے، صوبہ داری پر ان کا تقرر شاہی فرمان سے ہوتا تھا اور وہ بادشاہ کے عطا کردہ خطابات و مناصب فخر کے ساتھ حاصل کرتے اور انکو سرمایۂ عزت سمجھتے تھے مگر دکن پر ان کی حکومت بادشاہ کی عطا کردہ نہ تھی نہ اس حکومت کا قیام بادشاہ کی قوت پر مبنی تھا، نہ بادشاہ کے

ارادہ کو ان کے عزل و نصب میں کوئی دخل تھا جہاں تک حکومت کے انتظام اور کلیات و جزئیات کے رتق و فتق اور داخلی و خارجی سیاست کا تعلق تھا اس میں فرمانروائے دکن اتنا ہی مطلق العنان تھا جتنا ایک خود مختار بادشاہ ہوتا ہے۔ دکن کے صوبوں اور قسمتوں کے صوبہ دار اور فوجدار نظام کے تابع فرمان تھے اور ان کا عزل و نصب کلیتہً نظام کے اختیار میں تھا مگر ظاہری حیثیت سے وہ صوبہ دار دکن کے نہیں بلکہ بادشاہ کے صوبہ دار و فوجدار تھے اور ایک مدت تک ان کے تقرر کا فرمان بھی بادشاہ کی جانب سے آیا کرتا تھا۔ یہاں کی باجگذار ریاستیں بھی حقیقت میں نظام کی باجگذار تھیں نظام ہی کو خراج ادا کرتی تھیں اور نظام ہی ان پر بالادستی کے اختیارات استعمال کرتے تھے مگر ان پر قانونی سیادت نظام کو نہیں مغل بادشاہ کو حاصل تھی۔ وہ نظام کو اپنے بادشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ بادشاہ کے صوبہ دار کی حیثیت سے خراج ادا کرتے تھے۔ ان پر صوبہ دار دکن کی بالادستی و سیادت نہ کبھی رسمی حیثیت سے ظاہر کی گئی اور نہ انہوں نے اس کو رسمی حیثیت سے تسلیم کیا۔ حکومت کے انتظام میں بھی بادشاہ کے اس ظاہری اقتدار کو برقرار رکھا گیا۔ نظام کے ساتھ بادشاہ کا ایک دیوان رہا کرتا تھا جو دیوان تن ہی کہلاتا تھا۔ مگر یہ دیوان خود نظام کا اپنا منتخب کیا ہوا ہوتا تھا۔ امورِ ریاست میں اس کو کوئی دخل نہ تھا اور اس کا کام صرف یہ تھا کہ نظام جن لوگوں کو جاگیریں، انعام اور مناصب وغیرہ عطا کریں ان کی توثیق کے لیے وہ بادشاہ کی جانب سے سند لکھ دیا کرے۔ غرض سلطنتِ مغلیہ اور دولت آصفیہ کا اضافی تعلق کچھ اس نوع کا تھا کہ نہ اس کو کامل استقلال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ حقیقی تابعیت سے بلکہ وہ ان دونوں کے بین بین ایک مبہم اور غیر معین حالت

تھی جس نے کوئی قطعی اور واضح آئینی شکل اختیار نہ کی تھی مگر اس حالت کا میلان استقلال کی طرف زیادہ اور تابعیت کی طرف برائے نام تھا۔ تابع و متبوع کے درمیان گویا اس امر پر ایک ذہنی سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ متبوع اپنی سیادت کے ظاہری اعتراف و اقرار پر قانع رہے گا کیونکہ اس میں بزور اس کو قائم کرنے کی قدرت نہ تھی اور تابع صرف اس پر مطمئن رہے گا کہ اسے حقیقی اور واقعی استقلال حاصل ہے کیونکہ متبوع کی اخلاقی و معنوی قوت کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے استقلال کو نمایاں کرنے اور تابعیت کے بدنما رنگ کو دھو ڈالنے کا یارانہ رکھتا تھا اس لحاظ سے سلطنت مغلیہ میں دولت آصفیہ کی حیثیت وہی تھی جو دولت عثمانیہ میں محمد علی پاشا خدیو مصر کی اور دولت عباسیہ کے دور انحطاط میں ایران، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ کے رئیسوں کی تھی۔

دکن میں مرہٹوں سے کشمکش

مبارز خاں اور اس کے بیٹوں کی قوت کا استیصال اور صوبہ حیدر آباد پر پوری طرح قبضہ کرنے کے بعد نظام الملک نے سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ یہ تھی کہ اپنی ریاست کے لیے ایسے مقام کو محفوظ کر لیں جو بیرونی خطرات سے دور ہو۔ اورنگ آباد، بیدر، اور بیجاپور مرہٹوں سے بہت قریب تھے اور مرہٹہ برگی ان علاقوں میں وبائی جراثیم کی طرح پھیل چکے تھے ان میں کسی مقام کو ریاست کا مرکز بنانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لہذا انہوں نے حیدر آباد کو اسکے لیے منتخب کیا اور اس صوبہ میں کامل امن و امان قائم کرنیکی کوشش کی۔ یہاں انہوں نے واکن کھیڑہ، کوہیر اور ایلگندل کے سرکش زمینداروں کی طرف فوجیں بھیجیں اور ان کو بزور شمشیر مطیع کیا۔ ملک کے دوسرے اقطاع میں جہاں جہاں شریر جماعتوں نے فساد برپا

کر رکھا تھا، تھانے قائم کر کے بدامنی کا سدِ باب کیا۔ اس کے بعد انہوں نے مرہٹوں کی طرف توجہ کی۔ مبارز خاں نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں حسین علی خاں کی طے کردہ شرائط صلح کو قبول نہیں کیا تھا اور اپنے صوبہ سے مرہٹوں کو چوتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مرہٹوں نے فوجی قوت سے اپنا یہ حق قائم کرنے کی جتنی کوششیں کیں مبارز خاں نے ان کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا اور بارہا ان کو شکستیں دیں۔ اس وجہ سے صوبہ حیدر آباد میں مرہٹوں کا باقاعدہ عمل دخل جیسا دکن کے دوسرے صوبوں میں تھا نہ ہو سکا مگر اس کے باوجود وہ اس صوبہ کو ان کی دست برد سے محفوظ نہ رکھ سکا تھا کیونکہ مرہٹے اپنے قومی طریقِ جنگ کے مطابق اس صوبہ کے اطراف و نواحی میں پھیل گئے تھے۔ عام رہزنی اور لوٹ مار کر کے انہوں نے شاہراہوں کو اس قدر غیر محفوظ کر دیا تھا کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت محال ہو گئی تھی۔ زمینداروں اور عام رعایا سے بھی جہاں ان کا بس چل جاتا وہ چوتھ اور سردیس مکھی وصول کر لیتے تھے۔ اور اکثر اوقات یہ تحصیل معاہدہ کی مقررہ شرح سے بہت زیادہ ہوتی تھی۔ نظام الملک نے اس فتنہ کا سدِ باب کرنے کیلئے باجی راؤ کو چھوڑ کر سرہی پت راؤ پرتی ندھی سے گفتگو کی جس سے باجی راؤ کی مخالفت کوئی مخفی راز نہ تھی اور اس کی معرفت راجہ ساہو سے یہ سمجھوتہ کر لیا کہ آئندہ سے حیدر آباد صوبہ میں مرہٹوں کو براہِ راست چوتھ، سردیس مکھی اور راہداری وصول کرنے کا حق نہ ہوگا، پیشوا کے گماشتے جو ان محاصل کی تحصیل کے لیے مقرر ہیں ہٹا لیے جائیں گے اور ان محاصل کے عوض ایک مقررہ رقم سالانہ خزانۂ عامرہ سے ادا کی جاتی رہے گی[1]۔ اس

---

[1] اس سمجھوتہ کی تفصیلات کہیں مذکور نہیں ہیں۔ منتخب اللباب اور حدیقۃ العالم میں صرف اس کا خلاصہ دیا گیا ہے۔

سمجھوتہ پر ساہو کو راضی کرنے کے لیے نظام الملک نے اس کے ساتھ متعدد رعائتیں کیں۔ اندراپور کے قریب اس کو ایک جاگیر عطا کی ایک اور جاگیر برار میں پرتی ندھی کو دی اور اس سے پہلے ساہو کے مخالف سردار رنبھاجی نبالکر (راؤ نبھا) کو جو جاگیر پونا کے نواحی میں دی تھی اسے موقوف کر کے کرملہ کے اطراف میں ایک دوسری جاگیر دے دی۔

باجی راؤ نے اس سمجھوتہ کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ یہ مخالفت صرف اس بنا پر ہی نہ تھی کہ یہ اس کے مخالف پرتی ندھی کا طے کیا ہوا تھا اور اس کے علم کے بغیر طے کیا گیا تھا بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پیشوا کی رائے میں مغلوں سے حقوق اور معاملات کا واضح تصفیہ کرنا مرہٹوں کے مفاد کے خلاف تھا کیونکہ حقوق کو مبہم رکھنے اور معاملات کو الجھا ہوا رہنے دینے میں ان کو موقع حاصل تھا کہ اپنی قوت اور مغلوں کے ضعف کی نسبت سے جس قدر زیادہ فائدہ اٹھا سکیں اٹھائیں۔ نیز وہ چوتھ اور سردیسمکھی وغیرہ کی تحصیل کے بجائے ایک مقررہ رقم لینے کا بھی مخالف تھا کیونکہ اس کے نزدیک مغل حکومت کے اقطاع میں مرہٹوں کے گماشتوں اور تحصیل داروں کا مقرر ہونا اور مرہٹہ برگیوں کا تحصیل کے نام سے پھیل جانا درحقیقت یہ معنی رکھتا تھا کہ ان اقطاع میں مرہٹہ حکومت بتدریج قائم ہو رہی ہے اور ایسی حالت میں اس امر کا قوی امکان تھا کہ ملک کے جس حصہ پر مغلوں کی گرفت کمزور ہو وہاں مرہٹے بلا کسی زحمت و مزاحمت کے اپنا تسلط قائم کرلیں۔

ان وجوہ سے باجی راؤ نے سمجھوتہ کو رد کر دیا اور پرتی ندھی نے اس کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ اس پر دونوں میں سخت نزاع برپا ہوئی اور سنہ ۱۱۳۹ھ کے اواخر (سنہ ۱۷۲۷ء) میں اس نے کھلم کھلا مخالفت کی صورت اختیار کرلی۔ نظام الملک اس اختلاف سے

فائدہ اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ انہوں نے باجی راؤ کے مقابلہ میں سنبھاجی راجہ کولہاپور کو کھڑا کر دیا اور چندر سین جادو راؤ رنبھا نبالکر اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کو اس کی مدد کے لیے اشارہ کیا۔ چندر سین کی معرفت سنبھاجی نے صوبہ دار دکن کے سامنے دعویٰ پیش کیا کہ ستارہ اور کولہاپور کے خاندان سیواجی کے یکساں وارث ہیں اس لیے ممالک دکن کی چوتھ اور سردیس مکھی میں کولہاپور کے خاندان کو برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔ صوبہ دار نے قانون رائج الوقت کے مطابق حکم جاری کیا کہ تا تصفیۂ مقدمہ فریقِ ثانی کو چوتھ اور سردیس مکھی کی تحصیل سے روک دیا جائے۔ چنانچہ ہر طرف ساہو کے مکاسہ داروں اور نائبان سردیس مکھی کو اٹھا دینے کے احکام بھیج دیئے گئے۔

اب باجی راؤ کے لیے ضبط کرنا مشکل تھا۔ بارش کے اختتام تک اس نے مجبوراً صبر کیا۔ پھر ۱۱۴۰ھ کی ابتدا، اواخر ۱۷۲۷ء میں وہ فوجیں لے کر غارت گری کرتا ہوا جالنہ کی طرف بڑھا۔ ادھر سے نظام الملک مقابلہ کے لیے آئے۔ جالنہ کے قریب ایک مختصر سی جنگ کے بعد باجی راؤ ماہور کی طرف بھاگا۔ پھر اورنگ آباد ہوتا ہوا خاندیس کی طرف چلا اور مشہور کر دیا کہ برہانپور کو غارت کرنے کا ارادہ ہے۔ نظام الملک برہانپور کو بچانے کے لیے روانہ ہوئے مگر اجنٹہ گھاٹ تک پہنچے تھے کہ معلوم ہوا پیشوا گجرات کی طرف غارت گری کرتا ہوا چلا گیا ہے۔ وہ اس کے تعاقب میں چلے اور سورت تک پہنچ گئے مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ مرہٹوں کے ہلکے رسالے جس تیز رفتاری سے نقل و حرکت کرتے تھے، اسکے مقابلہ میں ساز و سامان سے لدی ہوئی مغل فوج کی رفتار نہایت سست تھی۔ پیشوا کی اس چلت پھرت کو روکنا نظام کے لیے مشکل تھا۔ علاوہ بریں یہ مرہٹوں کی ایک مستقل جنگی چال تھی کہ کھلے میدان میں باقاعدہ فوج کے مقابلہ سے جہاں تک ممکن ہو پہلو

بچائیں اور ملک کے اطراف و اکناف میں اچانک چھاپے مار کر اور عام تباہی و بربادی پھیلا کر غنیم کو پریشان کر دیں۔ اس چال کو ناکام کرنے کے لیے نظام الملک نے سورت سے سیدھا پونا کا رخ کیا کیونکہ جب مرہٹوں کا خود اپنا گھر خطرہ میں ہوگا تو مجبوراً وہ اس کو بچانے کے لیے آئیں گے اور اس طرح ایک فیصلہ کن جنگ کا موقع مل جائے گا لیکن ابھی وہ احمد نگر تک نہ پہنچے تھے کہ مرہٹوں نے ہر طرف سے ان کو آگھیرا اور اپنے معروف طریق کے مطابق جنگ قزاقی شروع کر دی جسے دکن کی اصطلاح میں ''برگی گری'' (گوریلا جنگ) کہتے ہیں۔ ان کے تیز سوار چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں چاروں طرف پھیل گئے۔ رسد کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ جنگلوں میں چارے کو جلا ڈالا فصلوں اور اس پاس

؎ مرہٹوں کے اس طریق جنگ کو اورم (Orme) نے خوب بیان کیا ہے۔ وہ خود اس زمانہ میں موجود تھا اور اس قسم کی لڑائیاں بچشم خود دیکھ چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

''مرہٹہ فوج کی طاقت زیادہ تر ان کے کثیر التعداد سواروں پر مشتمل ہے جو تکان اور صعوبتوں کا مقابلہ کرنے میں ہندوستان کی تمام دوسری فوجوں سے بڑھے ہوئے ہیں اور مشہور ہے کہ ان کی بڑی جماعتیں ایک ایک دن میں پچاس پچاس میل کے دھاوے مار جاتی ہیں۔ یہ لوگ عام زد و خورد سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہیں اور جنگ کرنے میں وہ اس کے سوا کوئی اور خیال نہیں کرتے کہ دشمن کے ملک کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں۔ اس غرض کے لیے وہ جانور ہانک لے جاتے ہیں، فصلیں خراب کرتے ہیں، بستیاں جلا ڈالتے ہیں اور ایسے ایسے ظلم و ستم کرتے ہیں جن کی وجہ سے غیر محفوظ علاقوں کے باشندے ان کی آمد کی پہلی خبر سنتے ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگ نکلتے ہیں۔ ان کی تیز نقل و حرکت اس رئیس کو جس سے وہ جنگ کرتے ہیں اس کا

کے دیہات کو تباہ کر دیا اور ان طریقوں سے مغل فوج کو قحط زدہ کر دیا جہاں مغل سپاہ کا غلبہ دیکھا وہاں سے بھاگ نکلے اور جہاں کسی قلیل جماعت کو پالیا اس پر حملہ کر کے لوٹ مار کی اور چل دیئے۔ نظام الملک نے لوہے کو لوہے سے کاٹنا چاہا اور اپنے حلیف مرہٹوں کو حکم دیا کہ وہ بھی باجی راؤ کی برگی گری کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کریں مگر چندرسین کی فوج مرہٹوں اور مغلوں سے مخلوط تھی، اسے برگی گری کے طریقوں پر پورا عبور نہ تھا اور سنبھاجی کے کارکن، باجی راؤ سے ساز باز رکھتے تھے اس لیے وہ بھی کچھ نہ کر سکا۔ آخر جب نظام الملک کافی پریشان ہو چکے تو باجی راؤ نے عضدالدولہ عوض خاں کی معرفت صلح کی تجاویز پیش کیں جن کا خلاصہ یہ تھا۔

(۱) سنبھاجی کو پیشوا کے حوالہ کر دیا جائے۔

(۲) آئندہ کے لیے محاصل ملکی میں سے مرہٹوں کا پورا حصہ ملنے کی ضمانت دی جائے۔

بہت کم موقع دیتی ہے کہ وہ ان پر کوئی فیصلہ کن ضرب لگا سکے یا ان کے کسی دستہ ہی پر موثر حملہ کر سکے میدان جنگ میں ایک بڑی فوج کے لاحاصل مصارف کا بار، اور اس قسم کے دشمن سے جنگ کا موقع تک حاصل نہ ہونا اور سب سے زیادہ وہ نقصان جو ان کی عام غارت گری سے ملک کو پہنچتا ہے، یہ سب چیزیں مل کر ان حکومتوں کو جن سے وہ لڑتے ہیں اس بات پر بآسانی آمادہ کر دیتی ہے کہ روپیہ دے کر ان سے عافیت خرید لیں..... وہ لبسا اوقات اپنے دستے اور کبھی کبھی پوری پوری فوجیں کرایہ پر دے دیتے ہیں مگر ان کو کرایہ پر لینا خطرہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ فریق مخالف کی طرف سے اچھی شرائط پیش ہوں اور وہ اپنے حلیف کا ساتھ چھوڑ کر اس کے حریف سے نہ جامیں نیز وہ ان علاقوں میں بھی غارتگری سے باز نہیں آتے جن کی حفاظت کیلئے انکو کرایہ پر لیا جاتا ہے۔"

اورم جلد اول صفحہ ۲۰

(۳) بقایا جو اب تک ادا نہیں ہوئے ہیں ادا کر دیئے جائیں۔

نظام الملک نے آخر کی دونوں شرطوں کو قبول کر لیا مگر پہلی شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار تصفیہ اس پر ہوا کہ نظام الملک سنبھاجی کو پنہلہ تک اپنی حفاظت میں پہنچا کر چھوڑ دیں۔ اس کے بعد راجہ ساہو کو اختیار ہو گا کہ اس کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے اس طرح ۱۱۴۱ھ ۱۷۲۸ء میں دونوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ نظام اور باجی راؤ پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے اور دونوں نے ایک دوسرے کی ضیافت کی۔ اس کے بعد دکن کے صوبوں میں مرہٹوں کے مکاسہ دار اور گماشتہ پھر مقرر ہو گئے مگر صوبہ حیدر آباد کے متعلق وہ سمجھوتہ برقرار رہا جو راجہ ساہو اور نظام الملک کے درمیان ہو چکا تھا۔

اب پونا کے سیاسی مدبروں نے محسوس کیا کہ کولہاپور ریاست کا زور توڑ دینا ضروری ہے ورنہ صوبہ دار دکن ہمیشہ اس چلتے ہوئے ہتھیار کو اسی طرح استعمال کرتا رہے گا۔ چنانچہ دوسرے ہی سال انہوں نے سنبھاجی سے جنگ کی اور دریائے واژنا کے شمالی کنارے پر اسے سخت شکست دے کر بھگا دیا۔ اس جنگ میں خود تارا بائی اور اس کی بہو راجس بائی گرفتار ہو گئی تھی۔ اس لیے سنبھاجی بالکل بے بس ہو گیا اور اس نے ۱۱۴۳ھ ۱۷۳۰ء میں راجہ ساہو سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے اس کو کولہاپور کی چھوٹی سی ریاست پر (جو اب تک قائم ہے)، قناعت کرنی پڑی اور باقی تمام مرہٹہ مقبوضات پر سے اپنے دعادی کو چھوڑ دینا پڑا۔ اس طرح مرہٹوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے کا ایک بڑا ذریعہ نظام الملک کے ہاتھ سے نکل گیا۔

سنبھاجی کا زور ٹوٹ جانے سے دکن کے سیاسی توازن میں جو برہمی واقع ہو گئی تھی اس کو پورا کرنے کے لیے نظام الملک نے ایک اور قوت سے کام لینا چاہا مگر

اس میں بھی ان کو ناکامی ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ گجرات میں چند مرہٹہ سردار شاہی حکومت سے برسرپیکار تھے۔ اور ان کی محنتوں کا ثمرہ جو چوتھ اور سردیسکھی کی شکل میں حاصل ہوا تھا۔ باجی راؤ نے عین موقع پر ان کے منہ سے چھین لیا تھا۔ اس پر یہ سردار باجی راؤ کے خلاف نعل در آتش ہو رہے تھے اور اس سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ ان میں باجی راؤ کا سب سے زیادہ سرگرم مخالف ترمبک راؤ ڈبھارے تھا اور پیلاجی گیکواڑ، کنتاجی اور گھوجی بھانڈے اور داجی پووار اور دوسرے مرہٹہ سردار بھی اس کے حامی تھے۔ نظام الملک نے اس سے مراسلت شروع کی اور دونوں میں یہ قرارداد ہو گئی کہ گجرات کی طرف سے ترمبک راؤ اور حیدرآباد کی طرف سے نظام الملک پیش قدمی کریں اور پھر دونوں مل کر باجی راؤ پر ٹوٹ پڑیں۔ دوسری طرف نظام الملک نے مالوہ کے صوبہ دار محمد خاں بنگش سے بھی خط و کتابت کی اور اسے نربدا کے کنارے ایک مقام پر ملاقات کے لیے بلایا۔ رمضان ۱۱۴۳ھ اپریل ۱۷۳۱ء میں اکبر پور کے گھاٹ پر دونوں کی ملاقات ہوئی جس میں ۱۲ دن کی گفت و شنید کے بعد انہوں نے پیشوا کے مخالف مرہٹہ سرداروں کے ساتھ ایک متفقہ کارروائی کا نقشہ بنا لیا۔ لیکن ترمبک راؤ اس نقشۂ جنگ سے ناواقف تھا۔ وہ قبل از وقت ۳۵[1] ہزار فوج لے کر دکن کی طرف چل پڑا۔ کسی ذریعہ سے باجی راؤ کو اس سازباز کی خبر ہو گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ دونوں حلیفوں کے ملنے سے پہلے ترمبک راؤ کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ اس ارادہ سے وہ بلا توقف گجرات کی جانب

---

[1] ڈبھارے خاندان کی روایت میں ترمبک راؤ کی فوج صرف ۵ ہزار بتائی گئی ہے اور باجی راؤ اپنے ایک خط میں ۳۰ ہزار لکھتا ہے۔

روانہ ہوگیا۔ ۴ر شوال ۱۱۴۳ھ ۱۱ر اپریل ۱۷۳۱ء کو بڑودہ اور دبھوئی کے درمیان بھیلاپور کے مقام پر دونوں کا مقابلہ ہوا جس میں ترمبک راؤ ایک اتفاقی واقعہ کا شکار ہوا اور مرتے ہی اس کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس کے بڑے بڑے حامی یا قتل ہوئے یا پکڑے گئے یا بھاگ گئے اور اتنی بڑی مخالف جماعت آن کی آن میں پامال ہوگئی۔

اس واقعہ نے نظام الملک کے تمام نقشوں پر پانی پھیر دیا۔ اب ان کے لیے اس امر کا کوئی موقع نہیں رہا کہ مرہٹوں کی جماعت میں اختلاف برپا کر کے اپنے مقبوضات کو ان کی دست برد سے محفوظ رکھیں۔ اس کے بعد دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنا ناگریز تھا یا تو مرہٹوں سے لڑیں اور اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک ان کا زور ٹوٹ جائے یا ان سے کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیں جس کی مفید شرائط سے مطمئن ہو کر وہ دکن کے امن وامان سے تعرض کرنا چھوڑ دیں۔ پہلی صورت کے لیے نظام الملک تیار نہ تھے کیونکہ اس وقت پیہم فتنہ وفساد اور بدامنی کے باعث دکن کے صوبوں کی معاشی اور انتظامی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی اور اس حالت میں ایسی قوت کا فراہم کرنا قریب قریب محال تھا جس سے مرہٹوں کے ساتھ ایک طویل فیصلہ کن جنگ کی جا سکتی۔ اس حالت کی اصلاح کے لیے نظام الملک کو امن کے چند سال درکار تھے۔ اور وہ اسی طرح سے حاصل ہو سکتے تھے کہ وہ پہلی صورت کو چھوڑ کر دوسری صورت ہی اختیار کرتے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے باجی راؤ سے گفت وشنید شروع کی۔ آخر دونوں کے درمیان ایک خفیہ سمجھوتہ ہوگیا جس کا مدعا یہ تھا کہ اگر باجی راؤ دکن کے صوبوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کرے تو نظام الملک شمالی ہند کی جانب اسکی ملک گیری میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرینگے۔

ؔ گرانٹ ڈف اور صاحب سیر المتاخرین نے بھی اس سمجھوتہ کا ذکر کیا ہے مگر مجھے اس وقت تک اسکے وجود کا یقین نہ آیا جب تک مآثر نظامی سے اسکی تصدیق نہ ہوگئی کیونکہ اسکا مصنف نواب آصفجاہ کے خاص ملازموں میں سے تھا اور یہ سب معاملات اسکی آنکھوں کے سامنے پیش آئے تھے۔

کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

"انشاءاللہ تعالیٰ ملک گیری از نربدا آنطرف ذمہ آنہا می گزارم و فوج ایشاں در تعلقہ من گردش نکند" (مآثر نظامی صفحہ ۸۵)

یہ پہلا موقع ہے جبکہ ہم نظام الملک کو مفادِ سلطنت کے خلاف علانیہ ایک کارروائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت دکن کا مفاد اسی طریقِ کار میں تھا جو نظام الملک نے اختیار کیا مگر اخلاق و دیانت کے نقطۂ نظر سے جب تک نظام الملک سلطنت مغلیہ سے اپنا تعلق منقطع نہ کر لیتے اور مغل بادشاہ کے صوبہ دار کی حیثیت سے علانیہ دست بردار نہ ہو جاتے، اس وقت تک ان کے لیے یہ ہرگز جائز نہ تھا کہ سلطنت کے مجموعی مفاد کو دکن یا بالفاظ دیگر اپنی ریاست کے مفاد پر قربان کر دیتے جس وقت وہ مرہٹوں کو شمالی ہند کی جانب پیش قدمی کی آزادی دے رہے تھے انہیں یہ خوب معلوم تھا کہ محمد شاہ، اس کے ارکان سلطنت اور اس کے امرائے فوج میں سے ایک شخص بھی اس قابلیت کا نہیں ہے کہ شمالی ہند حتیٰ کہ خود دار السلطنت کو بھی مرہٹوں کی دست برد سے بچا سکتا ہو۔ ایسی حالت میں اس قسم کے سمجھوتے سے جو نتائج قدرتی طور پر پیدا ہونے والے تھے اور جو فی الواقع ظاہر ہوئے انسے نظام الملک جیسا عمیق النظر اور پیش بیں شخص ہرگز غافل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ اس وقت اپنی مملکت کو محفوظ رکھنے کی خواہش نظام الملک پر اس قدر غالب تھی کہ انہوں نے اس کی خاطر سلطنت اور ماورائے نربدا کے ممالک کے لیے ان تمام تباہیوں کو گوارا کر لیا جن کے نازل ہونے کا ان کو پورا یقین تھا۔

۲۔ شمالی ہند کے معاملات

اب ہم ان واقعات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو اس سمجھوتہ کے بعد شمالی ہند میں پیش آئے اور جن کی بدولت آخر کار نظام الملک کو پھر ایک مرتبہ ہندوستان کی سیاست میں دخل دینا پڑا مگر اسباب و نتائج کے سلسلہ کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نظام الملک کی وزارت کے سقوط اور دکن میں ان کی خود مختاری کے آغاز سے ماورائے نربدا کے حالات میں جو تغیرات پیش آئے ان پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

گذشتہ باب میں بیان ہو چکا ہے کہ نظام الملک اپنی وزارت کے زمانہ میں مالوہ اور گجرات کی شورش فرو کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے اور ان دونوں صوبوں کی حکومت بھی انہی کو دے دی گئی تھی۔ انہوں نے شورش کو رفع کر کے گجرات میں اپنے چچا حامد خاں کو اور مالوہ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی عظیم اللہ خاں کو نائب صوبہ دار مقرر کر دیا۔ مگر جب وہ بادشاہ سے بگڑ کر دکن چلے گئے اور مبارز خاں کو شکست دے کر دکن پر قابض ہو ہوگئے تو بادشاہ نے ان کو مالوہ اور گجرات کی صوبہ داری سے معزول کر دیا اور گجرات پر سربلند خاں تونی اور مالوہ پر راجہ گرِدھر بہادر ناگر کو صوبہ دار مقرر کیا۔ نیز مانڈو اور دھار کی قلعہ داری سے بھی نظام الملک کے ملازم ابوالخیر خاں کو معزول کر کے قطب الدین علی خاں نیکوری کو مامور کیا۔ عظیم اللہ خاں اور ابوالخیر نے مزاحمت کرنی چاہی مگر عظیم اللہ خاں کو محمد شاہ نے اصالتًہ اجمیر کی صوبہ داری دے کر راضی کر لیا اور ابوالخیر خاں کو نظام الملک نے اپنے پاس بلا لیا۔ اس طرح مالوہ تو بآسانی نظام الملک سے واپس لے لیا گیا۔ لیکن گجرات میں حامد خاں سے شاہی عمال کا تصادم ہو گیا اور

یہیں سے وہ فتنہ اٹھا جس نے آئندہ چند سال کے اندر شمال ہند میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیادیں ہلا دیں۔

سربلند خاں نے گجرات کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد شجاعت خاں کو اپنی طرف سے نائب صوبہ دار مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ حامد خاں کو بے دخل کر کے اس صوبہ میں ضبط و نظم قائم کر دے۔ یہ شخص حیدر قلی خاں کے بنائے ہوئے آدمیوں میں سے تھا اور حامد خاں کی اسے پہلے سے اس کی مخالفت تھی۔ اس نے نیابت صوبہ داری کا پروانہ پہنچتے ہی حامد خاں کو دارالحکومت خالی کر دینے کا نوٹس دے دیا۔ اپنے بھائی رستم علی خاں کو سورت کی حکومت پر مامور کیا جہاں سے اس نے نظام الملک کے عامل کو نکال باہر کیا اور اسی طرح گجرات کی دیوانی سے بھی اس نے نظام الملک کے مقرر کردہ دیوان کو ہٹا دیا۔ حامد خاں نے دارالحکومت خالی کرنے کے لیے کچھ مہلت طلب کی۔ مگر شجاعت خاں نے اس کا کوئی عذر نہ سنا اور اس پر چڑھائی کر دی۔ تین دن تک مقابلہ کرنے کے بعد حامد خاں نے مجبور ہو کر شہر حوالہ کر دیا اور ڈوھد[1] کے مقام پر جا کر پناہ لی۔ وہاں سے اس نے یہ سب کیفیت نظام الملک کو لکھ کر بھیجی۔ انہیں شجاعت خاں کا یہ طرزِ عمل ناگوار ہوا اور انہوں نے گجرات کی چوتھ کا لالچ دے کر مرہٹوں کو حامد خاں کی مدد پر آمادہ کر دیا[2]۔ چنانچہ ایک مرہٹہ سردار کنتھا جی بھانڈے پندرہ بیس ہزار فوج لے کر حامد خاں کے پاس پہنچ گیا اور ان دونوں نے احمد آباد سے ۴ کوس کے فاصلہ پر

---

[1] احمد آباد سے ۱۱۰ میل جانب مشرق

[2] بعض مورخین کا بیان ہے کہ مرہٹوں سے یہ معاملہ خود حامد خاں نے کیا تھا۔ اس میں نظام الملک کی مداخلت کا انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

شجاعت خاں سے لڑ کر اسے قتل کر دیا ۱۱۳۷ھ ۱۷۲۴ء اس کے بعد حامد خاں نے احمد آباد پر قبضہ کر کے کھلم کھلا شاہی اطاعت کا جوا اپنی گردن سے اتار دیا۔ شاہی عمال اور منصب داروں کو الگ کر دیا اور دفتر دیوانی کے تمام کاغذات اپنے قبضہ میں کر لیے۔ کنتھاجی نے جو امداد اس کو دی تھی اس کے صلہ میں اس نے دریائے مہی کے مغرب کی طرف تمام پرگنوں کی چوتھ اور سر دیس مکھی کا حق اسے عطا کر دیا مگر مرہٹوں کی آتش طمع اس سے نہ بجھی اور انہوں نے خوب دل کھول کر احمد آباد کو لوٹا، حتیٰ کہ حضرت شیخ احمد کے مزار تک کو نہ چھوڑا۔

شجاعت خاں کے خون کا بدلہ لینے اور حامد خاں کو گجرات سے نکالنے کے لیے اس کے بھائی رستم علی خاں متصدی بندرِ سورت و فوجدار بڑودہ کو دہلی سے احکام بھیجے گئے۔ یہ شخص اس زمانہ میں پیلاجی گائیکواڑ سے جنگ میں مشغول تھا۔ ان احکام کے وصول ہوتے ہی اس نے پیلاجی کے ساتھ صلح کر لی اور اسے دو لاکھ روپیہ دیکر حامد خاں کے خلاف اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ اس طرح سورت سے یہ دونوں حلیف ۲۵ ہزار کے قریب فوج لے کر احمد آباد کی طرف بڑھے۔ آراس[1] کے مقام پر دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ پیلاجی بظاہر رستم علی خاں کے ساتھ تھا اور خفیہ طور پر نظام الملک نے اس کو حامد خاں کی حمایت کے صلہ میں بڑی بڑی امیدیں دلائی تھیں۔ مگر حقیقت میں وہ نہ رستم علی خاں کا حامی تھا، نہ حامد خاں کا بلکہ وہ اس تاک میں تھا کہ جو فریق غالب ہو اس کے ساتھ مل کر کمزور فریق کا مال اسباب لوٹ لے اور پھر غالب فریق سے پیش

---

[1] دریائے مہی کے کنارے احمد آباد سے تقریباً ۱۰ میل

قرار معاوضہ حاصل کرے۔ اس غرض سے وہ رستم علی کے پیچھے پیچھے ایک منزل کا فاصلہ چھوڑ کر آرہا تھا۔ فروری ۱۷۲۵ء جمادی الاولیٰ ۱۱۳۷ھ میں جنگ ہوئی۔ حامد خاں شکست کھا کر بھاگ نکلا اور رستم علی فتح یاب ہوا۔ لڑائی کے موقع پر دونوں طرف کے مرہٹہ حلیف خاموش کھڑے رہے اور جب دونوں فریق زدوخورد میں منہمک ہو گئے تو کنتھاجی نے اپنے دوست حامد خاں کا خیمہ و خرگاہ لوٹ لیا اور پیلاجی نے اپنے ظاہری دوست رستم علی خاں کے مال اسباب پر ایسا ہاتھ صاف کیا کہ جب وہ جنگ سے واپس ہوا تو اسے اپنی لشکر گاہ کا نشان تک نہ ملا۔

حامد خاں کا زوال اب یقینی تھا کیونکہ اس کے پاس اپنی کوئی قوت نہ رہی تھی اور اس کے مددگار مرہٹے رستم علی خاں کا غلبہ دیکھ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن ایک بالکل اتفاقی صورت نے نقشہ کو پھر بدل دیا۔ شجاعت خاں کے قتل کی خبر سن کر دکن سے مرہٹوں کی ایک بہت بڑی تعداد گجرات کے دوسرے تیسرے روز دریائے مہی کو عبور کر کے حامد خاں کے پاس پہنچ گئی اور آن کی آن میں ۷۰۔۸۰ ہزار آدمی اس کے لشکر میں فراہم ہو گئے۔ پیلاجی بھی انہی مرہٹوں کے ساتھ مل گیا اور سب نے ہر طرف سے رستم علی کو گھیر لیا۔ چند روز کے اندر اس کا سارا لشکر مرہٹوں کی لوٹ مار اور رہزنی کے باعث بھوکوں مرنے لگا اور اس کے آدمی اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ آخر اس نے احمد آباد کا رخ کیا اور لڑتا بھڑتا چند میل تک چلا گیا۔ راستہ میں ایک مقام پر تنگ آکر اس نے مقابلہ کیا اور بڑی بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کا سر کاٹ کر احمد آباد بھیجا گیا جہاں اس کی نمائش کی گئی اور پیلاجی نے اس کا ایک ہاتھ کاٹ کر اپنے گھر بھیج دیا تاکہ اس کی "بہادری" کی یادگار رہے اس طرح

محض مرہٹوں کی مدد سے حامد خاں کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے صلہ میں اس نے کنٹھاجی کو دریائے مہی کے جنوبی مغربی جانب کے تمام علاقے کی چوتھ دی جس میں احمد آباد بھی شامل تھا۔ اور پیلاجی گائیکواڑ کو شمالی مغربی جانب کے پورے نواحی گجرات کی چوتھ کا حق دیا جس میں سورت اور بڑودہ وغیرہ شامل تھے۔ دونوں جماعتوں کے مرہٹے تمام گجرات میں پھیل گئے۔ چوتھ کے علاوہ گھاس دانہ، کھنڈانی (خاندانی)، اور فدیہ اور ایسے ہی بہت سے مختلف ناموں سے انہوں نے رعایا پر تباہ کن ٹیکس لگانے شروع کر دیئے۔ رعایا کی جان و مال اور عزت و ناموس پر اس بے دردی سے حملے کرنے لگے کہ ہزار ہا شرفا نے اپنی عورتوں اور بچوں کی اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ تاکہ وہ بے عزتی سے بچ جائیں۔ ادھر حامد خاں پہلے سے زیادہ جرأت کے ساتھ شاہی حکومت سے سرتابی کا اظہار کرنے لگا۔ خاص بادشاہ کی جاگیر کا روپیہ اور شاہی استعمال کے لیے تیار کیا ہوا کپڑا لوٹ لیا۔ شاہی اموال کے خزائن جبراً کھلوائے اور ان پر قبضہ کر لیا۔ صوبہ کی تمام زمینوں کو عام اس سے کہ خالصہ ہوں یا جاگیر اپنے تصرف میں لے لیا اور دولت مند لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ان سے جرمانے وصول کیے۔

ان واقعات کی اطلاع دہلی پہنچی تو سربلند خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ گجرات کو حامد خاں اور مرہٹوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے خود جائے اس کی امداد کے لیے ۵۰ لاکھ روپیہ نقد دیا گیا۔ ۳ لاکھ روپیہ ماہانہ امداد منظور کی گئی۔ بڑے بڑے ہندو اور مسلمان سردار اس کی کمک پر مقرر کیے گئے اور نجم الدین علی خاں، سیف الدین علی خاں اور سادات بارھہ کے دوسرے بڑے بڑے سرداروں کو قید سے رہا کر کے اس کے ساتھ جانے کا حکم دیا گیا[۱]۔ ان تیاریوں کے ساتھ رجب ۱۱۳۷ھ اپریل ۱۷۲۵ء میں

---

[۱] ابوالفیض کا بیان ہے کہ سربلند خاں کو گجرات بھیجنے کا مقصد صرف یہی نہ تھا کہ اس صوبہ کو مرہٹوں اور حامد خاں کے تسلط سے آزاد کرا دے بلکہ یہ بھی مقصد تھا کہ دکن پر حملہ کر کے نظام الملک کو بھی وہاں سے نکال دے۔

وہ دہلی سے روانہ ہوا اور ختم سیال کے قریب گجرات کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ حامد خاں جس کی تمام تر قوت کا انحصار مرہٹوں پر تھا، اس طاقتور سردار کو آتا دیکھ کر محمود آباد کی طرف ہٹ گیا اور مرہٹوں کو اس نے اپنی مدد کے لیے طلب کیا۔ اس کی پیہم درخواستوں کے بعد کنتھاجی اس وقت محمود آباد پہنچا جب سربلند خاں کا نائب احمد آباد پر قابض ہو چکا تھا۔ اس کے آتے ہی حامد خاں نے احمد آباد پر حملہ کر دیا مگر اہل شہر اب اس کی حکومت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انہوں نے سختی کے ساتھ مدافعت کی۔ حامد خاں کی اپنی فوج تنخواہیں نہ ملنے کے باعث بد دل ہو گئی۔ اہل گجرات میں سے جو لوگ اس کے ساتھ تھے وہ نئے صوبہ دار کے خلاف لڑنے سے جی چرانے لگے۔ مرہٹے صرف لوٹ مار سے مطلب رکھتے تھے، باضابطہ جنگ سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایسی حالت میں جب معلوم ہوا کہ سربلند خاں ۲۰ ہزار فوج کے ساتھ سر پر آ پہنچا ہے تو حامد خاں نے ٹھہرنے میں کوئی فائدہ نہ دیکھا اور ربیع الثانی ۱۱۳۸ھ دسمبر ۱۷۲۵ء میں گجرات چھوڑ کر دکن چلا گیا جہاں نظام الملک نے اس کو ناندیڑ کا صوبہ دار مقرر کر دیا اور ۴ سال بعد وہیں اس کا انتقال ہوا۔

اس طرح نظام الملک کی حکومت جو دو سال پہلے تک آگرہ اور اجمیر کی سرحدوں تک پہنچی ہوئی تھی، دریائے نربدا تک محدود ہو گئی۔ دو وسیع صوبے مالوہ اور گجرات ان کے قبضہ سے نکل گئے۔

؎ صوبہ کو مرہٹوں اور حامد خاں کے تسلط سے آزاد کرائے بلکہ یہ بھی مقصد تھا کہ دکن پر حملہ کر کے نظام الملک کو بھی وہاں سے نکال دے۔

اب تک مرہٹوں کی طرف سے نربدا پار کے شاہی علاقوں میں جس قدر دست درازیاں ہو رہی تھیں وہ مرہٹہ راج کی طرف سے نہ تھیں بلکہ مختلف مرہٹہ سردار لوٹ مار کی غرض سے ادھر آ نکلے تھے اور مغلوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر کامیاب ہو گئے تھے لیکن اب نظام الملک اور بادشاہ کی علانیہ مخالفت اور سلطنت مغلیہ کی ابتری اور گجرات میں مرہٹہ سرداروں کی کامیابیاں دیکھ کر باجی راؤ پیشوا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان سے مغلوں کو نکال باہر کرنے کا بہترین وقت یہی ہے چنانچہ اس نے راجہ ساہو سے درخواست کی کہ وہ شمالی ہند پر حملہ کرنے اور مرہٹہ راج کو نربدا پار کے صوبوں میں وسیع کرنے کی اجازت عطا کرے۔ باجی راؤ کے رقیب سری پت راؤ پرتی ندھی نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اس نے اسے خلاف احتیاط اور بے سمجھی بوجھی تجویز قرار دیا اور کہا کہ جہاں تک بے ضابطہ غارت گری کا تعلق ہے مرہٹہ راجہ اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا مگر جب وہ اپنے پردھان کو مغل علاقوں پر حملہ کرنے کے لیے باضابطہ اجازت دے گا تو یہ شاہی حکومت سے لڑائی کا اعلان ہوگا۔ اور اس صورت میں پوری سلطنت ہند سے مرہٹوں کو لڑنا پڑے گا۔ ہماری حکومت کی طاقت ابھی اتنی بھی نہیں ہے کہ جو علاقے ہم کو تفویض کر دیے گئے ہیں، ان میں امن اور نظم و ضبط قائم کر سکیں۔ پھر ایک بڑی سلطنت سے جنگ چھیڑ دینا شدید حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر تم کو ممالک فتح کرنے کا شوق ہے تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ شمال پر حملہ کرنے کے بجائے کرناٹک کے ان علاقوں کو فتح کرنے کی کوشش کرو جو سیواجی نے فتح کیے تھے۔ اس کے جواب میں باجی راؤ نے ایک بڑی پرجوش تقریر کی جس میں ساہو کو اس کے دادا کی بہادریوں کے واقعات سنائے اور اس کو بتایا کہ کیسے طاقتور بادشاہوں سے اس کے مقابلے ہوئے اور کس

کس طرح اس نے کامیابیاں حاصل کیں۔ پھر اس نے ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے مغلوں کی عیش پسندی، کاہلی اور اخلاقی کمزوری کا مقابلہ مرہٹوں کی چستی، جفاکشی اور عملی قوت سے کیا اور آخر میں کہا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہندوؤں کے ملک سے ان غیر ملکیوں کو نکال باہر کریں اور غیر فانی شہرت پائیں۔ اپنی طاقت کو ہندوستان کی طرف صرف کر کے ہم آپ کے عہدِ حکومت میں مرہٹوں کا جھنڈا کرشنا سے اٹک تک اڑا دیں گے۔"

اس پر ساہو نے جوش میں آکر کہا:۔

"نہیں! تم اس کو ہمالیہ پر نصب کر دو گے۔"

اس قسم کی متعدد تقریروں سے باجی راؤ نے یہ بات ساہو کے ذہن نشین کرا دی کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حملے کرنے سے بہتر ہے کہ اصل سلطنت پر حملہ کر کے تمام ملک کی حکومت حاصل کی جائے۔ "ہم کیوں نہ بوسیدہ درخت کے تنے پر ضرب لگائیں شاخیں اور پتے آپ سے آپ جھڑ جائیں گے۔"

آخر کار پرتی ندھی کی مخالفت بے اثر رہی اور ساہو نے باجی راؤ کو شمالی ہند میں ملک گیری کی اجازت دے دی۔ اس اجازت کے ملتے ہی اس نے مختلف مرہٹہ سرداروں کو نربدا پار مالوہ اور گجرات کے علاقوں میں پھیلا دیا۔ گجرات، مالوہ، بندیل کھنڈ، اجمیر، آگرہ اور الٰہ آباد کے صوبے ایک ایک کر کے مرہٹوں کے اثر میں آتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کی غارت گریاں خاص دار السلطنت کے دروازوں تک پہنچ گئیں اور دس برس کے اندر انہوں نے نربدا سے لے کر جمنا تک سارے وسطِ ہند کو ہلا ڈالا۔ چونکہ اس جدید فتنہ کی ابتدا بھی گجرات ہی سے ہوئی اس لیے ہم سب سے

پہلے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

گجرات پر مرہٹوں کا تسلّط

حامد خاں کے گجرات سے جانے کے بعد مرہٹے بھی اپنے ملک کی طرف واپس چلے گئے تھے۔ سربلند خاں کے لیے یہ بہترین موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے صوبہ میں نظم و ضبط قائم کر سکتا تھا لیکن اس فرصت کو اس نے اپنے مددگاروں اور ماتحتوں سے لڑنے اور اپنے ہاتھوں اپنی قوت کو برباد کرنے میں صرف کیا۔ وہ سادات بارھہ سے لڑا یہاں تک کہ نجم الدین علی خاں اسے چھوڑ کر اجمیر چلا گیا۔ سردار محمد خاں، علی محمد خاں بابی اور دوسرے بڑے بڑے سرداروں سے ایک ایک کر کے اس کی لڑائی ہوئی۔ خود اس کا بیٹا خانہ زاد خاں غالب جنگ اس سے بگڑ کر دہلی چلا گیا۔ بڑے بڑے تاجروں پر جبر و ظلم کر کے اس نے روپیہ وصول کیا اور اپنی ان حرکات سے عوام و خواص سب میں اپنے مخالفوں کی ایک خاصی جماعت پیدا کر دی۔ یہی افراتفری کی حالت تھی جبکہ ۱۱۳۹ھ سنہ ۱۷۲۶ء میں مرہٹے پھر گجرات پر سیلاب کی طرح ٹوٹ پڑے اور حسب معمول قتل و غارت کا بازار گرم کر کے تھوڑی سی مدت میں انہوں نے اس سرسبز و شاداب صوبہ کو ویران کر دیا۔ آخر تنگ آکر سربلند خاں نے کنتھاجی کو دریائے مہی کے مغربی جانب دبا ستثنائے پرگنہ و شہر احمد آباد) تمام علاقوں کی چوتھ کا حق عطا کر دیا۔ اور پیلاجی گایکواڑ کو جو گجرات میں ترمبک راؤ دبھارے سیناپتی کا نمائندہ تھا، انہی علاقوں کی سند لکھ دی جن کی چوتھ حامد خاں کے زمانہ میں وصول کرتا تھا۔

اس واقعہ کی اطلاع دہلی پہنچی تو محمد شاہ سربلند خاں کی اس کمزوری پر ناراض ہوا اور اس نے گجرات کی مہم کے لیے ۲ لاکھ روپیہ ماہوار کی جو امداد مقرر کی تھی وہ بند کر دی۔

سر بلند خاں اس رقم کے بغیر اپنا کام نہیں چلا سکتا تھا۔ وہ مالیات کے انتظام سے سراسر نابلد تھا۔ گجرات کا صوبہ کسی طرح اس کی فضول خرچیوں کا بار نہ اٹھا سکتا تھا۔ حکومت کے مصارف تو درکنار اس کی فوج ہی کی تنخواہیں اس قدر زیادہ تھیں کہ گجرات کی آمدنی ان کے لیے کفایت نہ کر سکتی تھی۔ اب جو مرکزی حکومت کی امداد بند ہو گئی تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ لوگوں پر جرمانے کرنے شروع کر دیئے۔ اس طرح دشمن مرہٹوں کے ہاتھوں ملک کی تباہی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ خود ملک کے محافظ اور امین نے پوری کر دی پھر جب اس لوٹ مار سے بھی اس کا کام نہ چلا تو اس نے امرائے دربار کی وہ تمام جاگیریں جو گجرات میں تھیں ضبط کر لیں۔ اس کے جواب میں امرائے دربار نے سر بلند خاں کی وہ تمام جاگیریں جو پنجاب میں تھیں ضبط کرا لیں اور آپس میں تقسیم کر لیں۔ اس طرح ایک طرف اس کے تعلقات مرکزی حکومت سے سخت کشیدہ ہو گئے اور دوسری طرف خود اپنے صوبہ کے باشندوں اور با اثر سرداروں سے اس کی مخالفت ہو گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دکن میں نظام الملک اور باجی راؤ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور اس کی وجہ سے باجی راؤ گجرات کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکتا تھا۔ کنتھاجی اور ترمبک راؤ ڈبھارے جنہوں نے سر بلند خاں سے چوتھ کا حق حاصل کیا تھا، باجی راؤ کی مخالف جماعت کے سرغنے تھے۔ اس لیے ان دونوں کو اصل مرہٹہ راج کی تائید حاصل نہ تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ پیشوا ان کو گجرات سے بے دخل کرنے کا خواہشمند تھا چنانچہ اس نے ۱۱۳۹ھ اور ۱۱۴۰ھ (۲۸-۱۷۲۷ء) میں کئی مرتبہ اپنے سپہ سالار اودا جی پوار اور خود اپنے بھائی چمناجی کو گجرات کی طرف بھیجا، اور

انہوں نے یہاں کے مغل عہدہ داروں سے بھی مدد کی درخواست کی لیکن چونکہ باجی راؤ کی تمام تر قوت نظام الملک کے مقابلہ میں صرف ہو رہی تھی اس لیے وہ گجرات کی طرف اتنی فوج نہ بھیج سکا جو کنتھاجی اور پیلاجی کو شکست دے سکتی۔ سربلند خاں کے لیے اس زمانہ میں بہترین حکمتِ عملی یہ تھی کہ وہ باجی راؤ کے بھیجے ہوئے سرداروں کے ساتھ مل کر کنتھا اور پیلا کا استیصال کر دیتا اور پھر خود باجی راؤ کے مقابلے میں نظام الملک کے ساتھ شریک ہو جاتا مگر اس نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اس کو اپنے بادشاہ، اپنی رعیت، اپنے صوبہ کے امراء اور اپنے ہمسایہ صوبہ کے حاکم (نظام الملک) سے لڑنے بھڑنے میں ضائع کر دیا۔ آخر سنہ ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء میں جب پہلی مرتبہ نظام الملک اور باجی راؤ کے درمیان صلح ہوئی اور باجی راؤ اپنی پوری قوت کے ساتھ گجرات کی سرحد پر نمودار ہوا تو سربلند خاں نے اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس پایا۔ مجبور ہو کر اس نے پورے صوبہ گجرات میں پیشوا کو چوتھ اور سردیس مکھی وصول کرنے کا حق دے دیا۔[1]

---

[1] اس سند میں چوتھ اور سردیس مکھی سے شہر و پرگنہ سورت کو مستثنیٰ کر لیا گیا تھا اور شہر احمد آباد کی آمدنی کا صرف پانچواں حصہ عطا کیا گیا تھا۔ شرائط وہی تھیں جو دکن میں حسین علی خاں نے مقرر کی تھیں اور اسی طرح محاصل وصول کرنے کیلئے پیشوا کو اپنے مکاسہ دار اور گماشتے مقرر کرنے کا حق دیا گیا تھا مگر ایک معنی خیز شرط یہ بھی تھی کہ پیشوا گجرات میں مرہٹہ راج کی رعیت کو فساد سے روکنے کا ذمہ دار ہو گا۔ یہ شرط دراصل ترمبک راؤ دبھارے، کنتھاجی اور پیلاجی کو بے دخل کرنے کے لیے رکھی گئی تھی اور اسی کی بدولت بعد میں ان دونوں گروہوں کے درمیان وہ لڑائی ہوئی جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔

سربلند خاں کی اس آخری حرکت نے شاہی دربار میں اس کا کوئی اعتبار باقی نہ رکھا۔ دوسرے ہی سال ۱۱۴۳ھ ۱۷۳۰ء صمصام الدولہ خاں دوراں کے مشورہ سے محمد شاہ نے اس کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ راجہ ابھے سنگھ راٹھور والئ جودھپور کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا مگر یہ انتخاب پہلے انتخاب سے بھی زیادہ غلط تھا رعایا پر ظلم وستم کرنے میں ابھے سنگھ کسی طرح سربلند خاں سے کم نہ تھا اور اس کا مذہبی تعصب[1] اس پر مزید تھا جس کے باعث صوبہ کے عام باشندے اور خاص کر مسلمان (جن پر اس زمانہ میں فوجی قوت کا دارومدار تھا) اس کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس اندرونی کمزوری کے ساتھ نئے صوبہ دار نے مرہٹوں کا زور توڑنے کی جتنی کوششیں کیں ان میں وہ کامیاب نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ علاوہ بریں اس کی صوبہ داری کے آغاز ہی میں واقعات نے ایسا رخ بدلا کہ ابھے سنگھ کے لیے کامیابی کے جو تھوڑے بہت مواقع باقی تھے وہ بھی جاتے رہے۔ اس کو گجرات آئے

---

[1] ابھے سنگھ کے مذہبی تعصب اور ظلم وستم کا حال ابوالفیض اس طرح بیان کرتا ہے:۔

چناں ظلم دیدا در اکر دسر — کہ نشنید کس زاں ستم بیشتر
شد آں شہر اسلام از کافراں — بصد ظلم دیدا دو یراں چناں
کہ نابد بشرح د بیاں از قلم — کنم گر ہمہ آں را رقم
نمودند رجپوت ہای شریر — لبے طفل ارباب ایماں اسیر
شدہ در رہ کفر آموزگار — نمودند در راہ کفر استوار
ازیں ظلم مظلومہا بے شمار — روانہ بدہلی شدند اشکبار

ہوئے پورا ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ترمبک راؤ دبھارے، کنٹھاجی اور پیلاجی گائیکواڑ نے نظام الملک اور محمد خاں بنگش (صوبہ دار مالوہ) کے ساتھ سازش کر کے باجی راؤ سے جنگ کی اور اس میں ایسی سخت شکست کھائی کہ ہمیشہ کے لیے ان کی قوت کا استیصال ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں نظام الملک اور باجی راؤ کے درمیان وہ مفاہمت ہو گئی جس کی بدولت دکن کی طرف سے اطمینان کلّی حاصل کر کے باجی راؤ کو شمالی ہند کی تسخیر پر اپنی پوری توجہ صرف کرنے کا موقع مل گیا۔ ان حالات میں ابھے سنگھ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ گجرات کی چوتھ اور سردیس مکھی کے جو حقوق سربلند خاں نے پیشوا کو عطا کیے تھے ان کو بے چوں و چرا تسلیم کر لے۔ تاہم اس نے بڑودہ اور ڈبھوئی سے مرہٹوں کو نکالنے کی کوشش کی اور پیلاجی گائیکواڑ کو دھوکہ سے قتل کر دیا مگر اس کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ پیلاجی کے بھائی مادھاجی نے اسے شکست دے کر بڑودہ پھر فتح کر لیا اور پیلاجی کے بیٹے دمناجی نے جودھپور کے علاقہ پر حملہ کر کے ابھے سنگھ کو مجبور کر دیا کہ گجرات کو چھوڑ کر خود اپنی ریاست بچانے کی فکر کرے۔

مالوہ پر مرہٹوں کا تسلّط

گجرات کے بعد دوسرا صوبہ جس پر مرہٹوں کا دستِ تعدّی دراز ہوا مالوہ تھا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۵ء میں نظام الملک کو مالوہ سے معزول کر کے محمد شاہ نے راجہ گردھر بہادر ناگر کو اس صوبہ کا والی مقرر کیا تھا۔ اس کی صوبہ داری کا آغاز ہی تھا کہ مالوہ پر مرہٹوں کی دست درازیاں شروع ہو گئیں۔ ابتدا ان دست درازیوں کا مقصد لوٹ مار کے سوا کچھ نہ تھا اور اس غرض

کے لیے باجی راؤ ہر سال رانوجی سندھیا ملہار جی ہولکر، اوداجی پوار اور چمناجی آپا کو مالوہ کی طرف بھیجتا رہتا تھا لیکن بعد میں راجپوتانہ کے ہندو رئیس جن کا سرغنہ جے سنگھ سوائی تھا مغل حکومت کا استیصال کرنے کے لیے مرہٹوں کی خفیہ امداد پہ آمادہ ہو گئے۔ اور اندور کا طاقتور چوہدری نند لال منڈلوی بھی جے سنگھ کے اشارہ سے مرہٹوں کا مددگار بن گیا۔ ان سب کے سازباز نے مرہٹوں کے ہاتھ اس قدر مضبوط کر دیئے کہ دو تین سال کے اندر وہ تمام مالوہ پر چھا گئے۔ ان کے مقابلہ میں گردھر بہادر کی کمزوری کے متعدد اسباب تھے۔ وہ انتہا درجہ کا بخیل اور زر پرست آدمی تھا۔ ضرورت کے وقت روپیہ خرچ کرنے میں دریغ کرتا تھا۔ حتیٰ کہ فوج کے مصارف بھی اس کو بارگراں محسوس ہوتے تھے۔ اس وجہ سے اس کی فوجی قوت کمزور تھی۔ اس کے صوبہ کے بڑے بڑے سردار بھی یا تو اس کے مخالف تھے یا غیر جانبدار۔ رہی مرکزی حکومت تو وہ خواب ناز میں محو تھی۔ مالوہ کی خطرناک حالت اور گردھر بہادر کے ضعف کا حال جاننے کے باوجود اس نے مدافعت کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس نامساوی مقابلہ میں گردھر بہادر زیادہ مدت تک نہ ٹھہر سکا اور جمادی الاولیٰ ۱۱۴۱ھ ۱۷۲۹ء میں اجین کے قریب مرہٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد شاہی حکومت نے مالوہ کی مدافعت کے لیے اس کے بیٹے راجہ بھوانی رام چمنا بہادر کو مامور کیا مگر مالی امداد نہ کی حالانکہ اسی کی زیادہ ضرورت تھی۔ آخر کار چند مہینوں میں اس کی ناکامی بھی آشکار ہو گئی۔ پھر گردھر بہادر کا چچازاد بھائی دیا بہادر (چھبیلہ رام ناگر کا بیٹا) صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ اس نے آکر مالوہ میں سختی کے ساتھ نظم و ضبط قائم کرنے کی کوشش کی مگر ایسے حالات میں جبکہ دشمن سر پر موجود ہو، سختی کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ پورا ایک سال بھی

نہ گذرا تھا کہ مقامی زمیندار اس کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر مرہٹوں سے مل گئے اور دھار کے قریب اس کو شکست دے کر قتل کر ڈالا (ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ اکتوبر ۱۷۳۰ء) راجہ جے سنگھ سوائی نے اس فتح پر باجی راؤ کو مبارکباد دی اور اسے لکھا۔

تم نے مالوہ میں دھرم کی خوب رکھشا کی اور مسلمانوں کی سرکوبی کر کے دھرم کا جھنڈا گاڑ دیا۔

تم نے میری آرزو پوری کر دی [ل]"

اس زمانہ میں الٰہ آباد کا سابق صوبہ دار محمد خاں بنگش دہلی میں موجود تھا۔ ظفر خاں روشن الدولہ اور رحیم النسا کوکی نے بڑی بڑی رشوتیں لینے کے بعد اسے مالوہ کی صوبہ داری پر بھجوا دیا۔ یہ ایک بہادر سردار تھا۔ اس نے مالوہ پہنچ کر مرہٹوں کو متعدد شکستیں دیں۔ ایک سال کے اندر انہیں اُجّین، مندلیشور اور دھار کے علاقوں سے نکال دیا اور نربدا کے کنارے ان کے نئے قلعوں کو مسمار کر دیا۔ یہی زمانہ تھا جبکہ دکن میں نظام الملک اور مرہٹوں کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس زمانہ میں نظام نے محمد خاں سے خط و کتابت کی۔ گجرات کے مرہٹہ سرداروں کو باجی راؤ کے مقابلہ میں اکسایا اور رمضان ۱۱۴۴ھ اپریل ۱۷۳۱ء میں نربدا

ل ایسے ہی ایک موقع پر جے سنگھ نے نند لال کو لکھا:۔

"تم پر ہزار آفرین کیونکہ تم نے صرف میری بات پر بھروسہ کر کے اور اپنے دھرم کو نفع پہنچانے کی خاطر مالوہ میں مسلمانوں کو مٹا دیا اور وہاں اپنے دھرم کو مضبوطی کے ساتھ قائم کر دیا۔ تم نے میرے دل کی تمنا پوری کر دی"

کے کنارے محمد خاں بنگش سے مل کر اس کو بھی اس اتحاد میں شرکت پر راضی کر لیا۔ لیکن گجرات کے مرہٹہ سرداروں کی شکست نے سارا نقشہ بدل دیا۔ اس واقعہ کے بعد نظام الملک اور باجی راؤ میں سمجھوتہ ہو گیا۔ گجرات پر مرہٹوں کا تسلط مستحکم ہو گیا۔ محمد خاں مرہٹوں کے مقابلہ میں تنہا رہ گیا۔ اور مرہٹوں کو دکن اور گجرات کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی پوری پوری توجہ مالوہ کی طرف منعطف کر دینے کا موقع مل گیا۔ دوسرے ہی سال باجی راؤ نے ایک لاکھ سواروں کے ساتھ مالوہ پر حملہ کیا، اپنے سپہ سالاروں کو پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار فوج دے کر اس صوبہ کے مختلف اقطاع میں پھیلا دیا اور ہر طرف لوٹ مار کر کے محمد خاں کو اس قدر پریشان کیا کہ اسے بہت کچھ مال دے کر ان سے عارضی صلح کرنی پڑی۔ مرہٹوں کو بلطائف الحیل دفع کرنے کے بعد اس نے بادشاہ سے امداد طلب کی اور پیہم عرضیاں بھیجیں اور لکھا کہ اس وقت مالوہ پر شمالی ہند کی حفاظت کا انحصار ہے۔ اگر اس پر مرہٹے قابض ہو گئے تو پھر آگرہ و دہلی کی بھی خیر نہیں ہے۔ اس نے یہاں تک لکھا کہ اگر کسی اور شخص کو بھیجا جائے تو میں اس کے ماتحت کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن محمد خاں نے نظام الملک سے اتحاد کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ بادشاہ کے اہل دربار اور خصوصاً صمصام الدولہ خاں دوراں کی نگاہ میں اتنی بڑی معصیت تھی کہ اس کے بعد وہ مالوہ کی صوبہ داری پر کسی طرح نہ رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء میں محمد خاں مالوہ سے معزول کیا گیا اور اس کی جگہ صمصام الدولہ کے مشورہ سے مہاراجہ جے سنگھ والی آنبیر جو پہلے سے آگرہ کا صوبہ دار تھا مالوہ کا بھی صوبہ دار بنا دیا گیا۔

یہ جے سنگھ وہی شخص تھا جس کی بدولت مالوہ میں مرہٹوں کو فروغ نصیب ہوا۔ جس کی سازشوں سے اس صوبہ کے بڑے بڑے زمیندار مرہٹوں سے مل گئے اور

جس کی تدبیروں سے پے در پے چار صوبہ دار ملک کا انتظام کرنے میں ناکام ہوئے وہ علی الاعلان مغلوں کا دشمن تھا اور ان کو نکالنے کے لیے ان کے ہر دشمن کی مدد کرنے پر آمادہ تھا۔ اس زمانہ کے تمام مورخین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے خلاف انتہا درجہ کا تعصب رکھتا تھا اور مرہٹوں سے اس کی موافقت سیاسی اغراض پر نہیں بلکہ مذہبی جذبہ پر مبنی تھی[۱] جس کو اس نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نازک موقع پر ایسے خطرناک دشمن کو ملک کی حفاظت کے لیے مامور کرنا اور دارالسلطنت کی شہر پناہ سے لے کر دریائے نربدا تک کا سارا علاقہ اس کے سپرد کر دینا بجز اس کے اور کچھ معنی نہ رکھتا تھا کہ سلطنتِ مغلیہ اب خود ملک ہاتھ سے دینے پر آمادہ تھی۔

بندیل کھنڈ پر مرہٹوں کا تسلط

جے سنگھ کے صوبہ دار مالوہ مقرر ہونے کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کو بیان کرنے سے پہلے مختصر طور پر بندیل کھنڈ کے واقعات بھی بیان کر دینے ضروری ہیں تاکہ شمالی ہند کی طرف مرہٹوں کے اقدام کی تاریخی اور جغرافی ترتیب برقرار رہے۔

---

[۱] جے سنگھ کے متعلق ابوالفیض لکھتا ہے:۔

زو قتے کہ اسلام در ہند راست
چنیں راجہ بدسیر برنخاست

بود ہمتش روز و شب بہر ایں
کہ در ہند نامے نماند ز دیں

ہماں کافر از غیرتِ کافری
چو دید از شہنشاہ بے جوہری

طلب کرد کفار را از دکن
کہ کردند دیں را مگر بیخ کن

غنیم لعیں را ز راہ وداد
در اقلیم ہندوستاں راہ داد

بندیل کھنڈ میں راجہ چھتر سال دنگھا کی شورش ایک مدت سے چلی آرہی تھی۔ سنہ ۱۱۳۳ھ سنہ ۱۷۲۰ء میں جب محمد خاں بنگش الہ آباد کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اس نے بندیلکھنڈ پر متعدد چڑھائیاں کیں اور چار سال تک لڑنے کے بعد بندیلوں کی بغاوت کو دبا دیا مگر سنہ ۱۱۳۷ھ سنہ ۱۷۲۴ء میں جب نظام الملک نے مبارز خاں کو شکست دے کر شاہی حکومت کے علی الرغم صوبہ دکن پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ نے اپنی فوجی قوت کو مجتمع کرنے کی خاطر دوسرے امراء کی طرح محمد خاں کو بھی اس کی فوج سمیت دہلی بلا لیا تو بندیلوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع مل گیا اور انہوں نے جھانسی سے لیکر بہار کی سرحد تک ایک فتنۂ عظیم برپا کر دیا۔ اس تازہ شورش کو فرو کرنے کے لیے سنہ ۱۱۴۰ھ سنہ ۱۷۲۷ء میں محمد خاں پھر بھیجا گیا اور اس نے ایک سال کے اندر بندیلوں کو پیہم شکستیں دے کر ان کا صدر مقام جیت پور[1] فتح کر لیا۔ راجہ چھتر سال اور اس کے لڑکوں نے مجبور ہو کر بادشاہ کی اطاعت قبول کی۔ جن شاہی علاقوں پر قبضہ کیا تھا انہیں واپس کیا اور اپنے ملک میں شاہی تھانے مقرر کرنے پر راضی ہو گئے لیکن دہلی کی درباری سازشیں جو سلطنت کی بیخ کنی پر تلی ہوئی تھیں پھر برسر کار آئیں۔ محمد خاں کے دشمنوں نے مشہور کیا کہ وہ تیموری خاندان کا دشمن ہے اور ہندوستان میں پٹھان سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے۔ برہان الملک سعادت خاں، صمصام الدولہ خاں دوراں اور دوسرے ارکان سلطنت نے چھتر سال اور اس کے ساتھیوں کو خطوط لکھ کر انہیں شورش پر آمادہ کیا اور یقین دلایا کہ شاہی حکومت کی جانب سے ان کے مقابلہ میں محمد خاں کی کوئی

---

[1] یو۔پی کے ضلع ہمیر پور میں واقع ہے۔

اعانت نہ کی جائے گی۔ بندیلوں نے اس طرف سے شہ پاکر ۱۱۴۱ھ ۱۷۲۹ء میں بغاوت کر دی اور مرہٹوں کو جو گردھر بہادر کو قتل کر کے مالوہ پر مسلط ہو چکے تھے اپنی مدد کے لیے بلا لیا محمد خاں ان واقعات سے بے خبر بُندیل کھنڈ کے پہاڑی علاقوں میں لشکر انداز تھا اور اس کی فوج کا بیشتر حصہ رخصتیں لے کر جا چکا تھا کہ باجی راؤ پیشوا اور راجہ چھترسال ۷۰ ہزار فوج کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑے۔ محمد خاں ان سے شکست کھا کر جیت پور کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا۔ اور وہاں سے اس نے بادشاہ اور اس کے ارکان سلطنت کو پیہم عرضیاں بھیجیں مگر ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی بلکہ امداد دینے کے بجائے صمصام الدولہ نے بندیلوں کو لکھا کہ "ایک کامیاب افغان سردار سلطنت کے لیے خطرناک ہے۔ اب جبکہ وہ تمہارے قابو میں آگیا ہے تم اس کو ہرگز نہ چھوڑو۔ اس کا سر بادشاہ کے لیے ایک پسندیدہ تحفہ ہوگا" محمد خاں کے بیٹے قائم خاں نے فیض آباد جا کر برہان الملک سعادت خاں سے مدد مانگی لیکن امداد تو درکنار وہاں اس کی گرفتاری کا سامان کیا گیا جس کی خبر پا کر اسے بھاگنا پڑا۔ آخر کار جب محمد خاں سب طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے ۱۱۴۲ھ ۱۷۲۹ء میں بندیلوں سے صلح کر لی اور ان کو یہ اقرار نامہ لکھ دیا کہ آئندہ وہ بندیل کھنڈ پر کبھی فوج کشی نہ کرے گا۔

اس کامیابی کے بعد مرہٹوں نے اپنی امداد کے صلہ میں راجہ چھترسال سے بُندیل کھنڈ کا جنوبی مغربی علاقہ حاصل کر لیا جس کی آمدنی ۳۰ لاکھ روپیہ سے زیادہ تھی[1]

---

[1] اس کے دو سال بعد راجہ چھترسال مر گیا اور اس کی ریاست اس کے دو بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک کو پنّا کا علاقہ ملا اور دوسرے کو جیت پور کا۔

قلبِ سلطنت پر مرہٹوں کی یورشیں

اب ان واقعات کا سلسلہ مکمل ہو چکا ہے جو نربدا کے شمال میں مرہٹوں اور سلطنت مغلیہ کے درمیان ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء تک پیش آئے۔ ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنتِ ہند کے معاملات سے نظام الملک کی دست کشی اور بادشاہ سے ان کی ناچاقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ۸ سال کی مدت میں مرہٹے گجرات میں سلطنت کے شریک غالب بن گئے۔ مالوہ کے بیشتر حصوں پر عملاً ان کا قبضہ ہو گیا۔ بندیل کھنڈ کا ایک حصہ ان کی حکومت میں شامل ہو گیا اور اب ان کے قدم آگرہ اور دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک طرف مرہٹوں کی دست درازیاں اس شدت کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف سلطنت کے فرمانروا کا یہ حال تھا کہ جب دکن، گجرات اور مالوہ سے وحشت انگیز خبریں آتیں تو اس کے خوشامدی مصاحب اس کا دل بہلانے کے لیے اسے دہلی کے باہر باغوں اور شکارگاہوں میں لے جاتے اور ہفتوں اس کو سیر و شکار میں مشغول رکھتے تاکہ ان منحوس خبروں سے خاطر نازک پر میل نہ آجائے۔ اس کا وزیر بھی اپنی تشویش رفع کرنے کے لیے دارالسلطنت سے باہر نکل جاتا تھا اور مہینہ مہینہ بھر سیر و تفریح سے اپنی پراگندہ بالی کا علاج کرتا رہتا تھا۔ اس دوران میں سلطنت کے سب کام ملتوی رہتے تھے اور جو قیمتی وقت ملک کی حفاظت میں صرف ہونا چاہیئے تھا وہ اسطرح ضائع کر دیا جاتا تھا۔

اس زیاں کاری سے ملک کی تباہی میں جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ جے سنگھ جیسے الدّ الخصام کو آگرہ اور مالوہ کی صوبہ داری پر مامور کر کے پوری کر دی گئی جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ صوبہ دار مرہٹوں کا دلی دوست اور سرگرم معاون تھا۔

باوجودیکہ اس نے سلطنت کے خرچ پر ۳۰ ہزار سوار اور اس سے زیادہ پیدل فوج رکھ چھوڑی تھی لیکن مالوہ کی حکومت پر مقرر ہونے کے بعد اس نے مرہٹوں کی دست برد کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ ان کو شمالی ہند کی طرف اور زیادہ بڑھ جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ کچھ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ مرہٹوں کے غارت گر دستے لوٹتے مارتے آگرہ کے نواح تک پہنچ گئے اور دہلی ان کی زد سے کچھ زیادہ دور نہ رہا۔ اب بادشاہ کی آنکھیں کھلیں۔ خود مرہٹوں کے مقابلہ کے لیے دہلی سے نکلا مگر فرید آباد سے آگے نہ بڑھا۔ آخر کار قمر الدین خاں وزیر الممالک نے جنگ پر جانے کی درخواست کی اور شوال ۱۱۴۵ھ اپریل ۱۷۳۳ء میں غازی الدین خاں فیروز جنگ[1] اور عظیم اللہ خاں ظہیر الدولہ[2] کو ساتھ لے کر آگرہ کی طرف گیا لیکن چند مہینے بعد کچھ کیے بغیر واپس آگیا۔ دوسرے سال مرہٹوں نے پھر حملہ کیا اور گوالیار سے لے کر اجمیر تک پھیل گئے اور آگرہ کے نواحی میں فتنۂ عظیم برپا کر دیا۔ اس مرتبہ صمصام الدولہ خاں دوراں بہادر کو جنگ پر جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس نے کئی مہینے تگ و دو میں صرف کر دیئے اور ۱۱۴۶ھ کے اواخر یا اوائل ۱۷۳۴ء میں اس وقت دہلی سے نکلا جبکہ بارش کی آمد قریب تھی اور حسب معمول مرہٹے اپنے گھروں کی طرف واپس جا رہے تھے۔ اس طرح یہ سال بھی کسی دفاعی کارروائی کے بغیر ضائع کر دیا گیا۔

۱۱۴۷ھ یا اواخر ۱۷۳۴ء میں مرہٹوں نے اور زیادہ شدید حملہ کیا اور اس کی

---

[1] نظام الملک کے فرزند اکبر اور قمر الدین خاں وزیر الممالک کے داماد۔

[2] قمر الدین خاں کے برادرِ عم زاد۔

مدافعت کے لیے بادشاہ نے وزیر الممالک قمر الدین خاں اور میر بخشی صمصام الدولہ کو بھیجا۔ مقدم الذکر کے لیے آگرہ کا محاذ مقرر کیا گیا جدھر خود باجی راؤ حملہ آور ہوا تھا اور مؤخر الذکر کو اجمیر کی طرف جانے کا حکم دیا گیا جہاں ملہار راؤ ہولکر غارت گری کر رہا تھا۔ اس نقشہ کے مطابق قمر الدین خاں آگرہ کی طرف سے مالوہ پر بڑھا نرور کے علاقہ میں باجی راؤ سے چند لڑائیاں ہوئیں مگر کوئی فیصلہ کن جنگ نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ برسات کا موسم آ گیا۔
اور باجی راؤ دکن واپس چلا گیا۔ اجمیر کی جانب صمصام الدولہ اور جے سنگھ ملہار راؤ ہولکر کے مقابلہ میں بڑھے۔ لیکن قبل اس کے کہ کوئی جنگ ہو جے سنگھ نے صمصام الدولہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ہولکر سے سمجھوتہ کر لے۔ چنانچہ اس نے صوبہ مالوہ سے ۲۲ لاکھ روپیہ چوتھ کے طور پر مرہٹوں کو دینا منظور کر لیا اور اجین میں پیشوا کا وکیل مقرر ہو گیا۔ یہ سمجھوتہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر میر بخشی نے خود اپنے اختیار سے کر لیا۔

۱۱۴۸ھ ۱۷۳۵ء میں مرہٹوں نے ایک طرف اودے پور، ناگور[1]، اور اجمیر پر، اور دوسری طرف بندیل کھنڈ کے راستے دوآبہ[2] کے علاقہ پر حملہ کیا۔ شاہی حکومت کی طرف سے صمصام الدولہ اجمیر کی طرف بھیجا گیا اور قمر الدین خاں دوآبہ کی طرف محمد خاں بنگش اور برہان الملک سعادت خاں کو حکم دیا گیا کہ مدافعت میں وزیر کے ساتھ مل کر کام کریں۔ لیکن اس مرتبہ بھی مرہٹوں کی دست درازیوں کا سدِباب نہ ہو سکا۔ سال کے اختتام پر ۱۷۳۶ء کے آغاز میں باجی راؤ نے راجہ جے سنگھ کے توسط سے درخواست

۱؎ جودھپور کے علاقہ میں۔

۲؎ گنگا اور جمنا کے درمیان کا علاقہ

کی کہ مالوہ اور گجرات میں چوتھ اور سردیشمکھی وصول کرنے کا حق بادشاہ کی جانب سے باضابطہ تسلیم کر لیا جائے۔ جے سنگھ اور صمصام الدولہ نے اس کی تائید میں پرزور سفارش کی اور ان کے اثر سے محمد شاہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ آئندہ فصل میں جنوب چنبل کے اضلاع سے باجی راؤ کو ۱۳ لاکھ روپیہ ادا کرے۔ نیز اس کو کوٹہ، بوندی وغیرہ راجپوت ریاستوں سے ۱۰۶۰۰۰ روپیہ بطور خراج وصول کرنے کا حق بھی اس نے دے دیا۔ اس دوسری شرط کا مقصود یہ تھا کہ راجپوتوں اور مرہٹوں کے درمیان عداوت پیدا کر دی جائے۔ خاں دوراں نے ان شرائط کے مطابق باجی راؤ سے گفتگو کرنے کے لیے اپنے وکیل یادگار خاں کشمیری، کرپارام اور سجابت علی خاں کو روانہ کیا اور انہیں خفیہ طور پر چوتھ اور سردیشمکھی کی سند بھی لکھوا کر دی تاکہ سمجھوتہ ہونے کے بعد وہ پیشوا کے حوالہ کر دی جائے لیکن باجی راؤ کے وکیل ڈھونڈو پنت پورندھری کو جو دہلی میں رہتا تھا اس تمام خفیہ کارروائی کا حال معلوم ہو گیا اور وہ اس نے باجی راؤ کو لکھ بھیجا۔ باجی راؤ نے اس سے سمجھ لیا کہ بادشاہ اور اس کے ارکان سلطنت بہت زیادہ مرعوب ہو چکے ہیں اور خود دب کر صلح کرنا چاہتے ہیں اس لیے اس نے اپنے مطالبات اور زیادہ بڑھا دیئے۔ ۸ ربیع الاول ۱۱۴۹ھ ۱۶ جولائی ۱۷۳۶ء کو دھولپور میں مجلس صلح منعقد ہوئی جس میں شاہی حکومت کی طرف سے یادگار خاں اور جے سنگھ اور مرہٹوں کی طرف سے خود باجی راؤ شریک تھا۔ باجی راؤ نے اس کانفرنس میں جو مطالبات پیش کیے ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) پورا صوبہ مالوہ اس کو جاگیر میں دے دیا جائے اور جن جن علاقوں پر روہیلے متصرف ہیں (مثلاً بھوپال) وہاں سے ان کو بے دخل کر دیا جائے۔

(۲) مانڈو، دھار اور رائے سین کے قلعے حوالہ کیے جائیں۔

(۳) چنبل کے جنوب کے پورے علاقہ میں جاگیر اور فوجداری کے اختیارات عطا کیئے جائیں۔

(۴) شاہی خزانہ سے ۵۰ لاکھ روپیہ دیا جائے ورنہ اتنی ہی آمدنی کا علاقہ بنگال، الٰہ آباد، بنارس، گیا اور متھرا کے اضلاع میں بطور جاگیر دے دیا جائے۔

(۵) شش صوبہ دکن میں سردیشپانڈیہ گری[1] کا حق تسلیم کیا جائے۔

محمد شاہ نے ابتدائی چار مطالبات کو رد کر دیا اور صرف آخری مطالبہ کو چھ لاکھ روپیہ کا نذرانہ لے کر قبول کر لیا۔ اس سے دراصل نظام الملک پر ایک ضرب لگانی مقصود تھی۔ وہ مرہٹوں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے جس اطمینان سے دکن میں بیٹھے ہوئے شمالی ہند کی دار و گیر کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس کو ختم کرنے اور ان کو پھر مرہٹوں کے مقابلہ میں لے آنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت نہ ہو سکتی تھی کہ دونوں کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرا دیئے جائیں اور نظام الملک کو اس امر کا یقین دلا دیا جائے کہ اگر مرکزی حکومت پر مرہٹوں کا اثر قائم ہو گیا تو دکن کا رئیس بھی اس کی مضرت سے محفوظ نہیں رہ سکتا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا محمد شاہ اور اس کے ارکانِ سلطنت کی یہ چال پوری طرح کامیاب ہوئی۔

دھولپور کی کانفرنس میں باجی راؤ اپنے مطالبات تسلیم نہ کرا سکا لیکن جے سنگھ

---

[1] سردیشپانڈگری کا حق کل آمدنی کا ۵ فی صدی ہوتا ہے۔ مرہٹوں کو دکن میں ۲۵ فی صدی چوتھ اور ۱۰ فی صدی سردیسمکھی کا حق پہلے سے تھا۔ اب انہوں نے ۵ فی صدی کا اور مطالبہ کیا۔

مرہٹوں کی حمایت پر تلا ہوا تھا۔ اس نے باجی راؤ کو اپنے اختیار سے مالوہ میں اپنا نائب مقرر کر دیا اور اس سے یہ رسمی اقرار نامہ لکھوا لیا کہ آئندہ شاہی علاقوں میں مرہٹے شورش برپا نہ کریں گے۔ اس طرح شاہی حکومت کو دوہرا نقصان پہنچا۔ مالوہ کا صوبہ بھی عملاً ہاتھ سے نکل گیا اور صلح بھی نہ ہوئی جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی۔

کانفرنس کی ناکامی کے بعد مرہٹوں نے ایک زبردست حملے کی تیاری کی اور ذوالقعدہ ۱۱۴۹ھ مارچ ۱۷۳۷ء میں ان کے دل بادل دوآبہ کے علاقہ پر ٹوٹ پڑے بادشاہ نے ان کے مقابلہ کے لیے قمر الدین خاں اور صمصام الدولہ کو کثیر فوج کے ساتھ بھیجا دوسری طرف سے اودھ کا صوبہ دار سعادت خاں اُن کو دوآبہ سے مارتا بھگاتا آگرہ پر صمصام الدولہ سے آملا۔ یہاں یہ دونوں اس انتظار میں ٹھہر گئے کہ قمر الدین خاں کے ساتھ مل کر باجی راؤ پر حملہ کریں جو اس وقت گوالیار کے قریب مقیم تھا لیکن باجی راؤ اس مرتبہ اپنے انتہائی مطالبات منوانے کے لیے ایک ایسی کارروائی کرنا چاہتا تھا جس سے بادشاہ خوف زدہ ہو جائے اور تمام ہندوستان پر مرہٹوں کی دھاک بیٹھ جائے چنانچہ وہ ان آرام طلب امیروں کو ضیافتوں میں مشغول چھوڑ کر ایک دوسرے راستے سے سیدھا دہلی کی طرف بڑھا اور ذوالحج کی نویں تاریخ کو اچانک دارالسلطنت کے سامنے نمودار ہو گیا۔ اس غیر متوقع حملہ کا وہی اثر ہوا جو باجی راؤ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس وقت شہر میں دس بارہ ہزار سوار اور ۲۰ ہزار پیادہ فوج موجود تھی جو مرہٹہ فوج کے مقابلہ میں کسی طرح کم نہ تھی۔ سامان جنگ بھی کافی تھا۔ خورد و نوش کے سامان کی بھی کمی نہ تھی۔ اور شہر پناہ بھی اتنی مضبوط ضرور تھی کہ توپوں اور قلعہ شکن آلات کے بغیر مرہٹے اس کو مسخر نہ کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں دہلی سے تھوڑے ہی فاصلہ پر وزیر، میر بخشی اور

صوبہ دارِ اودھ کثیر التعداد فوجوں کے ساتھ موجود تھے۔ اس حالت میں محاصرہ چند روز سے زیادہ نہ رہ سکتا تھا مگر اس وقت اصلی کمی ظاہری وسائل کی نہ تھی بلکہ باطنی خصائل کی تھی۔ بادشاہ سے لیکر سلطنت کے ادنیٰ کارپردازوں تک سب جرأت، تدبیر اور عقل و فکر سے عاری تھے۔ ان کو بدحواس کرنے کے لیے صرف یہ خیال کافی تھا کہ جو دشمن متعدد شاہی فوجوں کے درمیان سے چیرتا پھاڑتا عین دارالسلطنت کے سامنے آن پہنچا ہے وہ بالیقین ایک بے پناہ دشمن ہے۔ اس حالت میں وہ صرف ایک ہی تدبیر سوچ سکتے تھے اور وہ یہ تھی کہ اپنی جانیں بچا کر جمنا کے رستے بھاگ نکلیں لیکن سعداللہ خاں میر آتش نے، جو نظام الملک کے ساتھ دکن کی مہمات میں کام کر چکا تھا۔ ان کی ہمت بندھائی اور اس کے مشورے سے ایک فوج مارا مار مرتب کر کے امیر خاں عمدۃ الملک کے زیر قیادت باجی راؤ کے مقابلہ میں بھیجی گئی۔ اس فوج میں بہت سے ایسے نوجوان سردار بھی تھے جو بہادری و سپہ گری کا غرور تو بہت رکھتے تھے مگر فنِ جنگ کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ انہوں نے امیر خاں کے احکام کی اطاعت نہ کی، جلد بازی سے کام لیکر مرہٹوں سے بے تحاشا جا بھڑے اور تھوڑی سی زد و خورد کے بعد اس طرح بدحواس ہو کر بھاگے کہ باقی فوج کے بھی پاؤں اکھڑ گئے۔ اس شکست سے شہر اور قلعہ معلیٰ میں انتہا درجہ کی سراسیمگی پھیل گئی۔ بادشاہ سے لیکر امرا و عمائدِ شہر تک سب نے نکل بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر عین وقت پر مرہٹوں کے حملہ کی خبر سن کر قمرالدین خاں لمبے لمبے دھاوے مارتا ہوا آ پہنچا اور اس کے آتے ہی باجی راؤ راجپوتانہ کی طرف چل دیا۔

یہ واقعہ ایسا تھا جس نے بادشاہ اور اس کے مشیروں کے ہوش درست کر دیئے

اب انہوں نے محسوس کیا کہ مرہٹوں کی شورش اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اس کا سدِ باب ان کے بس میں نہیں ہے اور اگر اس وقت اس کا سدِ باب نہ ہوا تو صرف سلطنت ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ جان، مال اور آبرو تک کی خیر نہیں۔ اس خوف اور پریشانی کی حالت میں انہوں نے ہر طرف نگاہ دوڑائی مگر تمام ملک میں نظام الملک کے سوا کوئی شخص ایسا نظر نہ آیا جو سلطنت کو مرہٹوں کے سیلاب سے بچا سکتا ہو۔ آخر کار تمام اہل دربار نے جن میں نظام الملک کا سب سے بڑا مخالف صمصام الدولہ بھی شامل تھا۔ بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ صوبہ دار دکن کی طلب کا فرمان بھیجے اور عنان اقتدار پھر اس کے سپرد کر دے۔

۳۔ نظام الملک دہلی میں

نظام الملک نے چھ سال قبل مرہٹوں سے سمجھوتہ کیا تھا۔ اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ دکن میں ان کو چند سال کے لیے امن نصیب ہو جائے اور وہ سکون واطمینان کی فضا میں اس شدید ابتری و بدنظمی کی اصلاح کر سکیں جو ستّر اسّی برس کی پیہم بدامنی سے دکن کے صوبوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ غرض اس سمجھوتہ سے ان کو حاصل ہو گئی۔ چھ برس کی یہ پوری مدت انہوں نے نظام حکومت کی اصلاح اور امورِ مملکت کے ضبط و ربط میں صرف کی۔ یہی زمانہ ہے جس میں انہوں نے مرہٹوں کی سرحد سے متصل علاقوں کے متعدد شہروں کو مستحکم کیا۔ اطراف و نواحی کے سرکش زمینداروں کو مطیع کر کے ان سے خراج اور مالگزاری کے متعلق ایسے معاملات طے کیے جو حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات کو پائیدار کرنے والے تھے۔ دور افتادہ ممالک کے فوجداروں

اور عاملوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار از سرِ نو قائم کیا۔ حکومت کے محکموں کی از سرِ نو تنظیم کی۔ ضوابط و قوانین مرتب اور نافذ کیے۔ عدالت کوتوالی اور دیوانی و مال کے بگڑے ہوئے نظام کو پھر درست کیا۔ دکن کے مختلف اقطاع میں اپنے امرائے فوج کو جاگیریں دیں اور ان کی مدد سے اپنی فوجی طاقت کو اس قدر ترقی دے دی کہ بوقت ضرورت وہ ۲ لاکھ فوج میدانِ جنگ میں اتار سکتے تھے۔ غرض اسی چھ سال کی مدت میں انہوں نے نظام حکومت کا وہ ڈھانچہ تیار کیا جو سر سالار جنگ کے عہد تک برابر قائم رہا بلکہ بعد کے دور میں بھی اس کے اندر کچھ زیادہ ترمیم کی ضرورت نہ پیش آئی۔

اس تعمیری کام کی تکمیل کے لیے ان کو امن و اطمینان کے مزید چند سال درکار تھے کیونکہ ابھی تک کرناٹک کے علاقوں پر ان کی حکومت کی گرفت کافی مضبوط نہیں ہوئی تھی لیکن شمالی ہند کے تغیراتِ سیاسی نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی توجہ اورنگ آباد سے ہٹا کر دہلی کی طرف مبذول کریں۔ مرہٹوں کے سیلاب میں سلطنتِ مغلیہ کا قصر ان کی توقع سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ متزلزل ہو گیا۔ دکن کے برگی چند سال کے اندر گجرات، مالوہ، راجپوتانہ، اجمیر، آگرہ اور الہ آباد کے صوبوں میں چھا گئے اور دارالسلطنت پر حملہ کر کے انہوں نے نہ صرف یہ کہ بادشاہ اور اس کے ارکان سلطنت کو مرعوب کر دیا بلکہ تمام ہندوستان پر اپنی قوت کی دھاک بٹھا دی۔ حالات کے اس نوبت پر پہنچ جانے کے بعد نظام الملک کے لیے خاموش رہنا خودکشی کا ہم معنی تھا کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مرہٹے مرکزی حکومت پر مسلط ہو جاتے۔ ہندوستان کا ایک بڑا حصہ ان کے قبضہ میں آ جاتا اور پھر وہ ایک بالادست طاقت کی حیثیت سے دکن کے رئیس کو اپنا تابع فرمان بنانے کی کوشش کرتے، حالانکہ اب تک آئین

سلطنت کے مطابق صوبہ دار دکن خود راجہ ساہو پر بالادستی کے اختیارات رکھتا تھا۔ علاوہ بریں باجی راؤ نے اب اُس مجھوتہ کو بھی توڑ دیا تھا جو چھ سال قبل اس کے اور نظام الملک کے درمیان ہوا تھا۔ بادشاہ پر دباؤ ڈال کر مشش صوبۂ دکن میں سر دیشپانڈیہ گری کی سند حاصل کر لی تھی جو نہ صرف اس سمجھوتہ کی خلاف ورزی تھی بلکہ اس بات کی دلیل بھی تھی کہ بادشاہ کو مغلوب کرنے کے بعد مرہٹے پہلے سے بھی زیادہ قوی ہو کر دکن پر اپنا دست تعدی دراز کریں گے۔

یہ اسباب تھے جن کی بنا پر بادشاہ کا فرمان طلب پہنچتے ہی نظام الملک دہلی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ دکن میں انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ کو نائب مقرر کیا۔ ۷؍ ذی الحج ۱۱۴۹ھ، ۱۷؍ اپریل ۱۷۳۷ء کو برہانپور سے روانہ ہوئے اور ۵؍ ربیع الاول ۱۱۵۰ھ ۱۲؍ جولائی ۱۷۳۷ء کو دہلی پہنچ گئے۔ شاہی حکومت کی جانب سے ان کا ایسا استقبال ہوا جو اس سے پہلے کبھی کسی صوبہ دار کا نہ ہوا تھا۔ وزیر الممالک قمر الدین خاں ان کو لینے کے لیے دہلی سے ۵۵ میل تک آیا۔ راستے میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بادشاہ کی جانب سے خواجہ سرا اور خواص تحفے لے کر آتے، مزاج پرسی کرتے اور بادشاہ کا اشتیاق ملاقات ظاہر کرتے۔ ان کے لیے صدیوں کا مقرر آئین توڑا گیا اور خاص طور پر حکم دیا گیا کہ ان کی سواری دار السلطنت میں نوبت و نقارہ کے ساتھ داخل ہو حالانکہ جہاں بادشاہ مقیم ہو وہاں ۲ میل کے اندر کسی امیر کی نوبت نہیں بج سکتی تھی۔ جب وہ دہلی میں داخل ہوئے تو ان کی سواری دیکھنے کے لیے سارا شہر امنڈ آیا اور ہر طرف ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ دیوان خاص میں بادشاہ نے شرف ملازمت بخشا اور خلعت میں چارقب عنایت کیا جو اس وقت تک صرف تیموری نسل کے شاہزادوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس غیر معمولی استقبال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بادشاہ سے لیکر شہر کے ادنیٰ باشندے تک سب اس امر کو محسوس

کر رہے تھے کہ تمام ملک میں صرف یہی ایک شخص ہے جو سلطنت کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔

ایک مہینہ بعد، ۱۰ ربیع الثانی ۱۳ اگست کو بادشاہ نے راجہ جے سنگھ اور باجی راؤ کو صوبہ آگرہ اور صوبۂ مالوہ سے معزول کر کے نظام الملک کے بڑے بیٹے غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کو ان دونوں صوبوں کا والی مقرر کیا اور اس تقرر کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ نظام الملک خود جا کر مرہٹوں کو مالوہ سے نکال دیں۔ اس زمانہ میں نادر شاہ والی ایران قندھار کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ اس کے سفرا دہلی میں مقیم تھے اور تمام آثار سے نمایاں ہو رہا تھا کہ تسخیر قندھار کے بعد کابل اور پھر پنجاب کی باری آنے والی ہے۔ نظام الملک نے بادشاہ کو اس بزرگ تر خطرے کی طرف توجہ دلائی اور اس سے کہا کہ مرہٹوں کے فتنہ کو فرو کرنے کے لیے تو میرے چند آزمودہ کار امیر کافی ہیں۔ وہ مناسب طریقہ سے اس کا سدِ باب کر دیں گے لیکن اس وقت مرہٹوں سے زیادہ بڑا خطرہ نادر شاہ کا ہے۔ اس کے لیے بہترین تدبیر یہ ہے کہ فوج اور سامان جنگ فراہم کر کے آپ خود افغانستان کی طرف روانہ ہوں اور مجھے آگے بھیج دیں تاکہ میں غزنی میں بیٹھ کر شاہ ایران کی نقل و حرکت پر نظر رکھوں مگر محمد شاہ مرہٹوں سے اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ وہ یہ خیال ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ان سے زیادہ خطرناک بھی کوئی قوت ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ سرحد افغانستان کے پہاڑی دروں سے گذرنا اور جنگجو افغان قبائل سے عہدہ برآ ہو کر ہندوستان پہنچنا نادر شاہ کے لیے آسان نہیں ہے۔ لہٰذا تم ادھر سے بے فکر ہو کر مالوہ کا رخ کرو اور اپنی تمام توجہ مرہٹوں کی شورش فرو کرنے میں صرف کر دو۔

بہر حال حکم شاہی کے مطابق نظام الملک دہلی سے ۳۰ ہزار فوج اور ایک زبردست توپ خانہ جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بہتر شمار ہوتا تھا لیکر روانہ

ہوئے۔ آگرہ میں اپنے ماموں زاد بھائی محی الدین قلی خاں کو نائب صوبہ دار مقرر کیا۔ وہاں سے اِٹاوہ، بکھن پور، کالپی اور بندیل کھنڈ ہوتے ہوئے بھوپال[1] پہنچ گئے۔ وہیں سے انہوں نے ناصر جنگ کو تاکیدی احکام بھیجے تھے کہ وہ باجی راؤ کو دکن سے نکلنے کا موقع نہ دیں لیکن اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ باجی راؤ ۸۰ ہزار فوج لیکر نربدا اتر آیا۔ شعبان ۱۱۵۰ھ دسمبر ۱۷۳۷ء میں جب وہ نظام الملک کے مقابلہ پر پہنچا تو انہوں نے بھوپال کے قلعہ میں اور اس کے قریب کی پہاڑیوں پر ایک مستحکم پوزیشن اختیار کر لی جس کے ایک جانب تالاب ہے اور دوسرے جانب ایک نالہ بہتا ہے۔ اس وقت ان کی فوج بندیل کھنڈ اور راجپوتانہ کے سرداروں کی جمعیتیں ملا کر ۳۴ ہزار کے قریب تھی۔ مرہٹے حسب معمول چاروں طرف پھیل گئے اور انہوں نے غارت گری کر کے نظام الملک کی فوج میں رسد اور چارہ کا قحط برپا کر دیا۔ سعادت خاں صوبہ دار اودھ کے داماد اور بھانجے ابو المنصور خاں صفدر جنگ اور کوٹہ کے راجہ نے ان کو مدد پہنچانے کی کوشش کی لیکن ملہار راؤ ہولکر اور جسونت راؤ پوار نے انہیں شکست دے کر پسپا کر دیا۔ نظام الملک نے امداد کے لیے دہلی اور اورنگ آباد کی طرف قاصد بھیجے۔ مگر دہلی سے کوئی امداد نہ بھیجی گئی کیونکہ صمصام الدولہ کا جذبۂ حسد اب پھر صوبہ دار دکن کے خلاف بھڑک اٹھا تھا۔ رہا اورنگ آباد تو وہاں ناصر جنگ نے بعجلت ایک فوج مہیا کر کے اپنے والد کو امداد بھیجنے کی تیاری کی لیکن دریائے تپتی پر باجی راؤ کے بھائی چمناجی آپا نے ناکہ بندی کر رکھی تھی اس لیے ادھر سے بھی کوئی مدد نہ پہنچ سکی۔ خود نظام الملک کی فوج میں راجپوت سردار غدر پر آمادہ تھے اور ان کو صرف اس چیز

---

[1] اس زمانہ میں بھوپال کا رئیس یار محمد خاں بن دوست محمد خاں تھا۔

نے روک رکھا تھا کہ نظام الملک نے ان کا سامان اپنے پاس قلعہ میں رکھ چھوڑا تھا. قحط اور چارہ کی قلت کا یہ حال تھا کہ روپیہ کا ایک سیر غلہ مل رہا تھا اور جانور بھوکوں مر رہے تھے۔ آخر اس محاصرہ کی حالت سے تنگ آکر نظام الملک قلعے سے نکلے۔ بھاری سامان بھوپال اور اسلام گڑھ میں چھوڑا، اور فوج کو توپوں کی حفاظت میں لے کر دہلی کی جانب روانہ ہوئے مرہٹے ہر طرف سے ہجوم کر کے آتے تھے مگر توپخانہ کی آتش بازی ان کو قریب نہ پھٹکنے دیتی تھی۔ اس طرح لڑتے بھڑتے تین میل روزانہ کی رفتار سے نظام الملک آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ دوراھہ پہنچ گئے جو سرونج سے ۴۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اب محاصرہ کی حالت ختم ہو چکی تھی لیکن مرہٹوں کی غارت گری اور رسد و چارہ کی قلت نے نوبت اس حد کو پہنچا دی تھی کہ فوج کے لیے نقل و حرکت مشکل تھی۔ اس حالت میں نظام الملک کے لیے بجز اس کے چارہ نہ تھا کہ دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کریں۔ یا ایک فیصلہ کن جنگ، یا اعتراف شکست کے ساتھ صلح۔ فوج کی معنوی اور جسمانی کمزوری کو دیکھتے ہوئے پہلی صورت ممکن نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے دوسری صورت کو ترجیح دی اور ۲۶ رمضان ۱۱۵۰ھ/۶ جنوری ۱۷۳۸ء کو دوراھہ میں باجی راؤ سے صلح کر لی۔ اس صلح نامہ میں انہوں نے باجی راؤ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کو چنبل اور نربدا کے درمیان کا پورا علاقہ بادشاہ سے دلوا دیں گے اور مصارف جنگ کے عوض ۵۰ لاکھ روپیہ نقد بھی دلوانے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح جنگ ختم ہو گئی اور ذی الحجہ ۱۱۵۰ھ اپریل ۱۷۳۸ء میں نظام الملک دہلی واپس پہنچ گئے۔

نادر شاہ کا حملہ

نظام الملک کی واپسی کے بعد ہی وہ طوفان ہندوستان پر امنڈ آیا جس کا خطرہ

انہوں نے مالوہ کی مہم پر جانے سے پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا۔ یہ نادر شاہ فرمانروائے ایران کے حملہ کا خطرہ تھا۔ اس مشہور فاتح نے ۱۱۴۹ھ ۱۷۳۶ء میں صفوی خاندان سے ایران کا تخت چھیننے کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی تھی وہ قندھار کے غلزیئوں کی سرکوبی تھی کیونکہ انہوں نے چند سال قبل نہ صرف جنوبی افغانستان کا پورا علاقہ سلطنت ایران سے چھین لیا تھا بلکہ خود ایران پر حملہ کر کے صفوی خاندان کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ ۱۱۴۹ھ ۱۷۳۶ء میں اس نے ۸۰ ہزار فوج کے ساتھ قندھار پر حملہ کیا اور ساتھ ہی محمد شاہ کو پیغام بھیجا کہ آپ صوبہ کابل کے حکام کو احکام دے دیجئے کہ وہ قندھار کے افغانوں کو اپنے علاقہ میں پناہ نہ لینے دیں۔ جواب میں محمد شاہ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ ہم تمہارے باغیوں کو اپنے ہاں پناہ نہ دیں گے مگر جب نادر شاہ قندھار پر حملہ آور ہوا اور افاغنہ اس سے شکست کھا کر بھاگے تو سلطنت مغلیہ کی سرحد پر کسی نے ان کا راستہ نہ روکا اور غزنی و کابل کے علاقہ میں ان کو پناہ لینے کا موقع دے دیا گیا۔ اس پر نادر شاہ نے محرم ۱۱۵۰ھ مئی ۱۷۳۷ء میں پھر ایک سفیر دہلی بھیجا اور اس کو حکم دیا کہ ۴۰ دن کے اندر محمد شاہ سے اس خلاف ورزیِ عہد کی بابت جواب لیکر آئے لیکن محمد شاہ ایک سال تک اس کو ٹالتا رہا اور پیہم تقاضوں کے باوجود دہلی کے دربار سے کوئی جواب نہ ملا۔ نظام الملک جس زمانہ میں دکن سے دہلی پہنچے اس وقت یہ سفیر جواب کے لیے دربار سے تقاضا کر رہا تھا اور نادر شاہ قندھار کے محاصرہ اور غلزائیوں کی سرکوبی میں پوری شدت کیساتھ مشغول تھا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے نظام الملک نے اس حالت کو دیکھکر ابتدا ہی میں سمجھ لیا تھا کہ قندھار کی فتح کے بعد فراریوں کے تعاقب کا بہانہ کر کے نادر شاہ کابل و غزنی کے علاقہ میں گھس آئیگا اور سلطنتِ مغلیہ کو کمزور پا کر پھر ہندوستان کا رخ کریگا۔ اسی بنا پر انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ مرہٹوں سے پہلے

نادر شاہ کے مقابلہ کی تیاری کرنی ضروری ہے مگر اس وقت ان کے مشورہ کو رد کر دیا گیا اور آخر کار ذی القعدہ ۱۱۵۰ھ مارچ ۱۷۳۸ء میں قندھار فتح ہو گیا۔ اور اس کے بعد ہی نادر شاہ نے اپنے سفیر کو حکم بھیج دیا کہ خواہ جواب ملے یا نہ ملے تم واپس آجاؤ۔ سفیر کا واپس بلانا گویا نادر کی جانب سے اعلان جنگ تھا۔ چنانچہ محرم ۱۱۵۱ھ مئی ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے مغل افغانستان (غزنی وکابل) پر حملہ کر دیا۔

ایک نظر اس دفاعی قوت پر بھی ڈال لیجئے جس کے بھروسے پر محمد شاہ نے نادری خطرہ کو ہیچ سمجھ رکھا تھا۔ محمد شاہ کے ابتدائی عہد سے کابل کا صوبہ دار ناصر خاں تھا جس کو دربار بادشاہی میں ظفر خاں روشن الدولہ کے ساتھ توسل حاصل تھا۔ افغانستان کے دفاعی انتظامات، سرحدی اور کوہستانی راستوں کی حفاظت اور قبائل کے وظائف کے لیے جس قدر رقم خزانۂ شاہی سے مقرر تھی۔ وہ روشن الدولہ ہی کی معرفت بھیجی جاتی تھی۔ بعد میں جب بادشاہ پر صمصام الدولہ کا رسوخ زیادہ ہوا تو اس نے روشن الدولہ کا استیصال کرنے کے لیے منجملہ اور الزامات کے ایک الزام یہ بھی لگایا کہ وہ کابل کی رقم میں غبن کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے اغوا سے محمد شاہ نے یہ رقم بھیجنی بند کر دی۔ ناصر خاں نے اس پر پیہم احتجاج کیے اور اس رقم کے بغیر افغانستان کی حفاظت سے اپنی معذوری کا اظہار کیا مگر اس پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل کے وظائف بند ہو گئے اور انہوں نے صوبہ دار کابل کے احکام کی اطاعت چھوڑ دی۔ پہاڑی راستوں کے محافظ تنخواہیں نہ ملنے کے باعث اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ فوج کی تنخواہیں پانچ سال تک بند رہیں اور ان کا نظم وضبط ختم ہو گیا۔ جب نادر شاہ قندھار پر حملہ آور ہوا اور قزلباشوں کے

دستے سرحد کابل تک تاخت وتاراج کرتے ہوئے پہنچ گئے تو ناصر خاں نے پھر روپیہ کی شدید ضرورت ظاہر کی اور اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی جو قضائے مُبرَم کی طرح اس کے سر پر چھا رہا تھا مگر صمصام الدولہ کے حامیوں نے اس کے ظاہر کردہ خطرات کو بالکل جعلی افسانہ قرار دیا اور بادشاہ کو یقین دلایا کہ یہ سب باتیں قمرالدین خاں اور نظام الملک کے اشارے سے کی جارہی ہیں تاکہ صمصام الدولہ کے مقابلہ میں پھر تورانی گروہ کا اثر قائم کیا جائے۔ آخر کار ناصر خاں کابل کو ایک قلعہ دار کی حفاظت میں چھوڑ کر آرام سے پشاور آن بیٹھا۔

کابل کے بعد ہندوستان کا دوسرا صوبہ جو نادر شاہ کی پیش قدمی کو روک سکتا تھا، پنجاب تھا۔ یہاں کا صوبہ دار زکریا خاں ایک بہادر اور منتظم شخص تھا مگر چونکہ وہ تورانی گروہ سے تعلق رکھتا تھا اور قمرالدین خاں کا خالہ زاد بھائی تھا، اس لیے ہندوستانی گروہ اور اس کا سردار صمصام الدولہ اس سے دشمنی رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ان لوگوں نے مسلسل اس کی غیبتیں کر کے بادشاہ کو اس سے سخت بدظن کر دیا اور جب نادر شاہ کے حملہ کا خوف ظاہر کر کے اس نے مالی امداد کے لیے عرضیاں بھیجیں تو انہوں نے بادشاہ کو یقین دلایا کہ یہ بھی اسی تورانی سازش کا شگوفہ ہے اس طرح پنجاب کی حفاظت کا بھی بروقت کوئی انتظام نہ ہوسکا۔

ان حالات میں جب نادر شاہ نے سلطنتِ ہندوستان پر حملہ کیا تو کوئی قوت اس کو روکنے والی نہ تھی۔ صفر ۱۱۵۱ھ مئی ۱۷۳۸ء میں غزنی بلا مزاحمت مفتوح ہوگیا۔ اس کے ایک مہینہ بعد کابل کے قلعہ دار نے بھی ناکام مقابلہ کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ جمادی الاخریٰ ستمبر میں جلال آباد مسخر ہوا اور اس جرم میں کہ وہاں کے

لوگوں نے نادر شاہ کے ایلچیوں کو قتل کر دیا تھا۔ سارا شہر تباہ و برباد کر دیا گیا۔ شعبان (نومبر) میں نادر شاہ ہندوستان کی طرف بڑھا۔ ناصر خاں نے پشاور کے نواحی سے ۲۰ ہزار افغان جمع کر کے علی مسجد اور جمرود کے درمیان درہ پر اس کا راستہ روکا۔ لیکن یہ بھیڑ بھاڑ نادر کی باضابطہ فوج کے ایک حملہ کی بھی تاب نہ لا سکی۔ ناصر خاں اور اس کے ہمراہی سردار گرفتار ہوئے اور پشاور فتح ہو گیا۔ اس کے بعد نادر شاہ پنجاب کی طرف بڑھا۔ زکریا خاں صوبہ دار پنجاب نے شاہی حکومت کی امداد کے بغیر جو کچھ تیاری ممکن تھی کی اور لاہور پر ایرانی فاتح کا مقابلہ کیا۔ مگر ڈیڑھ دن سے زیادہ وہ بھی نہ ٹھہر سکا اور شوال (جنوری ۱۷۳۹ء) میں اس نے لاہور حوالہ کر دیا۔ اس فاتحانہ اقدام کے دوران میں اٹک سے لے کر سرہند تک ہر طرف قزلباشوں کے دستے پھیل گئے اور انہوں نے اپنی ترکتازیوں سے شہروں، قصبوں اور قریوں کو غارت کر کے سارے پنجاب میں تہلکہ عظیم برپا کر دیا۔ لاہور سے چل کر نادر شاہ سرہند، انبالہ، شاہ آباد، تھانیسر ہوتا ہوا سرائے عظیم آباد پر خیمہ زن ہوا جو کرنال سے صرف ۱۲ میل جانب شمال واقع ہے۔

محمد شاہ کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب سارا افغانستان ہاتھ سے نکل چکا تھا اور نادری سیلاب خیبر کے بند کو توڑ کر پشاور تک بڑھ آیا تھا۔ اب سلطنتِ ہند کے فرمانروا کو یقین آیا کہ اس کے ملک پر واقعی کوئی حملہ ہوا ہے۔ اس نے سلطنت کے تین سب سے بڑے امیروں کو ایک کروڑ روپیہ فوج اور سامان جنگ کی فراہمی کے لیے عطا کیا اور رمضان ۱۱۵۱ھ دسمبر ۱۷۳۸ء میں انہیں دہلی سے رخصت کیا۔ یہ تین امیر نظام الملک آصف جاہ وکیل مطلق، اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر الممالک اور صمصام الدولہ خاں دوراں میر بخشی تھے۔ لیکن ان تینوں میں سے ایک کو بھی سردار

اور قائد اعلیٰ بنا کر سیاہ وسپید کے اختیارات نہیں دیئے گئے حالانکہ ایسے مواقع پر ایک شخص کو مختار مطلق بنانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی سے دو فرسنگ جاکر یہ لوگ باؤلی کی سرائے پر ٹھہر گئے اور غنیم کا مقابلہ کرنے کے بجائے آپس کے توڑ جوڑ میں وقت ضائع کرنے لگے۔ نظام الملک اور اعتماد الدولہ تورانی گروہ پر اعتماد رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مدافعت کا کام انہی پر چھوڑ دیا جائے۔ امراء واعیان سلطنت میں جو لوگ کچھ سمجھ بوجھ رکھتے تھے ان کی بھی یہ رائے تھی کہ ملک میں اس وقت صرف نظام الملک ہی ایک ایسا جہاندیدہ، آزمودہ کار، ماہر جنگ اور مدبر سیاست داں ہے جس نے عالمگیر کی آنکھیں دیکھی ہیں اور اس مہلک طوفان میں سلطنت کے جہاز کو بچا لے جانے کی اگر کوئی صورت ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ اس شخص کو ناخدا بنا کر اسی کی تدبیر پر جہاز کو چھوڑ دیا جائے۔ اس کے برعکس خاں دوراں اور اس کے ساتھ پورا ہندوستانی گروہ اسکا سخت مخالف تھا کہ تورانیوں کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار دیدی جائے۔ یہ لوگ تورانیوں کو غدار سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تورانی اور ایرانی خائن کے ساتھ مل جائیں گے اور پھر ہندوستان میں ایک غیر ملکی حکومت قائم کردیں گے[۱] وہ تمام تر ہندوستان کے راجپوتوں

---

[۱] اسی زمانہ میں جب زکریا خاں نے مجبور ہو کر لاہور نادر شاہ کے سپرد کردیا تو ہندوستانی گروہ نے اس واقعہ کو تورانیوں کی غداری کے ثبوت میں پیش کیا اور زکریا خاں پر یہ الزام لگایا کہ اس نے ایرانیوں کے ساتھ ساز باز کر کے ملک فروشی کی ہے حالانکہ جس وقت ایرانی حملہ کی مدافعت کے لیے زکریا خاں بار بار مدد طلب کر رہا تھا اس وقت یہی ہندوستانی گروہ تھا جس نے اس کو جھٹلایا اور اس کی مدد کے لیے ایک پیسہ اور ایک سپاہی تک نہ بھیجا۔

اور مرہٹوں پر اعتماد رکھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ راجپوتوں کی تلوار اور مرہٹوں کی جنگِ قزاقی نادر شاہ کا منہ پھیر دے گی۔ چنانچہ انہوں نے جے سنگھ سوائی، باجی راؤ مرہٹہ اور دوسرے بڑے بڑے سرداروں کو بادشاہ کی طرف سے خطوط لکھوائے مگر عین وقت پر ثابت ہو گیا کہ ان میں سے کوئی سلطنت اور ملک کی مدافعت کیلئے تیار نہ تھا۔ جے سنگھ اور راجپوت سردار اس نازک موقع سے فائدہ اٹھا کر مغلوں کی اطاعت کا جوا اتار پھینکنے کے لیے تیار ہو گئے۔ باجی راؤ نے بظاہر امداد پر آمادگی ظاہر کی[1] مگر عملاً اس نے شمالی ہند کی مدافعت سے کوئی دلچسپی نہ لی اور صرف مہاراشٹر کی حفاظت کے لیے نربدا اور بندھیاچل کے استحکامات کی بندش پر اپنی ساری توجہ مبذول رکھی۔

غرض اس دھڑے بندی اور اندرونی اختلاف میں پورا ایک مہینہ ضائع کر دیا گیا یہاں تک کہ نادر شاہ کے اٹک پار اتر آنے کی خبر پہنچی تب یہ لوگ لاہور کی طرف روانہ ہوئے مگر پانی پت میں ان کو خبر ملی کہ نادر شاہ نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے اس لیے انہوں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور محمد شاہ کو باصرار لکھا کہ آپ کے آئے بغیر کام نہ چلے گا۔ آخر کار محمد شاہ کو بھی اپنے عشرت کدہ سے نکلنا پڑا۔ پانی پت پہنچ کر اس نے امرا سے مشورہ طلب کیا کہ جنگ کس نہج پر کی جائے۔ نظام الملک نے رائے دی

---

[1] باجی راؤ اپنے ایک خط میں پیلاجی جادوں کو لکھتا ہے:۔

"میں شمالی ہند کی طرف منزل بمنزل کوچ کروں گا۔ طہماسپ قلی پادشاہ ایران دہلی کی تسخیر کے لیے نکلا ہے میں محمد شاہ کی امداد کے لیے ملہار راؤ ہولکر رانوجی سندھیا اور اودا جی پوار کے ماتحت مالوہ کی فوج بھیج رہا ہوں۔ مرہٹہ راج کے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ وہ اس موقع پر دہلی کے بادشاہ کی مدد کرے۔"

کرنال چل کر مدافعت کی تیاری کی جائے کیونکہ وہاں میدان وسیع ہے اور علی مردان کی نہر سے پانی بافراط مل سکتا ہے۔ مجلس جنگ کے دوسرے ارکان نے بھی اس رائے کو پسند کیا۔ ذی قعدہ کی ابتدا فروری ۱۷۳۹ء میں کرنال پر جا کر ڈیرے ڈال دیئے گئے۔ بادشاہی فوجیں ۱۲ میل کے رقبہ پر پھیل گئیں۔ ان کے گرد ایک خندق اور مٹی کی دیوار تعمیر کی گئی اور اس کے مورچوں پر توپیں لگا دی گئیں۔ اس کے ایک ہفتہ بعد نادر شاہ بھی مقابلہ پر پہنچا اور کرنال سے چھ میل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوا۔

اس مقابلہ میں نادر شاہ اور محمد شاہ کی قوت کا موازنہ کرنے کے لیے صرف اتنا جان لینا کافی نہیں ہے کہ نادر کے کیمپ میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب آدمی تھے اور محمد شاہ کے کیمپ میں ۱۰ لاکھ۔ بلکہ یہ فرق بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ نادر کے ڈیڑھ لاکھ میں سے ۵۰ ہزار جنگ آزما سپاہی تھے اور باقی ایک لاکھ غیر مقاتل متعلقین لشکر۔ گویا لشکر کا پورا ایک تہائی حصہ مقاتل فوج پر مشتمل تھا۔ بخلاف اس کے محمد شاہ کے کیمپ میں ۷۵ ہزار سے زیادہ مردان کار نہ تھے اور اس لحاظ سے یہاں مقاتلین اور غیر مقاتلین کے درمیان ایک اور ۱۲ کی نسبت تھی۔ علاوہ بریں نادر شاہ کے کیمپ میں غیر مقاتل خدام، شاگرد پیشہ، سائیس حتیٰ کہ عورتیں تک مسلح تھیں۔ سب کی سواری کے لیے گھوڑے موجود تھے اور ضرورت کے وقت سب اپنی حفاظت آپ کرنے کے قابل تھے مگر محمد شاہ کے کیمپ میں بڑا لاؤ لشکر ان خواتین حرم، لونڈیوں، ماماؤں، خواجہ سراؤں، خادموں اور امراء کے دوسرے متعلقین پر مشتمل تھا جنہوں نے کبھی رن کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ اس حالت میں نادر شاہ کی فوج کے ایک سپاہی پر دو آدمیوں کی حفاظت کا بار تھا۔ اور وہ دو آدمی بھی ایسے تھے جو ضرورت کے وقت اس بار کو خود اٹھا سکتے تھے۔

لیکن محمد شاہ کی فوج کے ہر سپاہی پر اپنے لشکر کے ۱۲ آدمیوں کی حفاظت کا بوجھ تھا اور یہ ۱۲ آدمی ایسے تھے جو ہاتھ ہلانے کے قابل بھی نہ تھے۔ پھر دونوں کی جنگی سپاہ میں بھی زمین و آسمان کا فرق تھا۔ نادر کی زبردست قوتِ ضابطہ نے اس کی پوری فوج کو ایک بنیانِ مرصوص بنا رکھا تھا اور محمد شاہ کی فوج ایک فراشِ حشو ش کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہاں سمع طاعت اور نظم وضبط کا یہ حال کہ ۵۰ ہزار انسان ایک شخص کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے۔ ایک ساتھ کے ساتھ پچاس ہزار ہاتھ اٹھتے تھے۔ ایک قدم کے ساتھ پچاس ہزار قدم جنبش میں آجاتے تھے۔ گویا پوری فوج ایک زندہ پہاڑ تھی جسے ایک طاقتور ہاتھ جدھر چاہتا تھا گردش دیتا تھا اور یہاں سمع وطاعت ناپید، نظم وضبط مفقود، وحدتِ فکر وعمل معدوم۔ اس بے سری فوج میں نہ کوئی آمر تھا نہ مامور۔ نہ کوئی حکم دینے والا تھا نہ سننے والا گویا ۵ ہزار سنگ ریزے منتشر تھے جن کو ایک چٹان بنا دینے والی بندش نصیب نہ تھی۔

اس تفاوت کو دیکھتے ہوئے ہر صاحب نظر انسان یہ سمجھ سکتا تھا کہ نادر شاہ اور محمد شاہ کا درحقیقت کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ اسی بنا پر نظام الملک یہ چاہتے تھے کہ جنگ کو جہاں تک ممکن ہو ٹالتے رہیں اور التوائے جنگ کی حالت میں محض اپنی ڈپلومیسی کی مہارت سے نادر شاہ کو مصالحت پر آمادہ کر لیں مگر جو لوگ دماغ سے نہیں صرف ہاتھ سے لڑنا جانتے تھے ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آسکتی تھی کہ جب محمد شاہ کے پاس نادر شاہ سے زیادہ فوج، توپخانہ، سامان جنگ، اور مال ودولت موجود ہے تو وہ کیوں اس سے نہ لڑے۔ اسی قسم کے لوگوں نے آخر کار لڑائی چھیڑ دی اور اپنی شتاب کاری سے وہ بھی اس طرح چھیڑی کہ توقع سے بھی زیادہ اس کا انجام خراب ہوا۔ ۱۴ ذی قعدہ ۱۳/ فروری کو برہان الملک سعادت خاں صوبہ دار اودھ محمد شاہ کی امداد کے لیے بیس یا تیس ہزار فوج لے کر دھاوے

مارتا ہوا کرنال پہنچا۔ اس کی آمد کے بعد ایک مجلس جنگ منعقد کی گئی جس میں وہ بھی شریک ہوا۔ ابھی مشورے ہو ہی رہے تھے کہ اطلاع آئی کہ سعادت خاں کا سامان جو پیچھے آرہا تھا نادر شاہ کے قراولوں نے لوٹ لیا اور محافظوں کو قتل کر ڈالا۔ سعادت خاں نے یہ سنتے ہی جوش میں آکر تلوار اٹھائی اور بادشاہ سے جنگ پر جانے کی اجازت مانگی۔ نظام الملک نے اس جلد بازی کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ اول تو اودھ کی فوج کامل ایک مہینے سے دھاوے مارتی چلی آرہی ہے۔ اس تھکی ہوئی فوج کو لے کر نادر کی تازہ دم فوج سے لڑنا ایک غیر دانشمندانہ فعل ہے۔ دوسرے اتنی بڑی لڑائی اس طرح نہیں چھیڑی جاتی کہ اٹھے اور سیدھے میدان جنگ میں جا پہنچے۔ اس کے لیے پہلے سے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور یہاں میدان میں جانے کی کوئی تیاری نہیں ہے۔ صمصام الدولہ اور بعض دوسرے امیروں نے بھی جنگ کو دوسرے دن پر ملتوی رکھنے کا مشورہ دیا مگر سعادت خاں نے کسی کی نہ سنی۔ اس نے فوراً اپنی فوج میں جنگ کی منادی کر دی اور پہلی آواز سنتے ہی جو لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے انہیں لیکر وہ میدان کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ جمیعت مشکل سے ۵ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی کیونکہ تھکے ماندے سپاہی جنہوں نے ابھی کمر بھی نہ کھولی تھی جنگ کی نفیر سے جی چرانے پر فطرۃً مجبور تھے۔

سعادت خاں نے جب نادر شاہ کی فوج پر حملہ کیا تو وہ تھوڑے سے مقابلہ کے بعد پسپا ہو گئی۔ یہ سمجھا کہ شکست کھا کر بھاگ رہی ہے اس نے پیچھا کرنا شروع کیا اور بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ فتح ہوا چاہتی ہے تھوڑی سی کمک بھیجنے کا حکم دیا جائے۔ نظام الملک نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ایرانیوں کی ایک جنگی چال

ہے۔ وہ پسپا ہو کر برہان الملک کو دھوکہ دے رہے ہیں اور جب یہ اپنے مرکز سے بہت دور نکل جائے گا تو دفعتہً اس پر پلٹ پڑیں گے لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی اور صمصام الدولہ بھی بغیر کسی تیاری کے صرف ۸ ہزار فوج لے کر میدان کی طرف چلا گیا۔ یہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ ادھر نادر شاہ نے پلٹ کر برہان الملک پر حملہ کر دیا۔ اور ایک گھنٹہ کے اندر اس کی ساری فوج کا قلع قمع کر کے خود اس کو گرفتار کر لیا اس کے بعد وہ صمصام الدولہ کی طرف بڑھا اور دو گھنٹہ کی گھمسان کی لڑائی کے بعد اس کو بھی شکست فاش دے دی۔ اس کی فوج کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ خود وہ مہلک زخم کھا کر لشکر واپس آیا اور دو دن بعد دنیا سے رخصت ہو گیا[1]

اس شکست نے تمام ہندوستانی فوج کے دل توڑ دیئے اور مقاومت کی رہی سہی طاقت بھی باقی نہ رہی۔ رات کے وقت مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں بادشاہ، وزیر اعظم اور بعض دوسرے امراء نے اس پر زور دیا کہ دوسرے دن ضرور جنگ کرنی چاہیئے مگر نظام الملک نے ان کو سمجھایا کہ اس حالت میں لڑنے کا نتیجہ بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ نادر شاہ سے صلح کرنے کی کوشش کی

---

[1] محمد شاہ کے لشکر کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جونہی صمصام الدولہ اور سعادت خاں نے میدان جنگ کا رخ کیا انکے خیمہ و خرگاہ کو خود انکی فوج کے اوباشوں نے لوٹ لیا حتی کہ ان کے پڑاو کی جگہ پر ایک رلّی کا بھی نشان نہ چھوڑا جب صمصام الدولہ نیم مردہ حالت میں میدان سے لایا گیا تو اس کے لیے سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ ہمراہیوں نے ایک مانگے کا خیمہ لے کر اس میں اسے اتارا۔ یہ افواج ہند کے سالار اعظم کا حشر خود اپنے کیمپ میں ہوا۔

جائے۔ دوسری طرف برہان الملک سعادت خاں سے نادر شاہ نے گفتگو کی اور ہم جنسی وہم کیشی کی بنا پر[1] اس سے کہا کہ مجھے ترکی سلطان سے لڑنے کے لیے واپس جانا ہے۔ تم رائے دو کہ کس طرح میں تمہارے بادشاہ سے باآسانی زر فدیہ وصول کر سکتا ہوں؟ اس نے جواب دیا "نظام الملک سلطنتِ ہند کی کنجی ہے اس کو بلائیے اور شرائط صلح طے کر لیجئے"۔ چنانچہ دوسرے روز نادر شاہ نے اپنا ایلچی محمد شاہ کے پاس بھیج کر نظام الملک کو طلب کیا اور قرآن کی قسم کھا کر وعدہ کیا کہ ان کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے گا۔ سعادت خاں نے بھی اس کے ساتھ عرضی بھیجی کہ آپ مصالحت کی گفت و شنید کے لیے نظام الملک کو بھیج دیجئے۔ محمد شاہ کے پاس امرائے کبار میں سے ایک نظام الملک ہی باقی رہ گئے تھے اس لیے وہ ان کو بھیجتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس نے کہا "اگر تمہارے ساتھ غدر کیا گیا تو میں کیا کروں گا؟" نظام الملک نے جواب دیا "قرآن ہمارے اور اس کے درمیان ہے اگر غدر کیا گیا تو خدا اس کا بدلہ لے گا۔ ایسی صورت میں آپ مانڈو یا کسی اور مضبوط قلعہ میں پناہ لیں اور ناصر جنگ کو دکن سے بلا کر ایرانیوں سے جنگ کریں"۔ آخر کار ۵ ذی قعدہ ۱۴ فروری کو نظام الملک وکیل مطلق کی حیثیت سے نادر شاہ کے پاس گئے اور نادر نے ان سے شائستہ برتاؤ کیا۔ دوران گفتگو میں اس نے ان کی شخصیت، فرزانگی اور تدبر سے متاثر ہو کر سوال کیا کہ "مقام حیرت ہے جب بادشاہ ہندوستان کے پاس تم جیسے امیر موجود ہیں تو کس طرح ننگ دھڑنگ مرہٹے دہلی کی دیواروں تک تاخت کرتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں اور اس سے فدیہ وصول کرتے ہیں؟" نظام الملک نے جواب دیا "جب سے نئے امیروں

---

[1] نادر شاہ اور برہان الملک دونوں شیعہ تھے۔

کا اثر بڑھا ہے ظل سبحانی جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ میرے مشورے ان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں۔ اسی لیے میں مایوس ہو کر دکن میں گوشہ گیر ہو گیا ہوں۔" اس کے بعد صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی۔ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ نادر شاہ ۵۰ لاکھ[1] روپیہ لے کر ہندوستان سے واپس چلا جائے گا۔ اس رقم میں سے ۲۰ لاکھ اسی وقت ادا کیے جائیں گے۔ دس لاکھ اٹک سے اترنے کے بعد اور دس لاکھ کابل میں۔ اس سمجھوتہ کے بعد نظام الملک لشکر نادر شاہی سے واپس ہوئے اور نادر نے ان کے ذریعہ سے محمد شاہ کو دعوت بھیجی کہ دوسرے دن وہ اس کے ہاں کھانا کھائے۔ چنانچہ دوسرے روز نظام الملک محمد شاہ کو لے کر نادر شاہ کے ہاں گئے اور ان کے ساتھ اعتماد الدولہ، قمر الدین خاں اور مؤتمن الدولہ اسحاق خاں بھی شریک ضیافت ہوئے۔

اس دوستانہ ملاقات کے بعد یہ امید قائم ہو چکی تھی کہ ایران و ہندوستان کے درمیان صلح پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ لیکن ایک واقعہ نے دفعتہً حالات کا رخ بدل دیا۔ اس دوران میں صمصام الدولہ خاں دوراں کا انتقال ہو چکا تھا۔ محمد شاہ نے نادر کی ضیافت سے واپس آ کر نظام الملک کو اس کی جگہ امیر الامرائی و میر بخشی گری کا عہدہ عطا کر دیا اور انھوں نے یہ عہدہ اپنے بڑے بیٹے غازی الدین خاں فیروز جنگ کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کی اطلاع برہان الملک سعادت خاں کو (جو نادر شاہ کے ہاں اسیر تھا) اسی روز پہنچ گئی اور وہ سخت رنجیدہ ہوا۔ کیونکہ وہ خود اس منصب کا امیدوار تھا۔ جذبۂ حسد سے بے خود ہو کر اس نے نظام الملک کی طے کردہ صلح کو درہم برہم کرنے

---

[1] سیر المتاخرین اور فتوحات آصفی میں لکھا ہے کہ مصالحت دو کروڑ روپیہ پر ہوئی تھی۔

کا فیصلہ کر لیا اور نادر شاہ سے مل کر کہا "سلطنتِ ہندوستان سے صرف ۵۰ لاکھ روپیہ پر صلح کر لینا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ اگر آپ چند قدم آگے بڑھ کر دہلی پہنچ جائیں تو آپ کو زر و جواہر کی شکل میں ۲۰ کروڑ روپیہ بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔ محمد شاہ میں مقابلہ کی قوت نہیں ہے۔ اس کے بڑے بڑے امرا کام آچکے ہیں۔ صرف ایک نظام الملک ایسا شخص ہے جو اپنی فریب کاری اور فیلسوفی کے باعث موجب خطر ہو سکتا ہے۔ سو اسکو آپ ملاقات کے بہانے بلائیے اور قید کر لیجئے۔ پھر آپ کے لیے راستہ صاف ہے۔ نادر شاہ نے اس مشورہ کو قبول کر لیا اور نظام الملک کو مشورہ کے بہانے بلا بھیجا۔ ۲۳ ذی القعدہ ۲۲ فروری کو نظام الملک صلح کے اعتماد پر اس کے ہاں چلے گئے اور لشکر میں پہنچتے ہی اسیر کر لیے گئے۔ نادر شاہ نے ان کو پیغام بھیجا کہ پچھلی مصالحت ہم کو منظور نہیں ہے۔ صلح اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ ۲۰ کروڑ روپیہ بطور فدیہ ادا کیا جائے اور ۲۰ ہزار فوج ہماری خدمت میں پیش کی جائے۔ نظام الملک کے لیے یہ مطالبہ بالکل خلاف توقع تھا۔ انہوں نے جواب دیا "چغتائی خاندان کی حکومت جب سے شروع ہوئی ہے۔ اس وقت سے آج تک ۲۰ کروڑ روپیہ خزانہ میں جمع نہیں ہوا ہے۔ شاہجہاں اپنی تمام کاوش و کوشش کے باوجود ۱۶ کروڑ سے زیادہ جمع نہ کر سکا۔ اور یہ رقم بھی بعد کو عالمگیر بادشاہ نے دکن کی طویل لڑائیوں میں خرچ کر دی۔ اس وقت تو خزانہ کا یہ حال ہے کہ ۵۰ لاکھ کی پابجائی بھی مشکل نظر آتی ہے"۔ مگر نادر شاہ نے ان عذرات کو سننے سے انکار کر دیا اور کہا جب تک ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا جائے گا تم یہاں سے نہ جا سکو گے۔

اس کے بعد نادر شاہ نے نظام الملک پر زور دیا کہ وہ محمد شاہ کو لشکر نادری میں آنے کے لیے لکھیں۔ انہوں نے اس پر بہت کچھ احتجاج کیا لیکن نادری اصرار بڑھتا گیا

آخر انہوں نے مجبور ہو کر بادشاہ کو اصل واقعات لکھ بھیجے اور یہ بھی لکھ دیا کہ نادر شاہ آپ کے بلانے پر مصر ہے۔ اس خط سے محمد شاہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اب اس کے پاس بڑے درجہ کے امرا میں سے کوئی بھی ایسا باقی نہ رہا تھا جس سے وہ مشورہ لیتا۔ قمر الدین خاں وزیر نے صاف جواب دے دیا کہ ان حالات میں میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ چھوٹے درجہ کے امرائے کہا کہ ہم جانبازی کے لیے حاضر ہیں۔ ایک دفعہ پھر لڑ کر دیکھ لیجئے لیکن محمد شاہ اتنی سمجھ بوجھ ضرور رکھتا تھا کہ اس حالت میں لڑائی کا کیا انجام ہو گا جب کسی طرف امید کی کوئی جھلک نظر نہ آئی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ تن بتقدیر نادر شاہ کے پاس چلا جائے اور جو قسمت میں لکھا ہے دیکھ لے۔ چنانچہ ۵ ہر ذی القعدہ ۲۴ ر فروری کو وہ نادر شاہ کے ہاں چلا گیا اور جاتے ہی اسیر ہو گیا۔ دوسرے روز قمر الدین خاں وزیر بھی آکر ان اسیروں میں مل گیا اور لشکر محمد شاہی میں اعلان کر دیا گیا کہ جو چاہے کرنال میں ٹھہرا رہے اور جو چاہے دہلی واپس چلا جائے اب یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ دس لاکھ بھیڑوں کے اس عظیم الشان گلہ کا کیا حال ہوا ہو گا جسے سنبھالنے کے لیے برائے نام بھی کوئی چرواہا نہ رہا تھا آن کی آن میں سارا لشکر تہ و بالا ہو گیا۔ انتہا درجہ کی پراگندگی اور سراسیمگی کے ساتھ لشکر کے لوگ دہلی کی طرف روانہ ہوا اور راستے میں قزلباشوں کے غارت گر دستوں نے دل کھول کر انہیں لوٹا۔

محمد شاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن نادر شاہ نے سعادت خاں کو اپنی فوج کے ایک سردار طہماسپ خاں جلائر کے ساتھ دہلی بھیجا اور ان دونوں نے شہر کے حاکم لطف اللہ خاں صادق سے قلعہ اور خزانوں اور تمام کارخانجات کی کنجیاں لے

ہیں۔ اسکے بعد ذی الحج (مارچ) کی ابتدا میں نادر شاہ خود محمد شاہ کو لیکر دہلی چلا اور ۹ ذی الحج دوپہر کو شہر میں داخل ہوا۔ دوسرے روز عیدگاہ اور تمام شہر کی مساجد میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا جو اس امر کا بھی اعلان تھا کہ اب سلطنت ہند کا مالک محمد شاہ نہیں بلکہ نادر شاہ ہے لیکن نادر شاہ کا اصل مقصد اس وقت ہندوستان کا تخت حاصل کرنا نہ تھا بلکہ ہندوستان کی دولت پر قبضہ کرنا تھا۔

اس نے اس اعلان سے ایک اور فائدہ اٹھایا۔ نماز عید کے بعد جب وہ محمد شاہ کی ضیافت میں شریک ہوا تو وہاں اس نے کہا کہ اول روز جو قرارداد ہوئی تھی میں اسی پر قائم ہوں اور نہ صرف ہندوستان کا تخت محمد شاہ کو سونپتا ہوں بلکہ یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری امداد محمد شاہ کے شامل حال رہے گی کیونکہ ہم دونوں ایک ہی ترکمانی رابطہ میں مربوط ہیں۔ محمد شاہ نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس جان بخشی و تاج بخشی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے صلہ میں بے شمار زر و جواہر اور خزائن اور نفیس و نادر سامان جن کی قیمت کروڑوں روپے تک پہنچتی تھی پیش کیے۔ نادر شاہ نے ان کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ مگر محمد شاہ مبالغہ کے ساتھ اصرار کرتا رہا۔ آخر کار نادر شاہ نے اس خیال سے کہ محمد شاہ کی "دل شکنی" نہ ہو اس ہدیہ کو قبول کر لیا اور اپنے امین اس تمام مال و اسباب کو ضبط میں لانے کے لیے مقرر کر دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ناٹک تھا جس میں ایرانی بازی گر نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ تماشے کا کونسا حصہ وہ خود ادا کرے گا۔ اور کونسا حصہ محمد شاہ کو ادا کرنا ہوگا اور اس سارے کھیل سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کی نگاہوں میں لوٹ کو ہدیہ کا لباس پہنا دیا جائے۔

لیکن دہلی کی قسمت ابھی اس سے زیادہ تباہیوں کا تقاضا کر رہی تھی۔ ۱۰ ذی الحج کی شام کو شہر کے بازاریوں نے دفعۃً ایک عام بلوا شروع کر دیا اور جو ایرانی

ـه نویں اور دسویں ذالحجہ کی درمیانی شب میں سعادت خاں نے وفات پائی۔

سپاہی شہر میں پھر رہے تھے ان کو قتل کرنے لگے۔ اس بلوے کے مختلف وجوہ ہیں۔ عام مورخین نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ شہر کے بے فکروں نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ قلعہ میں محمد شاہ کے اشارے سے ایک قلماقنی نے نادر شاہ کا کام تمام کر دیا ہے یہ خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی اور اوباشوں نے یہ سمجھ کر کہ اب ایرانیوں کا کوئی سر دھرا نہیں رہا ہے ان پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ مگر ابو الفیض جو خود اس وقت دہلی میں موجود تھا لکھتا ہے کہ ایرانی سپاہی ہر طرف پھیل گئے تھے اور انہوں نے مفتوح شہر کے باشندوں پر ظلم و ستم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ کسی کا مال، کسی کی عزت کسی کی جان ان کے ہاتھوں سے محفوظ نہ تھی۔ بے تکلف لوگوں کے گھروں تک میں گھس جاتے تھے اور جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ اس سے شہر کے لوگوں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ اور وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ خاں جہاں نے اس کی شکایت نادر شاہ سے کی اور اس نے حکم دیا کہ ہر ناکہ پر ایک نسقچی[۱] کھڑا کر دیا جائے اور وہ سپاہیوں کو ناشائستہ حرکات سے روکے۔ لیکن ابھی یہ انتظام قائم نہ ہونے پایا تھا کہ نادر شاہ کے قتل کی خبر اڑ گئی اور بازاری لوگوں نے عام بلوہ کر دیا۔ ایک اور ہم عصر مورّخ ہر چرن داس بھی اس روایت کی تصدیق کرتا ہے۔ فرنگی مصنف ہانوے (Hanway) اس کی ابتدا اس طرح بیان کرتا ہے کہ طہماسپ خاں جلایر نے ایرانی فوج کے چند نسقچی پہاڑ گنج کی طرف بھیجے تاکہ غلہ کے بیوپاریوں کو غلہ کے گودام کھولنے اور قیمتیں مقرر کرنے کا حکم دیں۔ قیمتوں کی تشخیص پر بیوپاریوں اور نسقچیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں بازاری لوگ بیوپاریوں کے ساتھ ہو گئے اور انہوں نے نسقچیوں پر حملہ کر کے انہیں قتل

---

[۱] یہ لفظ ملٹری پولیس کا ہم معنی ہے۔ نسق سے مراد ڈسپلن۔

کر دیا۔ یہی جھگڑا رفتہ رفتہ دوسرے بازاروں میں پھیل گیا اور نادر کے قتل کی افواہ نے اس کو اور زیادہ پھیلا دیا۔

بہرکیف دسویں تاریخ کی شام سے گیارہویں کی صبح تک دہلی کے اوباش ایرانیوں پر برابر حملے کرتے رہے اور رات بھر میں انہوں نے تین چار ہزار آدمیوں کو قتل کر دیا۔ نادرشاہ نے اول اول جب یہ خبر سنی تو اسے یقین نہ آیا۔ اس نے کہا کہ مفتوح ہندیوں کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے سپاہیوں پر حملہ کریں۔ داستان خود میری فوج والوں نے گھڑی ہے تاکہ شہر کو لوٹنے کا ایک بہانہ ہاتھ آئے مگر جب پیہم شکایات اس تک پہنچیں تو ۱۱ ذی الحج کی صبح کو وہ خود اصل واقعہ کی تحقیق کے لیے قلعہ سے نکلا اور اپنی آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ اہل شہر فساد پر تلے ہوئے ہیں۔ چاندنی چوک میں روشن الدولہ کی مسجد پر (جو سنہری مسجد کے نام سے مشہور ہے) پہنچ کر اس نے دریافت کیا کہ کن کن محلوں میں اس کے سپاہیوں پر زیادتیاں ہوئی ہیں اور پھر اپنی تلوار سونت کر بیٹھ گیا جو اس بات کی علامت تھی کہ قتل عام کر دو۔ یہ اشارہ پاتے ہی ہزاروں قزلباش، ترکمان، ازبک، بلوچ اور افغان دلی والوں پر ٹوٹ پڑے۔ جن جن محلوں میں ایرانی مقتولوں کی لاشیں نظر آئیں وہاں کسی کو زندہ نہ چھوڑا، گھروں کو لوٹا، جلایا، مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں سب کو بلا امتیاز قتل کیا چند گھنٹوں کے اندر دارالسلطنت ہندوستان کی آبادی ایک ہولناک ویرانہ بن کر رہ گئی۔[1] غریب محمد شاہ دم بخود بیٹھا اپنے شہر کی تباہی کا

---

[1] مختلف مصنفین نے مقتولوں کی تعداد مختلف بیان کی ہے۔ آٹھ ہزار سے لیکر تین چار لاکھ تک اندازہ کیا گیا ہے۔ مگر ایک معتدل تخمینہ یہ ہے کہ اس ہنگامہ میں ۲۰ ہزار اور ۳۰ ہزار کے درمیان آدمی مارے گئے۔ خصوصیت کیساتھ جو محلے تباہ ہوئے وہ چاندنی چوک، دریبہ، جامع مسجد اور پہاڑ گنج تھے۔ مقتولوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جنہوں نے ذلت کی موت سے بچنے کے لیے خود اپنا کام تمام کر لیا بہت سے لوگوں نے اپنی عورتوں اور

تماشا دیکھتا رہا۔ امرائے سلطنت میں سے کسی میں اتنی جراءت نہ تھی کہ اس وقت نادر شاہ کے سامنے جاکر معافی کی درخواست کرتا۔ آخر جب تباہی کی حد ہوگئی تو دو بجے کے قریب محمد شاہ نے نظام الملک سے استدعا کی کہ وہ نادر کے پاس جاکر رحم کی درخواست کریں۔ نظام الملک کے سن و سال، ان کی تہذیب و شائستگی، ان کی دانشمندی و فطانت اور ان کی باوقار شخصیت کا نادر شاہ پر خاص اثر تھا۔ دربار کے امرا میں وہ صرف انہی کو احترام کے قابل سمجھتا تھا۔ وہی ایک ایسے شخص تھے جو سیاسی اور رسمی مجلسوں میں جراءت و بے باکی کے ساتھ نادر شاہ سے گفتگو کرتے تھے اور جن کی باتوں کو وہ توجہ کے ساتھ سنتا تھا۔ اس وجہ سے محمد شاہ اور اس کے امرا نے خیال کیا کہ اس قہر و غضب کی حالت میں اگر کوئی شخص نادر شاہ کے سامنے جانے اور اس سے کچھ کہنے کی جراءت کر سکتا ہے تو وہ یہی پیر مرد ہے اور اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی باتوں سے نادر کے غصہ کو ٹھنڈا کر سکے گا۔ چنانچہ محمد شاہ کے حکم سے نظام الملک اپنا سر ہتھیلی پر لے کر اس خوفناک موقع پر سنہری مسجد پہنچے[۲] اور نادر شاہ کے سامنے حاضر ہو کر اس سے رحم کی التجا کی۔ مشہور ہے انہوں نے نادر شاہ کو خطاب کر کے یہ شعر پڑھا تھا۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی   مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا اور سرفروشانہ لڑ کر جان دی۔ ان کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد ایرانیوں کے ہاتھ اسیر بھی ہوئی۔

[۲] ابوالفیض نے لکھا ہے کہ اس موقع پر فیروز جنگ ان کے ساتھ تھے مگر زیادہ معتبر اور متواتر روایت یہ ہے کہ اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر اعظم کے ساتھ گئے تھے۔

اس پر نادر شاہ نے یہ کہہ کر کہ "بپاس خاطرت امان دادم" اپنی تلوار نیام میں رکھ لی اور اسی وقت شہر میں امان کی منادی کرادی۔ فوج پر نادر شاہ کے ضبط کا یہ عالم تھا کہ جس سپاہی نے بادشاہ کی امان کا حکم سنا۔ اس نے فوراً قتل و غارت سے ہاتھ روک لیا۔

اس کے بعد شہر پر زر فدیہ کی مصیبت نازل ہوئی۔ جو امراء، شرفا، معززین اور عام شہری باشندے قتل و غارت سے بچ رہے تھے ان پر تاوان لگایا گیا جو اکثر حالات میں ان کی کل مالیت کے نصف کے برابر تھا اور اس کو ہر قسم کی سختیوں کے ساتھ وصول کیا گیا۔ شہر کو پانچ حصوں پر تقسیم کر کے ہر حصہ میں تاوان کی تشخیص اور تحصیل کے لیے پانچ ایرانی سردار اور پانچ ہندوستانی امیر مقرر کیے گئے۔ ہندوستانی امیر جو اس کام پر مقرر ہوئے تھے وہ نظام الملک، اعتماد الدولہ قمر الدین خاں، ظہیر الدولہ عظیم اللہ خاں، مبارز الملک سربلند خاں اور مرتضیٰ خاں تھے۔ جو محلے نظام الملک اور اعتماد الدولہ کے سپرد تھے ان میں تشخیص بھی نرمی کے ساتھ کی گئی اور تحصیل بھی۔ اکثر غربا کا تاوان خود نظام الملک اور قمر الدین خاں نے اپنے پاس سے ادا کر دیا مگر عظیم اللہ خاں، سربلند خاں اور مرتضیٰ خاں نے ایرانیوں کے ساتھ مل کر خود اپنے اہل ملک پر ظلم و ستم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ گھر کے گھر اور خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ مدفون خزانوں کی تلاش میں گھروں کو کھود ڈالا گیا۔ عورتوں کے جسم پر سے زیور اور کپڑے تک اتار لیے گئے۔ دھوپ میں کھڑا کر کے بیدیں لگا لگا کر اور ہر قسم کے عذاب دے دے کر رقموں کے اقرار کرائے گئے۔ چھپی ہوئی دولت کے پتے پوچھے گئے۔ بہت سے لوگوں نے ان ذلتوں سے بچنے کیلئے خودکشی کر لی اور بہت سے لوگ عذاب کی سختیوں سے ہلاک ہو گئے۔ غرض ان تدبیروں کے ساتھ اہل شہر سے دو کروڑ روپیہ وصول کیا گیا۔ اسکے علاوہ کئی کروڑ روپیہ امراء و اعیان شہر سے بھی لیا گیا جن میں خود وزیر اعظم سلطنت قمر الدین خاں بھی شامل

تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کو دھوپ میں کھڑا کیا گیا اور جب تک اس نے ایک کروڑ روپیہ نقد اور جواہر اور ہاتھی دینے کا وعدہ نہ کیا اسوقت تک اسے نہ چھوڑا گیا۔ لیکن اس موقع پر بھی نادر شاہ نے نظام الملک کا احترام ملحوظ رکھا اور ان سے کسی قسم کا تاوان طلب نہ کیا۔ نہ کوئی ایسی بات کی جو ان کے مرتبہ کے خلاف ہوتی۔ دہلی پر نادر شاہ کے تسلط اور اس کے سامنے مغل شہنشاہ کی کامل بے بسی نے تمام ہندوستان میں اضطراب برپا کر دیا کیونکہ یہ ملک میں انقلاب کا پیش خیمہ نظر آتا تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی ان ہندو ریاستوں کو تھی جو مغلوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آزاد ہو رہی تھیں یا ہو چکی تھیں۔ ان کو خوف ہوا کہ شمال مغرب کا ایک اور طاقتور فاتح ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے والا ہے جس کی حکومت اپنے زبردست نظام میں انکو پھر جکڑ لے گی۔ اسی زمانہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ نادر شاہ حضرت خواجہ معین الدین کے مقبرہ کی زیارت کے لیے اجمیر جانا چاہتا ہے۔ سفر اجمیر کے ارادہ کو راجپوتانہ کی تسخیر کا ارادہ سمجھا گیا اور اس سے تمام راجپوت ریاستیں گھبرا گئیں۔ جے سنگھ سوائی اور اسکے امرا اپنے بال بچوں اور مال و اسباب کو اودے پور کے پہاڑی علاقوں میں بھیج کر خود بھی مستعد ہو بیٹھے کہ نادر کے اقدام کی خبر سنتے ہی فرار ہو جائیں۔ راجپوتانہ کے بعد مالوہ، گجرات اور دکن کی طرف پیشقدمی بھی اغلب تھی۔ اس لیے باجی راؤ نے نربدا اور بندھیاچل کی حفاظت میں بیٹھ رہنے کا خیال چھوڑ دیا۔ چنبل پر مدافعت کرنے کا نقشہ بنانا شروع کر دیا۔ ہولکر، سندھیا چمناجی آپا اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کو جو مختلف علاقوں میں سرگرم کار تھے۔ اپنے پاس بلا بھیجا اور ناصر جنگ کو لکھا کہ اسوقت ہمارے آپس کے اختلافات کوئی چیز نہیں ہیں۔ ہندوستان میں ہم سب کا ایک ہی دشمن ہے۔ جس کے مقابلہ کے لیے ہم کو مستعد و متحد ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ تمام خطرات بہت جلدی رفع ہو گئے۔ نادر شاہ ہندوستان کی تسخیر سے زیادہ ایران کے مسائل

سے دلچسپی رکھتا تھا۔ دو مہینہ کے قریب دہلی میں رہنے کے بعد اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ۴ صفر ۱۱۵۲ھ ۱۲ مئی ۱۷۳۹ء کو اس نے قلعہ میں ایک دربار منعقد کیا جس میں محمد شاہ اور اس کے امرائے سلطنت بھی شریک ہوئے۔ اس دربار میں اس خود اپنے ہاتھ سے محمد شاہ کو سلطنتِ ہندوستان کا تاج پہنایا اور اعلان کیا کہ آج سے اس ملک میں محمد شاہ کا خطبہ و سکہ پھر رائج ہوگا[1] اور ہندوستان کے تمام امراء اور رؤساء اور صوبہ دار اسی کو اپنا شہنشاہ سمجھیں۔ جو امراء موجود تھے ان کو اس نے تاکید کی کہ اپنے بادشاہ کے وفادار اور مطیع رہیں۔ اطراف ملک کے صوبہ داروں اور رئیسوں کے نام بھی اسی قسم کے فرمان لکھوائے جن میں ناصر جنگ، مہاراجہ ساہو اور باجی راؤ وغیرہ شامل تھے خصوصیت کے ساتھ باجی راؤ کو یہ دھمکی دی کہ "اگر تم نے محمد شاہ کی اطاعت نہ کی تو میں اپنی فوج کے ساتھ پھر واپس آؤں گا اور تمہیں اس کی سزا دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے محمد شاہ کو بھی چند نصیحتیں کیں[2] جن کا مدعا یہ تھا کہ وہ اپنی ان زیاں کاریوں سے باز آئے جن کی بدولت اس کی سلطنت تباہ ہو گئی ہے اور ایسے طریقے اختیار کرے جو موجب استحکام دولت ہوں۔ اس نے کہا کہ تم نے اپنی حکومت کا نظم و نسق جن لوگوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہے ان میں ایک شخص بھی اس امرِ خطیر کو سنبھالنے والا نظر نہیں آتا۔ جس ملک کا کاروبار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو وہ اگر تباہ و برباد نہ ہو تو جائے تعجب ہے۔ تمہارے ہاں صرف ایک شخص میں نے دیکھا ہے جو مدبر جہاندیدہ اور حکمرانی کی قابلیتوں سے متصف ہے اور وہ نظام الملک ہے۔ مناسب یہ ہے کہ تم اس کو اپنا مشیر بناؤ اور اس کی رائے پر سب کام چھوڑ دو۔[3] محمد شاہ نے اس تاج بخشی اور ان نصائح کا

[1] نادر کے دورانِ قیام میں محمد شاہ کا خطبہ و سکہ موقوف ہو چکا تھا۔ شہنشاہ کا لفظ صرف نادر شاہ کے لیے استعمال ہوتا تھا اور خطبہ و سکہ میں اسی کا نام لیا اور لکھا جاتا تھا۔

[2] ابو الفیض نے فتوحاتِ آصفی میں ان نصیحتوں کو اس طرح نقل کیا ہے (اگلے صفحہ پر)

شکریہ ادا کیا اور اس کے معاوضہ میں اپنی سلطنت کے وہ تمام صوبے جو دریائے سندھ کے اس پار واقع ہیں بطور ضیافت پیش کیے اور ان کے ساتھ ٹھٹھ کا صوبہ بھی شامل کر دیا۔ اس دربار کے بعد ۷ صفر ۱۱۵۲ھ/ مئی ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ دہلی سے ایران کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس حملہ سے نادر شاہ کو جو فوائد اور ہندوستان کو جو نقصانات ہوئے ان کی مختصر تفصیل یہ ہے:۔

۱۵ کروڑ روپیہ نقد شاہی خزانہ اور امراء اور رعایا سے بیش قیمت جواہر دلفائس جن کی مالیت کروڑوں روپے تک پہنچتی تھی۔

شاہجہان کا تخت طاؤس اور ۹ دوسرے مرصع تخت ۲۰۰ سو ہاتھی ۱۰ ہزار گھوڑے اور اسی قدر اونٹ ۱۳۰ منشی جو سلطنتِ مغلیہ کے محاسبات اور مالی نظم و نسق میں مہارت رکھتے تھے ۳۰۰ معمار، ۲۰۰ آہن گر، ۲۰۰ نجار، ۱۰۰ سنگ تراش اور متعدد سادہ کار جو اس وقت دہلی بلکہ سارے ہندوستان میں اپنی اپنی صنعتوں کے گلہائے سرسبد تھے۔ کابل، غزنین، کشمیر، سندھ، ٹھٹھ اور اس کے بندرگاہ، غرض اٹک پار کا سارا علاقہ۔ اس کے علاوہ بالائی پنجاب کے بیشتر علاقے جن کو

شد از غفلت پادشاہ جہاں	خراب ایں چنیں ملک ہندوستان
ز بس میدھی ارذلاں را سبق	نماندہ است در ملک نظم و نسق
کنوں ہم نرفتہ است اے شہریار	شوی گر ازیں بے خودی ہوشیار
اگر خواہی از خود بدلہا ہراس	دگر قدر تیر از سگ شناس
بمرد جہاں دیدہ بخش اختیار	کہ کارت زرائش شود استوار
مدہ رہ بخود خیرہ او باش را	دگر شارب خمر د عیاش را
بود بے سخن آصف خیر خواہ	ز روئی حقیقت اتالیق شاہ
بباید کہ بے رای ایں نامدار	کنی در رہ سلطنت ہیچ کار

نادر شاہ جنگ کرنال سے پہلے فتح کر چکا تھا انہیں اس نے محمد شاہ کے صوبہ دارلاہور کے انتظام میں چھوڑ دیا مگر ان پر ۲۰ لاکھ سالانہ کا خراج مقرر کر دیا۔

نقشہ کی تشریح

نظام الملک نے جس علاقہ پر اپنی خود مختار ریاست قائم کی تھی وہ سلطنتِ مغلیہ کے شش صوبہ دکن پر مشتمل تھا۔ یہ چھ صوبے حسب ذیل ہیں۔

(۱) صوبۂ خاندیس :- اسکے علاوہ حدود حسب ذیل تھے مشرق میں برار پائیں گھاٹ مغرب میں سرکار سورت شمال میں دریائے نربدا جنوب میں صوبہ اورنگ آباد۔ سلسلہ کوہ سہیاچل (Sahyadio Range) جس پر اجلنٹہ آباد ہے ان دونوں صوبوں کے درمیان سرحد ہے صوبہ اورنگ آباد سے صوبہ خاندیس میں جانے کا قدیم راستہ فرداپور کی گھاٹی میں سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس صوبہ کی جمع کامل منعم خاں اور قادر خاں نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ۵۸۰۲۲۲ روپیہ، صاحب خزانۂ رسولی خانی نے ۵۹۴۶۱۷۱ روپیہ اور صاحب گلزار آصفیہ نے ۳۸۶۲۲۱۹ روپیہ اور گرانٹ ڈف نے ۵۴۹۹۱۸ روپیہ لکھی ہے۔ لچھمی نرائن بھی اس کے قریب قریب آمدنی بتاتا ہے۔ ان میں حسب ذیل سرکاریں (اضلاع) شامل تھیں۔ ۱۔ سرکار آسیر۔ اسمیں ۳۳ محالات دیگئے یا تعلقے تھے برہانپور اسی سرکار میں ہے۔ ۲۔ سرکار بگلانہ۔ ۳۰ یا ۲ محال مشرق میں سرکار کالنہ وندربار مغرب میں سرکار سورت جنوب میں سرکار جوار وتل گوکن۔ شمال میں دریائے تپتی۔ ۳۔ سرکار بیجاگڈھ کھرگون۔ ۳۲ محال سرکار ہانڈیہ کے مغرب میں یہ علاقہ نربدا کے جنوبی کنارہ پر ہے۔ ۴۔ سرکار کالنہ ۷ محال۔ یہ علاقہ صوبہ اورنگ آباد سے متصل تھا۔ ۵۔ سرکار ندربار ۴۰ محال

۳۔ صوبہ برار۔ اس کے حدود یہ تھے۔ مشرق میں گونڈوانہ، مغرب میں خاندیس و اورنگ آباد، شمال میں سرکار ہانڈیہ، جنوب میں صوبہ حیدر آباد و بیدر۔ یہ صوبہ دو بڑی قسمتوں پر منقسم تھا۔ ایک برار بالاگھاٹ، دوسرے برار پائیں گھاٹ۔ پہلا حصہ فرازِ کوہ سہیاچل پر واقع ہے اور آج کے اضلاع عادل آباد، ناندیڑ، پربھنی اور اورنگ آباد میں شامل ہے۔ دوسرا حصہ پائیں کوہِ مذکور میں ہے۔ برار بالاگھاٹ میں حسب ذیل سرکاریں شامل تھیں۔

۱۔ سرکار پاتھری۔ ۱۱ محال۔ ۲۔ سرکار باسم۔ ۹ محال۔ ۳۔ سرکار بتیال باڑی۔ ۹ محال اجنٹہ اسی علاقہ میں ہے۔ ۴۔ سرکار ماہور۔ ۲۰ محال۔ ۵۔ سرکار مہکر ۱۲ محال۔ اس حصہ کی آمدنی لچھمی نرائن کے بیان کی رو سے ۴۰۵۰۷۳۶ تھی۔ برار پائیں گھاٹ کی سرکاریں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سرکار گاویل۔ ۴۶ محال۔ ایلچپور اسی میں واقع ہے۔ ۲۔ سرکار کلم۔ ۲۴ محال۔ اس میں امراوتی واقع ہے۔ ۳۔ سرکار کھیرلہ۔ ۲۴ محال۔ اسمیں آشٹہ واقع ہے۔ ۴۔ سرکار نرنالہ۔ ۳۴ محال بالاپور اس سرکار میں ہے۔ ۵۔ سرکار لوپنار ۴ محال ۶۔ سرکار اسلام گدھ عرف دیوگدھ۔

۷۔ سرکار سرلوپہ، محال۔ اس حصہ کی آمدنی لچھمی نرائن شفیق نے ۴۰۹۵۵۰۷۶ لکھی ہے اور دونوں حصوں کی مجموعی آمدنی منعم خان، قادر خاں اور صاحب گلزار آصفیہ کے بیان کے مطابق ۶، ۱۳۶۸۷ روپیہ تھی۔ صاحب خزانہ رسول خانی نے ۱۳۸۶۹۶۹۳ لکھی ہے۔ گرانٹ ڈف ۱۱۵۲۳۵۰۸ روپیہ بیان کرتے ہیں۔

۴۔ صوبہ محمد آباد بیدر۔ اس کے حدود یہ تھے۔ مشرق میں صوبہ حیدر آباد، مغرب میں صوبہ اورنگ آباد، شمال میں برار بالاگھاٹ، جنوب میں صوبہ بیجاپور۔ اس کی جمع کامل سوانح دکن گل گشت دکن گلزار آصفیہ میں ۲۱۰۲۴۶۹ روپیہ، خزانہ رسول خانی میں ۸، ۳۱۴۷۶ روپیہ اور ڈف کی تاریخ مرہٹہ میں ۹۱۸۷۹۴ بیان کی گئی ہے۔ لچھمی نرائن ۵۶۵۴۰۷۵ لکھتا ہے۔ اس صوبہ میں یہ سرکاریں شامل تھیں۔ ۱۔ سرکار بیدر۔ ۸ محال۔ ۲۔ سرکار اتیگیر دفیروزگدھ) ، محال

۳۔ سرکار ملکھیڑ (مظفر نگر) ۱۴ محال۔ ۴۔ سرکار امرچنتہ۔ ۱ محال۔ ۵۔ سرکار ناندیڑ ۴۴ محال
۶۔ سرکار کلیانی۔ ۲ محال۔ ۷۔ سرکار انکل کوٹ (دیا اکل کوٹ) ۷ محال۔

۵۔ صوبہ بیجاپور۔ یہ ایک عظیم الشان صوبہ تھا جس کے حدود صوبہ اورنگ آباد کے جنوب سے لے کر مدورا تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ دو بڑی قسمتوں پر منقسم تھا۔ قسمت اول صوبہ بیجاپور اور قسمت دوم کرناٹک بیجاپور۔

صوبہ بیجاپور (قسمت اول) کے حدود یہ ہیں۔ مشرق میں صوبہ حیدرآباد مغرب میں بحر عرب۔ شمال میں صوبہ بیدر و اورنگ آباد۔ جنوب میں کرناٹک بیجاپور۔ اس میں حسب ذیل سرکاریں شامل تھیں۔ ۱۔ سرکار بیجاپور۔ ۳۰ محال۔ ۲۔ سرکار گلبرگہ۔
۳۔ سرکار اعظم نگر (بلگام) ۱۵ محال۔ ۴۔ سرکار اسعد نگر (اکلوج) ۱۲ محال۔
۵۔ سرکار امتیاز گڈھ (اُدُونی) ۶ محال۔ ادونی، بلہاری اور کرنول اس سرکار کے مشہور مقامات ہیں۔ ۶۔ سرکار رائچور۔ ۹ محال۔ ۷۔ سرکار بنکاپور۔ ۱۶ محال ساوانور، دھارواڑ اور ہری ہر اسی سرکار میں واقع ہیں۔ ۸۔ سرکار نورگل ۲۶ محال بادامی کا مشہور قلعہ اس میں ہے۔ ۹۔ سرکار رائے باغ۔ ۱۲ محال۔ کولہاپور اوندھ کی ریاستیں اسی سرکار میں واقع ہیں۔ ۱۰۔ سرکار غازی پور (اندیال) ۲۳ محال بگین پلی اس سرکار میں واقع ہے۔ ۱۱۔ سرکار نلدرگ ۸ محال۔ ۱۲۔ سرکار محمد نگر (اکیڑی) ۱۳۔ سرکار مدگل۔ ۱۳ محال۔ ۱۴۔ مصطفیٰ آباد (دابُل) ۸ محال۔ یہ وہی علاقہ ہے جو کوکن عادل شاہی کہلاتا تھا۔ اس علاقہ پر مغلوں کی فتح سے پہلے سیواجی مسلط ہو چکا تھا۔ عالمگیر کے آخر عہد میں یہی علاقہ مرہٹوں اور مغلوں کے درمیان جنگ کا میدان تھا فرخ سیر کے عہد میں اس پر مرہٹہ راج تسلیم کیا گیا۔ نظام الملک کی حکومت میں یہ علاقہ کبھی داخل نہیں ہوا۔

۱۵۔ سرکار مرتضیٰ آباد مُرج ۶ محال۔ ۱۶۔ سرکار بنی شاہ دُرگ دیرنالہ، ۸ محال مرہٹوں کے مشہور قلعے ستارا۔ چندن مندن اور پرلی وغیرہ اسی میں ہیں کوکن عادل شاہی کی طرح یہ بھی سلطنت مغلیہ کے زیر حکم نہیں آیا۔ اس لیے اس کو بھی نظام الملک کی ریاست سے خارج سمجھنا چاہیئے۔ ۱۷۔ سرکار نصرت آباد دساگر یا سگر۔ ۵ محال۔ مشہور مقام تالی کوٹہ اسی سرکار میں واقع ہے جہاں دکن کی مسلم ریاستوں نے بیجانگر کو شکست دی تھی۔ اس صوبہ کی جمع کامل سوانح دکن خزانہ رسول خانی اور گلزار آصفیہ میں ۲۶۱۷۰۹۰۴ روپیہ بیان کی گئی ہے۔ اگر اس میں سے سرکار کرناٹک کی آمدنی وضع کرلی جائے دکیونکہ ان مصنفین نے سرکار کرناٹک کو بھی قسمت اول میں شامل کردیا ہے، تو اس صوبہ کی آمدنی ۲۰۸۷۵۹۰۴ قرار پاتی ہے۔

کرناٹک بیجاپور (قسمت دوم) اس کے حدود اربعہ یہ ہیں۔ مشرق میں کرناٹک حیدرآباد مغرب میں کہیں مغربی گھاٹ اور کہیں بحر عرب، شمال میں صوبہ بیجاپور کے جنوبی اضلاع اور جنوب میں مدھرا اور ڈنڈیگل۔ یہ وسیع خطہ انتظامی حیثیت سے دو حصوں پر منقسم تھا ایک ایک وہ جو براہ راست نظام الملک کے زیر انتظام تھا۔ اور دوسرا وہ جو پالیگروں اور زمینداروں کے ماتحت تھا اور یہ نظام الملک کو خراج ادا کرتے تھے۔ حصہ اول میں تقریباً ۵۰ محالات تھے جن کو چھ سرکاروں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ سرا، کولار، ہکوٹہ، بالاپور کلاں، ہنوکنڈا اور لسواپٹن۔ سرا اس قسمت کا حاکم نشین شہر تھا۔ اس کی جمع کامل صاحب تذکرۃ البلاد والحکام نے ۲۸۱۲۰، ہُن اور صاحب گلزار آصفیہ نے ۵۲۹۵۰۰۰ روپیہ بیان کی ہے۔ دوسرے حصہ میں تقریباً ۲۵ پالیگروں اور زمینداروں کی ریاستیں تھیں جو مغل حکومت کی باجگذار تھیں۔ ان ریاستوں کے نام یہ ہیں۔

	آمدنی
سری رنگ پٹن[1] (میسور)	۳۲۵۸۵۱۳۶۱ روپیہ

[1] عام طور پر اسے سرنگا پٹم کہا جاتا ہے۔

	آمدنی	
دیگر زمینداران تعلقۂ مذکور	۱۰۲۶۳۶۳۵	روپیہ
زمیندار سوندھا (یا سوندہ)	۷۲۰۸۷۱	"
زمیندار چِتیل درُگ	۱۱۲۵۰۰۰	"
زمیندار جری ملا (یا جریملہ)	۹۳۷۵۰	"
زمیندار تری کرا	۱۷۲۵۰۰	"
زمیندار رتن گیری	۹۲۷۵۰	"
زمیندار ہر ہٹی	۷۵۰۰۰	"
زمیندار ماد گڈھ (یا پاڈگڈھ)	۱۲۰۰۰۰	"
زمیندار نائک پالہ (داونایک یا لیت نائک)	۱۵۰۰۰	"
زمیندار چک بالاپور	۱۹۰۲۵۰	"
زمیندار سرتی کرا	۷۵۰۰۰	
زمیندار ہر پن ہلی	۱۰۲۹۹۶۰	"
زمیندار انی گونڈی	۱۷۳۵۵۰	"
زمیندار کنگ گیری	۹۹۱۱۶۵	"
زمیندار بلہاری	۸۶۲۵۰	"

ان کے علاوہ رائے درگ، دلوھٹی، دیونِ ہلی، بنگلور، انکس گری، انی گل، وینکٹ گری، ہنپکنور، مدن پلّی، گوری گنڈہ، نیلگنڈہ، سولی درک، ہسکوٹ، بدنور، کوڑگ، منتوری (یا منتور)، ہاگل واڑی، کوڈی کوٹہ (یا کوڑی کوٹہ) اور ننکر گڈھ کے زمیندار بھی تھے جن میں سے بعض کی ریاستیں خاصی طاقت ور تھیں۔ ان کی مجموعی آمدنی تھوڑے اختلاف کے ساتھ حقیقت ہائے ہندوستان اور گلزار آصفیہ میں سوا پانچ کروڑ

بتائی ہے مگر کسی ذریعہ سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان ریاستوں سے صوبہ دار دکن کو کس قدر خراج وصول ہوتا تھا۔ کرناٹک بیجاپور کی یہ تمام ریاستیں فوجدار سرا کے ماتحت تھیں جو اس علاقہ کا ناظم بھی تھا اور سیاسی وکیل (پولٹیکل ایجنٹ) بھی۔ بعد میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے پورے کرناٹک بیجاپور کو فتح کرلیا۔ اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہ علاقہ ریاست میسور اور صوبہ مدراس کے درمیان تقسیم ہوگیا۔

دوسرے حصہ میں میسور، چیتلدرگ، بدنور وغیرہ ۳۲ ریاستیں تھیں جن کی جمع کامل ۵۲۲۶۹۲۰۹ روپیہ تھی

۶۔ صوبۂ حیدرآباد۔ یہ صوبہ بھی تقریباً اتنا ہی وسیع تھا جتنا صوبۂ بیجاپور تھا۔ اس کی دو بڑی قسمیں تھیں۔ ایک صوبہ فرخندہ بنیاد۔ دوسرے کرناٹک بالاگھاٹ و پایاں گھاٹ

قسمت اول صوبہ فرخندہ بنیاد کے حدود یہ ہیں۔ مشرق میں خلیج بنگال، مغرب میں صوبہ جات بیدر و بیجاپور، شمال میں برار بالاگھاٹ، گونڈوانہ اور اڑلیسہ، جنوب میں دریائے کرشنا۔ اس صوبہ کی جمع کامل سوانح دکن و گلزار آصفیہ کے مطابق ۴،۸۵۲،۰۷۱ روپیہ تھی اور اس میں حسب ذیل سرکاریں شامل تھیں:۔

۱۔ سرکار محمد نگر گولکنڈہ۔ ۱۲ محال

۲۔ سرکار بھونگیر ۱۱ محال

۳۔ سرکار دیوَر کنڈہ۔ ۱۲ محال۔ اب ضلع محبوب نگر کے نام سے موسوم ہے۔

۴۔ سرکار میدک۔ ۱۲ محال

۵۔ سرکار کولاس۔ ۵ محال

۶۔ سرکار کھمم میٹ۔ ۱۱ محال

۷۔ سرکار نلگنڈہ۔ ۶ محال

۸۔ سرکار کونڈاپلی کونڈہ۔ ۶ محال

۹۔ سرکار پانگل۔ ۵ محال

۱۰۔ سرکار کریم نگر۔ ۹ محال

۱۱۔ سرکار گھنپورہ۔ ۹ محال

۱۲۔ سرکار آرام گیر۔ ایک محال

۱۳۔ سرکار ورنگل۔ ۱۶ محال

۱۴۔ سرکار ملنگور۔ ۳ محال۔

۱۵۔ سرکار کان ہای الماس۔ ایک محال

۱۶۔ سرکار مصطفیٰ نگر (کونڈاپلی)، ۲۴ محال

۱۷۔ سرکار مرتضیٰ نگر (گنٹور)، ۵ محال

۱۸۔ سرکار ایلور۔ ۱۲ محال

۱۹۔ سرکار راجمندری۔ ۲۴ محال

۲۰۔ سرکار مچھلی پٹن یا مچھلی بندر۔ ۸ محال۔

۲۱۔ سرکار نظام پٹن۔ ایک محال۔

۲۲۔ سرکار چلکہ سیکاکول۔ ایک محال۔

یہ پورا علاقہ ۸ سرکاروں پر مشتمل تھا جنہیں برطانوی ہند کی تاریخوں میں شمالی سرکاروں کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا کیونکہ یہ مدراس کے شمال میں واقع تھیں۔

قسمت دوم کرناٹک حیدر آباد کے بھی دو حصے تھے ایک بالا گھاٹ دوسرا پایان گھاٹ۔

کرناٹک بالا گھاٹ۔ وہ علاقہ ہے جو مشرقی گھاٹوں کے فراز پر واقع

ہے اور ایک طرف ریاست میسور، دوسری طرف مملکت آصفیہ اور تیسری طرف مشرقی گھاٹوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس علاقہ کی جمع کامل ۴۹۶۲۳۶۳ روپیہ تھی اور اس میں حسب ذیل سرکاریں شامل تھیں۔

۱۔ سرکار سرہوٹ۔ ۸ محال۔ اس کا حاکم نشین شہر کڑپہ تھا۔

۲۔ سرکار گنجی کوٹہ۔ ۱۵ محال

۳۔ سرکارِ گورم گنڈہ ۱۲ محال

۴۔ سرکار کھمم۔ ۸ محال۔

۵۔ سرکار گرتی یا کٹی۔ ۱۲ محال

کرناٹک پایان گھاٹ ۔ اس علاقے کا صدر مقام ارکاٹ تھا۔ اس کے شمال میں سرکار گنتور و نظام پٹن جنوب میں راس کماری مشرق میں خلیج بنگال، اور مغرب میں مشرقی گھاٹ واقع ہیں۔ اس کی سرکاریں حسب ذیل تھیں۔

۱۔ سرکار اُدگیر۔ ۶ محال۔

۲۔ سرکار ویلور۔ ۸ محال۔

۳۔ سرکار پالم کوٹ۔ ۱۲ محال۔ محمود بندر، لبوا پٹن اور وردھا چلم اسی میں ہیں۔

۴۔ سرکار ترپا لور۔ ۱۰ محال میلاپور اور مدراس اسی سرکار میں ہیں۔

۵۔ سرکار جگدیو پور۔ ۱۷ محال۔ وانیم باڑی، کاویری پٹن خان خاں ہلی۔ رائے کوٹ اور چن پٹن اسی میں ہیں۔

۶۔ سرکار چندرگیری۔ ۱۰ محال۔ چتور اور ترپتی اسی سرکار میں ہیں۔

۷۔ سرکار چنگل پٹ۔ ۳۰ محال

۸۔ سرکار سردہ پلی۔ ۱۲ محال۔ نیلور، ونیکٹ گری اور انت ساگر اسی سرکار میں ہیں۔

۹۔ سرکار گنجی دکانجی ویر، ۱۵ محال۔ ارکاٹ اور کادیری پاک اسی سرکار میں ہیں۔

۱۰۔ سرکار ترناملی۔ ۱۱ محال۔

۱۱۔ سرکار نصرت گڈھ چنجی (جسے انگریز جنجی یا گنجی لکھتے ہیں)، ۸ محال۔

۱۲۔ سرکار وردادور۔ ۹ محال۔ فورٹ سینٹ ڈیوڈ اسی میں ہے۔

۱۳۔ سرکار روندادسی (جسے انگریز وانڈی واش لکھتے ہیں)، ۳ محال۔

۱۴۔ سرکار والکونداپور۔ ۵ محال۔

۱۵۔ سرکار ترچناپلی۔ یہ پہلے ایک باجگذار ریاست تھی۔ بعد میں یہ نظامت ارکاٹ سے ملحق کر لی گئی۔

۱۶۔ سرکار چنجاور یا تنجاور (جسے انگریز تانجور یا تنجور لکھتے ہیں) یہ ایک باجگذار ہندو ریاست تھی۔ اس پورے علاقہ کی آمدنی باستثنائے تنجاور ۲۹۱۶۵۰۵۳ روپیہ تھی اور تنجاور کا پیش کش شامل کرنے کے بعد ۳ کروڑ روپیہ سے متجاوز ہو جاتی تھی۔

ان چھ صوبوں کے علاوہ بندر سورت بھی ایک جداگانہ سرکار کی حیثیت سے نظام الملک کی مملکت میں شامل تھا اور اسی باعث اس مملکت کو بعض اوقات شش و نیم صوبۂ دکن کہا جاتا تھا۔ اس کی آمدنی مجھ کو کہیں نہیں ملی مگر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہاں سے درآمد و برآمد کا محصول کثیر تعداد میں وصول ہوتا ہوگا کیونکہ اس زمانہ میں اس بندرگاہ کی وہی حیثیت تھی جو آج کل بمبئی کی ہے۔ یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ سورت کس زمانہ تک دولت آصفیہ میں شامل رہا اور کب اس سے الگ ہوا۔

اس نقشہ کی تیاری اور ان تفصیلات کی فراہمی میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی

سوانح دکن۔ یہ بہترین ماخذ ہے جس میں صوبوں، سرکاروں اور محالات کے حدود اربعہ اور ان کی آمدنی بہ تفصیل درج کی گئی ہے۔

رفعات موسوی خاں جبراہٹ۔ اس کے ایک رفعہ میں صرف اتنا مذکور ہے کہ نظام الملک نے بے حاصلی صوبجات دکن کی شکایت کر کے بندر سورت شاہی حکومت سے مانگ لیا تھا۔

خزانہ رسول خانی۔ اس کا ماخذ زیادہ تر سوانح دکن ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوسرے ماخذ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

کیفیت جمع وخرچ وانتظام ملک سرکار عالی (قلمی کتب خانہ آصفیہ) سر سالار جنگ کے زمانہ میں کسی عہدہ دار نے لکھی ہے۔ جس کا نام مذکور نہیں ہے نہایت مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

گلزار آصفیہ۔

حقیقتہائے ہندوستان۔ بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے۔

توزک والاجاہی
تذکرۃ البلاد والحکام
} ان دونوں کتابوں میں کرناٹک کے متعلق بیش قیمت معلومات ملتی ہیں۔

سالانہ آمدنی وپیمائش ممالک ہند (قلمی کتب خانہ آصفیہ)

مصنف کا نام اور سنہ تالیف نہیں ملا۔

سیر الہند وگل گشت دکن۔

Imperial Gazetteer of India.

Historical and Descriptive Sketch of H. E. H. The Nizam's Dominions.

Hyderabad Gazetteer M. Mehdi Khan.

The Nizam, by Briggs.

ان میں سے کسی کتاب میں بھی نظام الملک کی مملکت کے صوبوں کی صحیح حد بندی نہیں کی گئی ہے یہ حد بندی میں نے کی ہے اگرچہ تحقیق و تفتیش کے بعد ابھی اس میں بہت کچھ ترمیم کی گنجائش ہے۔
